وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ

(اور اپنی رانڈوں کے نکاح کرو)

ایامیٰ

مُصنّفہ

مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور

حسبِ فرمائش مولوی منذر احمد صاحب

مطبوعہ دِلّی پرنٹنگ ورکس دِہلی

وَ انکِحُوا الاَیَامیٰ مِنکُم

اور اپنی رانڈوں کے نکاح کردو

بُرا دستور بے جابات نا ہنجار شیوہ ہے

بڑی خوف و خطر کی جائے ہی جس گھر میں بیوہ ہے

ایامیٰ

جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت

ایک دلچسپ قصّے کے پیرائے میں بیان کی ہے

اور جس کو

جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ محمد نذیر احمد خانصاحب بہادر

مرحوم و مغفور ایل ایل ڈی - ڈی او ایل سابق ڈپٹی کلکٹر و ممبر

آف دی بورڈ آف ریونیو سرکار عالی نظام و وظیفہ خوار سرکار ممدوح نے

سنہ ۱۸۹۱ء میں تصنیف فرمایا

حسب فرمائش مولوی منذر احمد صاحب خلف مولوی بشیر الدین احمد

صاحب تعلقہ دار پنشنر (دلّی پرنٹنگ ورکس فائن آرٹ لیتھو برانچ میں صرف ٹائیٹل چھپا)

طبع چہارم | قیمت ایک روپیہ عہ محصول ڈاک ۵ | ایک ہزار جلد

فہرست مضامین ایامیٰ

میرے والد ماجد مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم ومغفور کی کتب تصانیف

نمبر	نام کتاب	قیمت	محصول ڈاک
	مولوی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ کلام مجید اردو کا بہترین ترجمہ مان لیا گیا ہے جس کی قریب قریب ایک لاکھ کاپیاں اب تک بک چکی ہیں اُس کلام مجید کا ترجمہ مختلف تقطیع پر چھپا ہے جس کی صراحت ذیل میں ہے		
۱	**بڑا قرآن شریف**۔ جلی قلم۔ کاغذ سفید عمدہ۔ چکنا ولایتی سطور پر حنائی رنگ صـ ۸۷۰ تقطیع ۲۲-۲۹ دو صفحہ مع فہرست مضامین وفرہنگ الفاظ اردو مجلد عـہ	عـ۵	۱۰/
۲	**جامع المصاحف**۔ متوسط قرآن تقطیع $\frac{۲۲}{۲۹}$ چو صفحہ صـ ۸۰۷ کاغذ سفید چکنا ولایتی سطور پر حنائی رنگ با ترجمہ اردو مع فہرست مضامین وفرہنگ الفاظ اردو مجلد معہ/	۸/	/۱۴
۳	**غرائب القرآن**۔ تقطیع ۲۲-۲۹ صـ ۱۱۴۸ اس میں ایک طرف کلام مجید ہے صفحہ مقابل پر ترجمہ حاشیہ پر حل لغات عربی کاغذ سفید۔ مجلد ؎ہ/	/ے	آ/
۴	**حمائل شریف** بترجمہ بین السطور سطور پر حنائی رنگ تقطیع ۱۶-۲۲- صـ ۱۰۶۴ مع فہرست مضامین وفرہنگ لغات اردو سفر میں ساتھ رکھنے کے قابل ہے مجلد ؎ہ/	للعہ/	/۸
۵	**دہ سورہ فی حسن الصورۃ** مترجم پنج سورہ کی جگہ یہ دہ سورہ ہے وظیفہ پڑھنے والوں کے لئے بہت ضروری تقطیع ۱۶-۲۲ صـ ۱۴۴	/۱۰	/۳
۶	**ادعیۃ القرآن** - قرآن شریف کی ساری دعائیں مع ترجمہ وفوائد تقطیع ۱۶-۲۲ صـ ۱۰۰ (ٹائیٹل سادہ رنگین)	۱۲/۱۰	/۳
۷	**الحقوق والفرائض** تقطیع ۲۲-۲۹ صـ ۱۰۲۶ مذہب اسلام کے سارے مسائل کا مجموعہ قرآن شریف کی آیات اور احادیث کے ترجمہ کے ساتھ ہر مسلمان کے گھر میں جو مذہب سے واقفیت رکھنا چاہتا ہو اس کتاب کا ہونا لازمات میں سے ہے حصہ اول ؎ہ حصہ دوم ۱۲/ حصہ سوم عـہ/ اور پوراسٹ	؎ہ/	/۱۴

نمبر	نام کتاب	قیمت	محصول ڈاک
۸	**اجتہاد** تقطیع ۲۲-۲۹ صـ ۱۶۶ اسلام کی حقانیت کا دلائل وبراہین قاطعہ سے اثبات جو مسلمان اپنے عقیدے میں پکا ہونا چاہے وہ اس کتاب کو ضرور دیکھے	عہ/	/۵
۹	**حیات النذیر** مولانا کی مفصل سوانح عمری مع فوٹو اردو عکسی خطوط کے تقطیع ۲۲-۲۹ صـ ۶۷۸	ے/	/۱۱
۱۰	**نظم بے نظیر**۔ تقطیع ۲۰-۲۶- مولانا کی کل نظموں کا مجموعہ بہ صراحت اس امر کے کہ کہاں اور کس موقع پر پڑھی گئیں	عہ/	/۵
۱۱ تا ۱۳	**مرآۃ العروس**- **بنات النعش**- **توبۃ النصوح** یہ تینوں کتابیں اس کثرت سے مروج ہیں کہ کسی مزید تعریف کی ضرورت نہیں بازار میں کثرت سے سستی قیمت پر ملتی ہیں۔ مگر خط اچھا نہ کاغذ اچھا ہمارے خاص اہتمام اور نگرانی سے چھپوائی ہوئی۔ کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی دیدہ زیب اور فٹ نوٹ میں تمام الفاظ کے معانی تقطیع ۲۰-۲۶ صفحات علی الترتیب ۱۸۶ ۱۵۰ ۱۸۸	فی نسخہ عـہ/	/۵
۱۴	**محصنات** تقطیع ۲۰-۲۶ صـ ۲۱۲ تعدد ازدواج کے روح فرسا نتائج	عہ/	/۵
۱۵	**رویائے صادقہ** تقطیع ۲۰-۲۶ صـ ۲۱۵ مختلف مذاہب کا مقابلہ اسلام سے	عہ/	/۵
۱۶	**ابن الوقت** تقطیع ۲۰-۲۶ صـ ۲۰۶ انگریزی وضع کی کورانہ تقلید کے تباہ کن نتائج	عہ/	/۵
۱۷	**موعظہ حسنہ** مولانا کے اصلی نصیحت آمیز خطوط اپنے فرزند کے نام تقطیع ۲۰-۲۶ صفحات ۱۲۴	عہ/	/۵
۱۸	**منتخب الحکایات** بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ نتیجہ خیز کہانیاں تقطیع ۲۰-۲۶ صفحات ۸۰	۸/	/۳
۱۹	**چند پند** مفید ونصیحت آمیز مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے لیے تقطیع ۲۰-۲۶ صفحات ۷۲	۸	/۳
۲۰	**صرف صغیر**۔ اردو زبان میں فارسی گرامر تقطیع $\frac{۲۰}{۲۶}$ صـ ۴۲	۶/	/۳
۲۱	**نصاب خسرو** جدید طرز کی خالق باری تقطیع ۲۰-۲۶ صـ ۲۹	۶/	/۳
۲۲	**رسم الخط** املا نویسی کے قواعد لڑکوں کے لئے بہت		

نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت مجلد	محصول ڈاک
	ضروری تقطیع ۲۰-۲۶ صفحہ ۳۲	۶/	۳/
۲۳	مبادی الحکمۃ سلیس اردو میں عربی منطق کے قواعد تقطیع ۲۰-۲۶ صفحہ ۱۳۲	عہ/	۴/
۲۴	مالغنیک فی الصرف۔ صرف عربی کی بہترین گرامر اردو میں تقطیع ۲۲-۲۹ صفحہ ۶۸	۱۳/	۴/
۲۵	لکچروں کا مجموعہ دو جلدوں میں تقطیع ۲۰-۲۶		

نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت مجلد	محصول ڈاک
	صفحہ ۱۱۹۱ (۴۴) لکچر ہیں دونوں جلد	صہ/	۱۴/
۲۶	مطالب القرآن قرآن شریف کی تفسیر کا پہلا حصہ جتنا لکھا جا چکا تھا چھاپ دیا گیا تقطیع ۲۲-۲۹ صفحہ ۱۴۵	۴/	۵/
۲۷	امہات الامہ۔ ازواج مطہرات کے حالات (زیر طبع)	۴/	۵/

مجھ ناچیز کی تصانیف

نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت	محصول
ا	اقبال دلہن[۱] حسن معاشرت[۲] اصلاح معیشت[۳] عہ مجلد عالہ ۵/ عہ مجلد عالہ ۵/ عہ مجلد عالہ ۵/ لخت جگر[۴] دو حصے خوان اشرف[۵] مجلد للعہ ۱۱/ عہ ۵/ یہ پانچوں کتابیں ۱۸-۲۲ تقطیع کی ہیں مراۃ العروس کے طرز کی ہر عمر کی عورتوں کے لیئے ازبس مفید ہیں نمبر ۲ و ۳ و ۴ پر گورنمنٹ سے انعام بھی ملا ہے۔		
تعلیم	نیک کرداری کی کتابیں۔ تحفہ طفلاں[۶] بچوں کے لیئے	عہ/	۴/
	نشاط عمر[۷] جوانوں کے لیئے	۴/	۵/
	عصائے پیری[۸] عمر رسیدہ لوگوں کے لیئے	عہ/	۴/
	شمع ہدایت[۹] سب کے لیئے	۱۲/	۵/
	بچیوں[۱۰] سے دو دو باتیں لڑکیوں کے لیئے	عہ/	۴/
	مثنوی[۱۱] درد دل سچا اور دردناک واقعہ	۸/	۳/
	عزم بالجزم[۱۲]۔ استقامت ارادہ پر ایک دلچسپ قصہ	۴/	۳/
	دیوان بشیر[۱۳]۔ مع مصنف کے فوٹو اور (۲۲۱) دلچسپ نظموں کے مجلد عہ	۴ عہ/	۵/
	آئینہ[۱۴] بشیر جس میں نہایت بکار آمد منثور خط ہیں عورتوں کے لیئے مجلد ۸/	۱۲/	۸/

نام کتاب	قیمت	محصول
تاریخ بیجاپور[۱۵] دکن کی مکمل تاریخ مع (۶۰) فوٹو ۳ حصے مجلد عـــہ/	عـــہ	۱/۴
تاریخ دہلی[۱۶]۔ تین حصے۔ قدیم زمانے سے آج تک کی تاریخ قابل دید فوٹو (۹) عمارتوں کے قلمی نقشے (۲۰۹) مجلد للعہ/	صعہ	عا/
لطائف عجیبہ[۱۷]۔ تین حصوں میں فی حصہ	عہ/	۴/
حکایات لطیفہ[۱۸] تین حصوں میں فی حصہ	عہ/	۴/
تمثال الامثال[۱۹] (زیر طبع) محاورات مثلوں۔ پہیلیوں چیستانوں۔ دوہوں کی نہایت مشرح مبسوط لغت دو جلدوں میں تخمینی قیمت مجلد عــہ/	عــہ/	

لطائف عجیبہ اور حکایات لطیفہ کا اگر پورا سٹ لیں تو قیمت فی سٹ چھ آنے کی رعایت کی جائے گی۔

نوٹ

جلدیں بہت خوبصورت اور نفیس سنہری چھپنے کی ہیں۔

ملنے کا پتہ

بشیر الدین احمد تعلقہ دار کھاری باولی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی فصل تمہید

شہر اور محلے اور خاندان کا کیا مذکور ہے گھر بھی کوئی ایسا ہی اِکّا دُکّا ہوگا جس میں بوڑھی یا ادھیڑ یا (افسوس) جوان یا (ہائے ہائے) لڑکی بیوہ نہ ہو۔ اور جب بیاہ سے مرد اور عورت جیتے جی کا تعلق کرتے ہیں تو ہر ایک بیاہ کا ضروری اور لازمی نتیجہ ہے کہ آخر کار مرد رنڈوا ہو یا عورت رانڈ۔ بیاہ سے مرد اور عورت نے ساری عمر ساتھ رہنے کا قول و قرار کیا ہے نہ ساتھ مرنے کا۔ بے شک مردم شماری سے ثابت ہوا ہے کہ جنگلی اور وحشی قوموں کو چھوڑ کر ہر جگہ عورتوں کا مجموعہ مردوں سے کچھ یوں ہی سا بڑھا ہوا رہتا ہے مگر نہ اتنا کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو رانڈیں ہی رانڈیں نظر پڑیں۔ ہمارے ہاں رانڈوں کی یہ کثرت کچھ تو اس وجہ سے ہے کہ ہر بی بی اوپر اکثر عمر میں تھوڑی یا بہت اپنے میاں سے چھوٹی ہوتی ہے مرد کی مدت حیات پہلے ہو چکی عورت بیوہ ہو کر رہ گئی لیکن ایک بڑا سبب اور ہے کہ مرد تجرد کی مصیبتوں کے برداشت کرنے میں عورتوں سے زیادہ بودے ہیں۔ مرنے والی کا کفن تک میلا ہونے نہیں پاتا کہ ان کا ایمان ڈانواڈول ہونے لگتا ہے۔ اور نہ کیوں ہو۔ مرتے کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا ع شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ زندگی کے دن تو کسی نہ کسی طرح تیر کرنے ہی پڑیں گے جان پر عذاب ڈالیں کیوں اور زیست تلخ کریں کس لیئے۔ وہ تو کچھ عورتوں ہی کے جگرے ہیں اور جگرے بھی کیا خاک ہیں یوں کہو پرلے درجے کی بدقسمتی ہے کہ بیوگی کی مصیبت مند زندگی جھیلتی ہیں۔ کہتے ہیں قیامت نفسی نفسی کا دن ہوگا کہ کسی کو دوسرے کے دُکھ درد کی ذری پروا نہ ہوگی لیکن ہمارے دیکھنے میں تو بیوہ عورتوں کے لیئے اب بھی قیامت ہی ہے۔ مونہ سے کہنے کو تو ہر کوئی کہے گا کہ بیوگی بڑی آفت ہے لیکن مونہ سے کہنے کی سند کیا ہے۔ ہم تو بڑی آفت کے

اُس وقت قائل ہوں جب لوگوں کو آفت رسیدہ کے لئے کوئی تدبیر کرتے ہوئے دیکھیں؟ یہ کہنا کہ
کچھ آفت نہیں اور یہ کہنا کہ آفت تو ہے مگر ہم اُس کے لئے کوئی تدبیر کرنی چاہتے دونوں کا مآل
واحد ہے۔ بیوگی اگر آفت ہے تو عجیب طرح کی آفت ہے کہ جس کو دیکھو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔
یہاں تک کہ جو خود مبتلائے آفت ہے روتا بھی ہے پیٹتا بھی ہے رنج کے مارے اندر ہی اندر پڑا گھلتا بھی
ہے مگر چاہے کہ بند غم سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ فکر کرے بس اس کا کہیں پتہ نہیں۔ ہم نے بھی
سیکڑوں ہی بیواؤں کو دیکھا اور بقدر تعلق بعض کی بےکسی پر افسوس بھی کیوں نہیں آیا مگر خدا
گواہ ہے وکفی باللہ شہیدا جب تک آزادی بیگم کا حال نہیں سنا ہم نے نہیں جانا کہ بیوہ عورت کے
دل پر کیا صدمہ گزر جاتا ہے۔ شاباش خدا کو۔ بیواؤں کے حق میں کچھ بہتری کرنی تھی کہ آزادی بیگم
نے مرتے دم تک بیوگی کی تلخیوں کا زہر اُگلا۔ اگر کہیں خدانخواستہ آزادی بیگم بھی دل میں سیکڑوں
ہزاروں حسرتیں اور مونہہ میں گھنگنیاں بھرے ہوئے دنیا سے ناشاد نامراد اُٹھ گئی ہوتی جیسے
لاکھوں کروڑوں خدا کی بندیاں اُٹھ گئیں نہ اپنی کہی نہ دوسرے کی سُنی تو وہی بیوگی ہوتی
وہی جی ہی جی میں گھٹنا وہی ؎

رات آئی تو یہ جانا کہ قیامت آئی
گر ہوئی صبح دل زار پہ آفت آئی

وہی رہی تعزیت وہی جھوٹی ہمدردی۔ آزادی بیگم کے اس احسان کو کون نکر سکتا ہے مگر وہ بھی
خدا اُس کی مغفرت کرے اتنی کسر کر ہی گئی کہ کہنے کو تو اُس نے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی لیکن
کر کے کچھ نہ دکھایا اگر خدا اُس کو مہلت دیتا اور زمانہ بیوگی میں جیسے جیسے خیال اُس کے دل میں
آتے تھے سب نہیں دو چار پر بھی عمل کر گزرتی تو دنیا اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھ لیتی کہ بیوہ کے
بٹھنے بٹھانے کے کیسے زبون نتیجے ہیں خود بیوہ کے حق میں اُس کے عزیزوں کے حق میں خاندان
کے حق میں قوم کے حق میں اور ملک کے حق میں۔

آزادی بیگم کچھ انوکھی بیوہ نہ تھی مگر اس کو اتفاق سے ایسے ایسے واقعات پیش آئے جن کی
وجہ سے وہ اپنی ذات سے انوکھی عورت ضرور تھی۔

دوسری فصل آزادی بیگم کے ابتدائی حالات اور اُس کی تعلیم و تربیت

وہ ایسے گھر پیدا ہوئی تھی کہ سارے خاندان میں لڑکیوں کا توڑا تھا۔ ان لوگوں میں یوں

ہی لڑکیاں کم بہت کم پیدا ہوتی تھیں اور بھولے بسرے پیدا ہوتی بھی تھیں تو لوگ پہلے سے مہمان چند روزہ خیال کر لیا کرتے تھے اور خدا کا کرنا برس کے اندر ہی اندر اُن کے خیال کی تصدیق بھی ہو جاتی تھی۔ چھٹی اور عقیقے اور مونڈن تو یاد پڑتے بھی ہیں مگر سال گرہ۔ نمک چشی مو رنڈے اور اور جو تقریبیں بعد کو ہوا کرتی ہیں ہم نے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بھی تحقیق کیا اس خاندان میں لڑکیوں کے لیے کوئی نہ بتا سکی بس آزادی نہ صرف اکیلی بیٹی تھی بلکہ اکیلی پوتی اکیلی نواسی اکیلی بھانجی اکیلی بھتیجی۔ آزادی پیدا ہوئی تو اناتن درست ٹپڑے کا ٹپڑا اچھے خاصے چار چار پانچ پانچ اُنگل گھنے گھونگروالے سیاہ بال چھٹی کے اندر کی کیا البساط؟ ماں کی گود میں سوتی کو دیکھا تو نظر لگانے والوں کی آنکھوں میں خاک جیسے برس سوا برس کا پلا ہوا مرد بچہ۔ پہلی بدگمانیاں اور اس کی یہ حالت کوئی نہیں کہتا تھا کہ یہ جیئے گی لیکن وہ کاٹھی ایسی لے کر آئی تھی جس نے کسی طرح کے روگ کو اُس کے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ خدا نے اس کو جلد جلد پروان چڑھایا۔ وہ بیل ہو کر بڑھی اور جال ہو کر پھیلی۔ پہلی سال گرہ میں وہ دوڑی دوڑی پھرتی تھی۔ اور دوسری میں ایسی بلا کی باتیں کرتی تھی جیسے بنگالے کی مینا۔ وہ بچپنے ہی سے اس درجے کی ذہین تھی کہ اُس کی غیر معمولی ہوشیاری جو اکثر جان ہار بچوں میں ہوتی ہے دیکھ دیکھ کر اُس کے عزیز سہمے چلے جاتے تھے۔ گھر میں چرچا دیکھ کر آپ ہی آپ اس نے پڑھنے کا شوق کیا اور جس قدر اس ملک میں شریف زادیوں کو جاننا اور سیکھنا ضرور ہے آٹھ نو برس کی عمر میں بخوبی سیکھ سمجھ لیا اس کی تربیت دو مخالف قوتوں کی کشمکش میں تھی اس کے باپ نے مشن کالج میں اوسط درجے کی انگریزی تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ اس کو مدرسہ چھوڑے بہت زمانہ گزر گیا تھا اور مدرسے کے بعد بھی اُس نے کتاب بینی سے مطلق سروکار نہیں رکھا اور عموماً طالب العلموں کا قاعدہ بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن ابتدائے عمر کی تعلیم کا اثر اس کے دل میں بیٹھ چکا تھا وہ ہندوستانیوں کی کل اداؤں کو حقارت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا اس کو انگریزی اس قدر تو نہیں چڑ گئی تھی کہ غل مچاتا اور ریفارمر[۱] بنتا لیکن خانہ داری کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ اکثر مُونہ بناتا اور ناک بھوں چڑھاتا جس سے اُس کے اصلی خیالات وقتاً فوقتاً سب پر ظاہر ہوتے رہتے تھے وہ بڑبڑاتا ہی رہتا اور سارے کام کاج اپنے طور پر ہوا کرتے۔ اولاد کے بارے میں وہ

[۱] انگریزی لفظ ہے جس کے معنی ہیں اصلاح دینے والا۔ ادیب ۱۲

بازی لے گیا۔ دستور کے مطابق چاہتا تھا کہ بچے پانچ برس کے ہوں تو اُن کی بسم اللہ ہو مکتب میں جائیں قاعدہ پڑھیں قاعدے کے بعد عم کا سیپارہ پھر قرآن پھر فارسی۔ اس نے ان سب باتوں کو بٹّا دیا۔ کیسی بسم اللہ اور کہاں کا مکتب لڑکوں کو مفردات بچپن اُردو پر لگا دیا۔ اُردو میں شُد بُد پیدا کی نام اور آسان جملے لکھنے لگے کچھ پہاڑے سیکھ لیئے اتنے میں ذرا کی اور سیانے بھی ہوئے ساتھ لے جا مدرسے میں نام لکھوا دیا جہاں نہ خدا کا دیدار نہ محمدؐ کی شفاعت۔ خاندان میں اس کی بڑی کھچڑی پکی یہاں تک کہ ایک دن اسی بات پر میاں بی بی میں تکرار ہو پڑی۔ بچوں کی تعلیم کا کچھ تذکرہ تھا میاں کے مونہ سے نکلا کہ تم بچوں کی سب طرح کی پرداخت کرتی ہو مگر ان کے پڑھنے لکھنے کی بالکل خبر نہیں رکھتیں۔ میں نے دو روز سے اگر امتحان لیا تو دونوں میں ایک کو بھی پچھلا پڑھا ہوا یاد نہیں۔ کیا ہر روز مدرسے نہیں جاتے یا گھر پر کتاب نہیں دیکھتے ماسٹر میری مروت سے درگزر کرتا ہوگا لیکن تا بہ کے اگر یہی حال رہا تو ایک نہ ایک دن مدرسے سے ان کا نام ضرور کٹ جائے گا۔ بی بی۔ اس مدرسے کو لگے جھلسا میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ میرے بچوں کے نام کل کے کٹتے آج کٹ جائیں۔ میاں اوہو تم تو مدرسے کی طرف سے بہت ہی کچھ بھری ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ بی بی۔ بھری ہوئی؟ میں نے تمہارے ڈر سے اب تک ہوں نہیں کی ورنہ میرا بس چلے تو میں کسی مسلمان کے بچے کو اُدھر رخ نہ کرنے دوں۔ مدرسے میں جا کر کوئی مسلمان مسلمان رہ سکتا ہے۔ میاں یہ تو آج نیا مسئلہ سننے میں آیا کہ مدرسے میں جانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ تو تمہارے نزدیک میں بھی کافر ہوں اور جس جس نے مدرسے میں پڑھا سب کافر۔ اور سب سے بڑے کافر تو تمہارے ماموزاد بھائی جنہوں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور جتنے مسلمان مدرس ہیں۔ کافر گر ذری سمجھ کر تو بات کیا کرو۔ تم اپنے والد ہی سے پوچھنا کہ مسلمان کو جو کافر کہے اُس کا کیا حکم ہے اور خبر بھی ہے میاں بی بی میں سے ایک بھی کفر کرے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ بی بی۔ کیا جانیں سارا شہر تھڑی تھڑی کر رہا ہے اور ابّا جان ہی کو لوگ آ آ کر چھیڑتے ہیں کہ ایسے بڑے مولوی اور واعظ کے نواسے پادریوں کے مدرسے میں داخل ہیں۔ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ میں نے اس شرمندگی کے مارے لوگوں کے ہیاں برات میں

بھی جانا چھوڑ دیا۔ میاں۔ بھلا تمھارے والد نے بھی کچھ کہا؟ بی بی۔ اتنا تو اُنھوں نے بھی کئی بار
کہا کہ شہر میں بہتیرے مدرسے بھرے پڑے ہیں بڑی بے جا بات کی کہ پادری کے مدرسے
میں لڑکوں کو داخل کیا یہ لوگ اپنے عقیدے سکھا سکھا کر لڑکوں کو بے دین کر دیتے
ہیں اور اباجان اس بات سے بھی نہایت ناراض ہیں کہ تم نے بچوں کو قرآن نہیں پڑھوایا
غضب ہے کہ مسلمان کے بچے اور قرآن کا ایک بول نہ جانیں۔ تمہاری اولاد ہے تم خدا کے
یہاں چل کر اس کی جواب دہی کر لینا۔ بگڑو یا رُوٹھو میں اس معاملے میں تمہاری شریک
نہیں۔ میاں۔ جب معنے نہیں سمجھ سکتے تو طوطے کی طرح لفظوں کے پڑھانے سے کیا
فائدہ تھا۔ بی بی۔ اب یہ ہزاروں لاکھوں مسلمان مرد اور عورت قرآن پڑھتے ہیں اور
معنے مطلب نہیں سمجھتے تمہارے نزدیک تو یہ سب احمق ہیں۔ میاں۔ بے شک اور تم
ان کے پڑھنے سے کیا سند پکڑتی ہو میں تو اس عقیدے کا آدمی ہوں کہ میرے نزدیک
بے سمجھے نماز بھی نہیں ہوتی۔ بی بی۔ میاں نے جو ذری کی ذری مدرسے کے لڑکوں کو بُرا کہا
تو اُس پر اتنے اچھلے کودے اب جو تم مونہ بھر بھر کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر کہہ رہے
ہو تم جانو۔ میاں۔ سچ کہا ہے نیم مُلّا خطرۂ ایمان نیم حکیم خطرۂ جان۔ کجا کافر۔ کجا نماز کا نہ ہونا۔
خیر اس سے کیا بحث اپنی اپنی رائے ہے یہ بتاؤ کہ بچوں کو بے سمجھے قرآن کا پڑھنا مفید ہے
یا نہیں۔ بی بی۔ تم کس طرح کا فائدہ ڈھونڈھتے ہو فائدہ یہی کہ قرآن پڑھنے لگے۔ قرآن کے
لفظوں میں بھی ثواب اور برکت ہے۔ میاں۔ بچوں کو قرآن ثواب اور برکت کے لیے پڑھایا جاتا ہے
یا اس غرض سے کہ ان کو لکھنا پڑھنا آئے۔ بی بی۔ دونوں ہی مطلب ہیں۔ میاں۔ ثواب سے
تو ہاتھ دھو رکھو وہ قرآن جس کو خدا فرمائے لایمسہ الا المطہرون۔ جز جز اور ورق ورق کر کے نہایت
بے توقیری کے ساتھ بے تمیز بچوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جس کو وہ پھاڑتے اور بگاڑتے
اور دست مال کرتے۔ ان کے پڑھے ہوئے سیپارے میلے کچیلے گندے جن کو آنکھ بھر کر دیکھنے
کو جی نہیں چاہتا۔ قرآن کے ساتھ یہ کچھ بے ادبیاں ہو رہی ہیں اور اس پر ثواب کی توقع
بی بی۔ بے شک احتیاط نہیں ہوتی اور ہو بھی نہیں سکتی۔ مگر معصوم بچوں سے

لا؎ پاک لوگوں کے سوائے اس کو اور کوئی نہیں چھونے پاتا ۱۲

کسی طرح کی پرسش نہیں۔ میاں۔ اگر بچوں سے پرسش نہیں تو ان کو ثواب بھی نہیں۔ بی بی
لیکن بڑے ہو کر تلاوت کریں گے تو آگے چل کر اُن کو ثواب ہو گا۔ میاں بے سمجھے۔ بی بی
ہاں ہاں بے سمجھے بھی۔ میاں۔ ایسے بے اصل ثواب کے لئے تمہارے میکے والے اور جو اُن سے
ارادت رکھتے ہیں بڑبڑایا کریں میں اپنے بچوں کو اس زحمت میں نہیں ڈالتا میں سردست اتنا
ہی چاہتا ہوں کہ اُردو کے پڑھنے لکھنے پر بخوبی قادر ہو جائیں۔ سو میں امید کرتا ہوں جتنے
دنوں میں قرآن ختم کرتے اتنے ہی دنوں میں اس بدشوقی پر اچھی خاصی اُردو پڑھنے لکھنے
لگیں گے اور میں تم کو دکھا دوں گا اور حساب وغیرہ سیکھیں گے سو الگ۔ بی بی۔ میں کہتی ہوں
کہ تمہارا یہ مطلب بھی قرآن ہی سے باسانی اور جلد حاصل ہوتا۔ میاں۔ یہ کیوں کر؟ بی بی۔
میں تمہاری طرح انگریزی نہیں پڑھی اور خدا نہ کرے کہ کوئی پڑھے تو کیا اتنا بھی نہیں سمجھتی
میاں نہیں۔ تم سب کچھ سمجھتی ہو مگر مجھ کو بھی سمجھاؤ۔ بی بی۔ جان بوجھ کر انجان کیوں بنے
جاتے ہو۔ یہ تو خود اپنے پر گزری ہوئی ہے اور بیسیوں بچوں کو پڑھا کر دیکھا ہے۔ زیر زبر
کے سہارے سے رواں نکالنا جلد آ جاتا ہے۔ پھر جو اُردو شروع کرائی جاتی ہے تو خدا جانے
کچھ اٹکل ہو جاتی ہے اور میں تو قرآن ہی کی برکت کہوں گی تین مہینے میں اُردو فراٹے کے ساتھ
پڑھنے لگتے ہیں۔ تمہارے لڑکوں کو وہی قرآن نہ پڑھنے کی پھٹکار ہے کہ آج تک اُردو صاف
نہیں چلتی وہی رین رین۔ میاں۔ یہ تمہارا بالکل غلط خیال ہے مبتدی کو جس طرح قرآن
میں زیر و زبر کا سہارا ملتا ہے اسی طرح اُردو میں مطلب سمجھنے کا یہ فرق تم کو اُس وقت محسوس
ہوتا کہ ایک ہی طرح کے ذہن کے دو بچے ہوتے ایک کو قرآن شریف شروع کرایا جاتا اور
دوسرے کو اُردو مگر وہ اُردو جس میں زیر زبر لگے ہوں تب تم دیکھتیں کہ قرآن پڑھنے والا
پڑا رینگ رہا ہے اور اُردو خواں سرپٹ چلا جاتا۔ بی بی۔ خدا کے لئے کہیں بخشو گے بھی۔ میرا
پیچھا کیوں لیا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں نہ دخل دیا اور نہ آگے کو دوں۔ رہی
لڑکی اس کو نہ نوکری کرنی ہے نہ لوگوں میں لیاقت علمی جتانی جیسا بُرا بھلا مجھ کو آتا ہے سمجھ
سمجھ سکھا پڑھا لوں گی۔ میاں۔ میں لڑکوں کی طرف سے تو کسی قدر مطمئن بھی ہوں
ابھی ناسمجھ ہیں شوق کرنے کی عمر نہیں گھر پر برابر میرا رہنا نہیں ہوتا مگر میں ان کی تعلیم کا

انتظام کر دوں گا۔ افسوس آزادی کی بربادی۔ اس کو تم اپنے ہی جیسی اُٹھاؤ گی۔ بی بی۔ کیوں
مجھ میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ میں سینا نہیں جانتی۔ پکانا نہیں جانتی۔ لکھ پڑھ نہیں سکتی
گھر کا انتظام نہیں کر سکتی۔ بچے پالنے مجھ کو نہیں آتے۔ پھوہڑ ہوں۔ بدسلیقہ
ہوں۔ تم کیا قدر کرو گے اپنے کنبے کے لوگوں سے پوچھو۔ محلّے والوں سے
دریافت کرو۔ اتنی نہیں اس سے ڈیوڑھی دونی آمدنی کے گھر سے اپنے یہاں کے
سازوسامان کو ملاؤ دو چار دن گھر میں بیٹھ کر دیکھو کتنی عورتیں مجھ سے ہنر سیکھتی رہتی
ہیں؟ کوئی کپڑے قطع کرانے آتی ہو۔ کوئی صلاح لینے۔ کوئی دوا پوچھنے۔ کوئی خط
لکھوانے پڑھوانے۔ کوئی کتاب سننے۔ کوئی مسئلہ دریافت کرنے۔ شادی بیاہ وغیرہ بڑی چھوٹی
جتنی تقریبیں میرے بیاہ کے بعد تمہارے اور ہمارے کنبے اور اس محلے میں ہوئی ہیں
کسی ایک تقریب کا نام لو جس میں انتظام کے لیے میں نہ بلائی گئی ہوں۔ کیا تم نہیں
جانتے ایک بات کی پیچ پر آ کر مار جاؤ تو خبر نہیں۔ خاک چاٹ کر کہتی ہوں اگر آزادی خدا
اس کو جیتا رکھے ما جلتی ہوئی تو جس گھر جائے گی سسرال والے اس کے پاؤں دھو
دھو کر پئیں تو سہی۔ میاں۔ میں تم سے کن دنوں سے کہہ رہا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ
ذری کی ذری ہمارے پادری صاحب کے گھر کو ایک نظر چل کر دیکھو تو تمہاری شیخی دم کے
دم میں کرکری ہو کر رہ جائے۔ بی بی۔ توبہ خدا نہ کرے میں نگوڑے پادری کے گھر کیوں
جانے لگی بس ایسے اخلاص سے مجھ کو معاف رکھو۔ میاں۔ کیوں گھبرائیں کیوں؟ کوٹھی
میں پردہ ہو جائے گا میم صاحب ہوں گی اور اُن کی لڑکیاں اور کچھ آیا وغیرہ۔ پادری صاحب
بیچارے ہم سے زیادہ غریب ہیں اور بڑے کثیر العیال۔ غریبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔
نہ امیری ٹھاٹھ ہیں اور نہ اُن کو اتنا مقدور۔ مگر انتظام اور سلیقہ اور صفائی اور کفایت
شعاری اور ہنر اور لیاقت اور محنت اور نیکی بس دیکھو تو معلوم ہو۔ چلو تو گاڑی منگاؤں
ایک گھنٹے میں لوٹے آتے ہیں۔ اس وقت سردی بھی کم ہے۔ بی بی۔ میں تو نہ کہیں آؤں
نہ جاؤں۔ میاں۔ بس یہی تو کوڑ مغزی کی باتیں ہیں میری خاطر سے ایک مرتبہ چل کر دیکھو اگر
ذری سی بات بھی خلاف مزاج پیش آئے میرا ذمہ۔ بی بی۔ سرے سے جانا ہی میرے مزاج

کے خلاف ہے۔ بی بی۔ تو خیر مذہب میری ایسی کیا شامت آئی ہے کہ بیٹھے بٹھلائے اجنبی لوگوں میں
جا کر شہر میں اپنا نام بد کراؤں۔ میاں۔ میں جو ساتھ ہوں گا۔ بی بی۔ ہوا کرو۔ میاں۔ پردہ
میرا حق ہے اور تم کو میرا کہنا ماننا ہو گا۔ بی بی۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تم
زبردستی تو میرے سر ہو نہیں۔ عورتیں میاؤں کا حق سمجھ کر پردہ کیا کرتی ہوں گی تو کواریاں
اور رانڈیں بازاروں میں مونھ کھولے پڑی پھرا کریں۔ پردہ بندے کا نہیں بلکہ خدا کا حق ہے
خدا نے عورتوں کو پردے کا حکم دیا ہے۔ میاں۔ بس لو اسی بات پر میری تمہاری شرط
یا تو تم کسی کتاب میں دکھا دو کہ عورت سے عورت کو پردہ کرنے کا حکم ہے یا نماز جماعت میں
عورتوں عورتوں کا شریک ہونا قضائے حاجت کے لیے باہر جانا اور باہر کہاں شہر کے
باہر جیسا کہ اب بھی دیہات میں رواج ہے جہاد میں زخمیوں کی خبر گیری اور سپاہیوں کی خدمت
کرنا غیر مردوں سے بولنا چالنا یہ باتیں میں حدیثوں سے ثابت کرتا ہوں دیکھ لو پڑھ لو پوچھ لو
تب تو مانو گی ہاں اور پھر یہ عورتیں کون تھیں ماوشما نہیں پیغمبر صاحب اور اُن کے اصحاب رض
کی بیبیاں بیٹیاں۔ تم ان سے بھی بڑی نکلیں کہ لگیں عورتوں سے پردہ کرنے۔ اور کیوں
صاحب حلال خوری۔ دھوبن۔ منہیاری۔ چماری پنہاری کے سامنے جو ہوتی ہو۔ بی بی۔
بے شک اب پردے میں پہلے سے بہت ترقی ہو گئی ہے مگر ویسے ہی اگلے لوگوں کی نیتیں بھی
درست تھیں اب اس سختی پر بھی بات نہیں بنتی مگر جس کا پردہ خدا رکھے۔ اور حلال خوریاں
وغیرہ کی جو دلیل تم نے پکڑی تو ان سے ہماری ضرورتیں متعلق ہیں۔ میاں۔ اجی وہ سب
سے بڑی ضرورت ہے جس کے لیے میں تم کو پادری صاحب کے یہاں لیے چلتا ہوں
اُن کی بی بی بچوں سے ملو اور اُن کا گھر دیکھو ضرور تمہارا خیال اور گھر کے انتظام کا رنگ
بالکل بدل جائے گا۔ بی بی۔ میرا دل ہی خدا نے ایسا اُلٹا ڈول نہیں بنایا میں اپنی حالت
اور ضرورت کو خوب سمجھتی ہوں مجھ کو اپنے ہی لوگوں میں جینا اور اپنے ہی لوگوں میں مرنا ہے
میں فرنگنوں کے ڈھنگ دیکھ کر کیا کروں گی پہلے پردے سے بے پردہ ہو لوں تو اُن کی
ریس بھی کروں۔ میاں۔ کیوں جی رات دن گھر میں گھٹے گھٹے تمہارا جی نہیں اُکتاتا
بی بی۔ خدا نہ کرے کیوں اُکتانے لگا کبھی چھ سات پیسے ڈولی کہیں جانا ہوتا ہے تو سارے

رستے ہوں سا چڑھا رہتا ہے کہ کب پہنچیں گے۔ یہاں تو سودا کا یہ شعر تمہارے حسب حال ہے

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کی — کہ جس نے دل سے مٹا دی خلش رہائی کی

وہ طوطا بھی تمہیں یاد ہے جو یہاں درے میں لٹکا رہتا تھا اور جس کو کئی برس ہوئے نیولا توڑ گیا تم کو شاید خیال ہو اکثر پنجرے میں سے باہر نکل آتا مگر بیچارے سے اُڑا نہ جاتا۔ میں جب کبھی اُس کی یہ حالت دیکھتا اپنے ملک کی عورتوں پر افسوس کرتا کہ پردے کی قید میں پڑے پڑے ان کے دل مر گئے ہیں۔ خیر تم نہیں چاہتیں تو آزادی کو اجازت دو ہ بی بی (طنز سے) ہاں اس کو شوق سے لے جاؤ اس کا دیدہ یوں بھی ہوائی ہے۔ سات برس کا تو ٹھا سنتے سے یہ نہیں چھپتی۔ اُپلے والے سے یہ نہیں چھپتی۔ مردانے کے نوکروں اور سودے والوں سے یہ پردہ نہیں کرتی بہتیرا روکتی رہتی ہوں۔ بولے گی تو اس قدر چلا کر کہ گلی میں صاف سنائی دے لیکن لے تو جاؤ گے پر اس کے جو والی وارث ہوں گے تم کو اور اس کو دونوں کو مزہ بھی چکھا دیں گے یہ سن کر آزادی کا باپ کچھ ڈر سا گیا۔ بات رفع دفع ہو گئی۔ اسی طرح آزادی کے کانوں کے چھدنے پر کئی دفعہ حجت ہوئی۔ آزادی کی ماں سچ کہتی تھی کہ دیکھو تو کیا بھول ہوئی بچپنے ہی میں اس کے کان چھد وائے ہوتے تو نہ یہ ضد کرنے پاتی کہ کانوں کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی اور گوشت تھا نرم اس کو تکلیف بھی کم ہوتی۔ آزادی کا یہ حال تھا کہ کن بندے کی آواز کان میں پڑی اور پتا توڑ غائب ہوئی۔ گھر میں بعض عورتیں ایسے سخت دل کی بھی تھیں کہ وہیں کان چھید دیتیں مگر آزادی بنور بچاتی تھی۔ ایک دو دفعہ دبوچی گئی تو لگی پٹخنیاں کھانے دہائی دینے۔ چھوڑ چھوڑ دیا۔ کچھ تو اس کے اپنے دل میں ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور بہت کر کے باپ کا اشارہ اور سہارا کہ وہ رُو در رُو بیٹی سے کہتے تھے آزادی کان ہی نہ چھد وا نا بڑا ہی دکھ ہوتا ہے اور تمہاری مٹی ہو چکی برسوں کی جھیل میں پڑ جاؤ گی۔ بی بی۔ کہتی مجھے کیا سناتے ہو میری بلا سے۔ یہی ناک کان سے ننگی بُری پھرے گی۔ ہم تو سستے چھوٹے اتنا زیور نہیں دینا پڑے گا تم نے اس کو یہ تو اپنے مطلب کی اچھی صلاح دی۔ میاں (بیٹی کی طرف رخ کر کے) نہیں بیٹیا تم ماں کے

بہکائے میں نہ آنا۔ خداوندہ دن کرے گا تو ناک کان کے بدلے ہاتھ گلے میں جتنا چاہنا لادلینا (بی بی کی طرف متوجہ ہو کر) اور مجھ کو یہ توقع ہی کہ آزادی بڑی ہو کر عام ہندوستانی عورتوں کی طرح احمق نہیں رہی گی اور سمجھے گی کہ عورتوں کو کتنی زینت کی ضرورت ہی یقین ہی کہ یہ خود زیور کے بدلے نوٹ یا جائداد کا لینا پسند کرے گی۔ ایک بڑی مجبوری یہ ہی کہ تم لوگ کسی بات میں عقل کو دخل نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہی کہ خدا نے آدمیوں کا پیدا کرنا کم کر دیا ہی آج کل کے آدمی آدمی نہیں ہیں بلکہ بھیڑیا ہیں جدھر کو اگلی بھیڑ کا مونہ اُٹھا سارا ریوڑ اُسی کے پیچھے ہو لیا۔ اگلے لوگوں نے جو دستور قرار دئے ممکن ہی کہ اُنہوں نے غلطی کی ہو کیوں کہ وہ بھی کچھ معصوم فرشتے نہ تھے بلکہ ہم ہی جیسے آدمی تھے اور کون بندہ بشر ہی جس سے غلطی نہیں ہوتی۔ یا ایک فعل ایک وقت خاص تک مناسب اور قرین مصلحت ہوتا ہی اب زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہی خدا نے سلطنت پر مسلط کر دیا ہی اُن لوگوں کو جو ہر طرح اُس کے شایاں ہیں۔ اس عمل داری میں ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہی اور کر رہا ہی۔ ہر چہار طرف ریل جاری ہو گئی ہی اور ایک دن آنے والا ہی کہ مکڑی کے جالے کی طرح ہر جگہ پھیلی ہوئی ہو گی۔ یہ ریل ہی کا طفیل ہی کہ ہم مہینوں کے رستے ہفتوں میں اور ہفتوں کے گھنٹوں میں طے کرتے ہیں بے زحمت بے تکان۔ ایک پیسے میں جہاں چاہو خط بھیج دو۔ انگریزی عمل داری کی بے شمار برکتوں میں سے ایک تار برقی ہی کہ اگلے وقتوں میں ایجاد ہوا ہوتا تو کرامت اور خرق عادت سمجھا گیا ہوتا۔ آٹھ آنے کی بھی کچھ حقیقت ہی کلکتہ۔ برما۔ مدراس بمبئی۔ پشاور۔ غرض تمام ہندوستان میں دور سے دور کوئی جگہ فرض کر لو چٹکی بجاتے میں خبر موجود۔ گاؤں گاؤں مدرسے۔ جگہ جگہ شفا خانے آرام اور آسائش کی سیکڑوں ہزاروں چیزیں ولایت سے بن بن کر چلی آتی ہیں سستی اور عمدہ سے عمدہ۔ امن کا یہ حال ہی کہ شیر اور بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا کہانیوں میں سنا کرتے تھے یا اب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اگلے وقتوں کی بے اطمینانیاں تھیں کہ لوگ مقدور کو چھپاتے اور دولت کو زمین میں گاڑتے یا زیور وغیرہ کے پیرائے میں رکھتے۔ خیر تھوڑی مالیت بہت ذرا سا کھٹکا ہوا کہیں کونے کھدرے میں دبا بیٹھے میں اُڑس

چلتے پھرتے نظر آئے۔ اب ہر ایک آدمی کی جان اور آبرو اور دولت پورے طور پر محفوظ ہے
غریب کی جیسے امیر کی۔ حاکم کی جیسے محکوم کی۔ مسافر کی جیسے مقیم کی۔ اکیلے کی جیسے جتھے
کی۔ غرض عملداری بدلی انتظام بدلا زمین بدلی آسمان بدلا اور نہ بدلے تو ہمارے دستور۔ یہ
مصرع تو تمہارے کان میں بھی پڑا ہوگا ع کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔ تو کیا اس کے یہ
معنے ہیں کہ زر و گنج میں مقناطیس کی طرح کشش کی قوت ہے۔ نہیں نہیں بلکہ اس کے معنے
یہ ہیں کہ دولت سے دولت کمائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں مفلسی کی شکایت عام ہے
اور مسلمان مفلس ہیں بھی۔ مگر ان کے افلاس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو دولت سے دولت
کمانے کا سلیقہ نہیں۔ دولت اگر ان کو خدا دے بھی تو گاڑیں گے دبائیں گے چھپائیں گے
یا بے کار و بے مصرف کرنے کے لئے زیور بنوائیں گے یعنی اگلے وقتوں میں دوسرے لوگ
چرا لیتے تھے اب اپنی دولت کو آپ چرائیں گے مگر یہ نہیں ہوگا کہ اس کو بڑھائیں گے
یا اس سے کچھ کمائیں گے۔ بی بی۔ تمہارے ایسے خیالات ہیں تو تم ہنسی کی بات بھی کہیں
نہیں لگنے دو گے اور تمہاری تو عادت ہے ضرور تم نے لوگوں میں کچھ کہا سنا ہوگا۔ ابھی
اس کی مانگ آج تک کہیں سے نہیں آئی اور اولاد کے حق میں اچھی خیر خواہی کر رہے ہو۔
میاں کیا دیر ہو گئی ہے؟ بی بی۔ دیر ہونے کیا دیر لگتی ہے۔ یوں تو خیر ہم لوگوں میں لڑکیاں
کچھ چودھویں برس ضرور بیاہ دیتے ہیں لیکن اس کا ماشاء اللہ ایسا اٹھان ہے کہ یہ تو کیا
بتاؤں بارھویں ہی میں بیاہی ہو گی۔ میاں۔ اجی اللہ اللہ کرو۔ اٹھارہ نہیں تو سولہ۔ بی بی۔
تو سیدھی بات بھی کیوں نہیں کہتے کہ بیٹی کو بٹھا رکھنے کی صلاح ہے۔ ہے بھی تو اکلوتی
لیکن بیٹی ذات کو بادشاہ وزیر نہیں بٹھا سکے ہماری تو کیا اصل ہے۔ میاں۔ یہ تو
سولہ برس تک بیٹھے ہی گی۔ اور سولہ بھی برس اس نظر سے کہتا ہوں کہ تم اس کے اٹھان
کو دیکھتی ہو بھلا اتنی سی کے بیاہ بھی کچھ بیاہ ہیں مرد اور عورت اتنے تو ہو لیں کہ اپنی رائے
ظاہر کر سکیں۔ میں خیال کرتا ہوں سولہ برس سے کم میں رائے کا مادہ بھی پیدا نہیں ہوتا
ظاہر کریں کیا خاک۔ بی بی۔ ہوش میں آؤ تمہارا کدھر خیال ہے اب تو سولہ برس کی عورت
تین نہیں تو دو بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ میاں۔ تو ویسے ہی رونی صورت اونگھتے ہوئے

بچے بھی ہوتے ہیں اور ویسے ہی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں موت کا پرسنٹ زیادہ اور عمر کا
اوسط کم ہے اور ویسے ہی اکثر میاں بی بی میں ساری عمر بے لطفی اور ناسازگاری بھی رہتی ہے۔ بی بی
تم خدا کے لیئے ایسی باتیں تو کرو مت ۔سُن سُن کر کوارے بچوں کے مونہ کا نور صبور اُڑا چلا جاتا ہے۔

آزادی کے ماں باپ میں اسی طرح کے تذکرے آئے دن رہا کرتے تھے اور سوائے اس کے
اور باتیں بھی کیا تھیں جس میں ان کا وقت کٹتا۔ آزادی کے دل پر ان باتوں کا اثر
کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ کچھ یوں ہی سی کسر رہ گئی ہوگی تو اس کو پادری صاحب کی
میم نے پورا کر دیا۔ آزادی کے باپ خواجہ آزاد نے پادری صاحب کے گھر زنان خانے
کی آمد و شد کے لیئے بہتیرے ہی زور مارے جب موقع ملتا تو کہتا جب قابو پاتا سمجھاتا
مگر ایک نہ چلی۔ ان لوگوں کا پادری صاحب کی کوٹھی پر جانا تو بہت ہی مشکل تھا آزادی
کی ماں نے تو اتنے کی بھی ہامی نہ بھری کہ پادری صاحب کی میم یا اُن کی بیٹیاں
اس کے گھر آئیں۔

تیسری فصل۔ آزادی انگریزی سوسائٹی کے طریقے سے واقف ہوتی ہے

آخر خدا کا کرنا ایک دن آزادی کسی ضرورت سے رات کے وقت کوٹھے پر سے اُترتی تھی
اور یوں تو ساری ساری رات چراغ جلتا رہتا تھا اُس رات خدا جانے ہوا سے گل ہو گیا
یا تیل ہو چکا غرض اندھیر اگھپ پڑا تھا آزادی نے جلدی کے مارے چراغ کا تو انتظار
کیا نہیں جوانی کی عمر ہاتھ پاؤں میں پھرتی دھما دھم اُترنا شروع کیا۔ اتفاق سے
کسی سیڑھی پر بلّی پڑی سوتی تھی اُس پر جو بڑا زور سے پاؤں وہ بھیانک آواز سے چلائی
آزادی جھجکی اور چھونک سنبھال نہ سکی لڑکھڑا کر نیچے گری۔ گرنا تھا کہ بے اختیار
ایک زور کی آواز اس کے مونہ سے نکلی۔ بلّی کا غل اس کے گرنے کا دھماکا اور دھماکے
کے ساتھ چیخ۔ سارا گھر جاگ اُٹھا۔ آ کر دیکھا تو آزادی اوندھے مونہ زمین پر پڑی کراہ رہی ہے
چاہا سیدھا کریں اُٹھائیں۔ چھونا تھا کہ پھڑک اُٹھی۔ پوچھا تو جواب دینے کے
اوسان نہیں۔ باوجودے کہ کچھ ایسی گرمی نہ تھی مگر چوٹ کے صدمے سے پسینے پسینے ہو رہی

تھی اور تھر تھر بوٹی بوٹی پڑی کانپ رہی تھی۔ بارے جب بڑی دیر تک پنکھے جھلے گئے ٹھنڈے پانی سے مونہ دھلایا تو اس نے بڑی مشکل سے کراہتے کراہتے اتنا کہا کہ میری داہنی ٹانگ میں بڑے زور کی چوٹ آئی ہے سانس نہیں لیا جاتا مجکو چپکی پڑی رہنے دو کچھ کہو سنو نہیں۔ لوگوں کی اُس وقت کی بدحواسی بیان نہیں ہو سکتی۔ چوٹ تو لگی تھی آزادی کے مگر ماما کا رنگ فق ہو گیا تھا کہتی کچھ تھی اور مونہ سے نکلتا تھا۔ کچھ۔ قصہ چوٹ کے تشخیص کرنے کا کسی کو سلیقہ نہیں کہے تو آزادی نہ کہے تو آزادی۔ سناٹے میں بیٹھا ہوا ایک کو ایک تک رہا تھا۔ رات کا وقت بیٹی ذات کا معاملہ لوگ جو چوٹ چپیٹ کے لیے مشہور تھے کوئی بھٹ بھونجا تھا کوئی تیلی کوئی قصائی۔ کوئی نائی ہر چند سب نے غور کیا کوئی عورت اس کام کی جاننے والی سمجھ میں نہ آئی۔ دیر ہوئی چلی جا رہی تھی خیال ہوا کہ چوٹ ٹھنڈی نہ پڑ جائے۔ آخر آزادی کی ماں ہادی بیگم آپ ہی میاں سے بولی پادری کی میم کو اکثر لاؤں لاؤں کہا کرتے تھے اور مجھے خیال پڑتا ہے تم نے ان کاموں میں بھی اُس کی بڑی تعریف کی ہے دیکھو اگر ہو سکے تو اُس کو لاؤ۔ ہادی بیگم کے مونہ سے اتنی بات کا نکلنا تھا کہ خواجہ آزاد آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر میم صاحب کو جا کر بلا لایا۔ خواجہ آزاد پہونچا تو میم صاحب اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اُس نے آیا سے کہہ کر جگوایا سنتے کے ساتھ وہی شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے اوزاروں کی کسبت دواؤں کا بکس بغل میں دبا ساتھ ہو لیں۔ یہاں آتے ہی انہوں نے آزادی کو پہلے کچھ دوا پلائی۔ حلق سے اُترنا تھا کہ بے چینی موقوف ہوئی۔ پھر پیروں کی انگلیوں کو کھینچا پاؤں کو ہلایا جھلایا اپنے قاعدے کے موافق ہر طرف ٹٹولا۔ جب اچھی طرح دیکھ بھال چکیں تو لگیں کہنے میں اس تکلیف کے ڈر سے زیادہ چھیڑ نہیں سکتی مگر مجکو تو کولھا اُترا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگ اجازت دو تو کلوروفارم سنگھا کر میں اس کو اطمینان کے ساتھ دیکھوں۔ ہادی بیگم۔ آپ کیا چیز سنگھائیں گی اور اُس سے ہو گا کیا؟ میم صاحب کچھ نہیں اس بوتل میں ایک عرق ہے رومال پر چھڑک کر اس کی ناک پر رکھ دوں گی تھوڑی دیر کے لئے لڑکی بے ہوش ہو جائے گی بس اس کو چت لٹا کر کروٹ لوا کر معلوم

کر لوں گی کہاں کہاں چوٹ ہو اور کیسی چوٹ ہو؟ ہادی بیگم۔ ابھی کتنی دیر بے ہوش رہے گی
میم صاحب جتنی دیر مجھے آئے ہوئی اتنی ہی اور۔ ہادی بیگم۔ اس کو ایذا ہو گی۔ میم صاحب
چوٹ کی تو ذرا سی بھی ایذا نہیں ہو گی مگر ہاں ہوش آئے پیچھے کسی قدر سر گھومے گا۔ اور
شاید جی بھی متلائے گا کیوں کہ یہ دوا شراب کی روح ہو اور اس میں بڑا تیز نشہ ہو لیکن
یہاں نشے کا اتارو وں گی طبیعت جلد ٹھیر جائے گی۔ ہادی بیگم۔ ہو ہو کٹ اب اس کو
سنگھاؤ گی شراب تو ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میم صاحب میں جانتی ہوں مسلمانوں
میں شراب حرام ہو اور ہم لوگ بھی اس کو برا جانتے ہیں مگر بچاری پر کچھ بس نہیں۔ اس کو
بے ہوش کرنا ضرور ہو اگر کولھا اتر گیا ہو جیسا کہ میرا خیال ہو اور میں یقین کرتی ہوں کہ
صحیح ہو تو بے ہوشی کے بدوں چڑھایا نہیں جا سکتا۔ اگر کلوروفارم سے بے ہوش نہیں کیجا
گی تو غش سے بے ہوش ہو گی اور اس میں زیادہ خطر ہو۔ اگر آپ اس کا آرام چاہتی ہو
تو جاری کرو ایسا نہ ہو کہ ہوش چڑھ آئے۔ ہادی بیگم تو بس وہیں ہی کرتی رہیں خواجہ
آزاد نے انگریزی میں کہا جناب یہ عورت بڑی وہمی اور متعصب ہو آپ میرے کہنے سے
کلوروفارم سنگھا کر اپنا عمل کیجیے۔ یہ کہہ کر آزاد لحاظ کے مارے سامنے سے ٹل گیا۔ اتنی
میم صاحب نے کلوروفارم بھی سنگھایا کولھا بھی چڑھایا اور باندھ بھی دیا۔ پٹی کا آخری
لپیٹ باندھا جا رہا تھا کہ آزادی نے لال لال چڑھی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ میم صاحب نے
اوپر والوں کی تسلی کی اور پھر آزادی کو کچھ دوا پلائی اور چلتے ہوئے چند پڑیاں دے
گئیں کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو گھنٹے گھنٹے ورنہ آدھے گھنٹے بعد پلائی رہنا میں
امید کرتی ہوں صبح تک سارا خمار اتر جائے گا۔ اور جلدی میں بندش اچھی نہیں بن پڑی
اس کو چاہیے تھا اور اور میرے ہاتھوں میں اتنا بوتا نہیں صبح ہوتے ہی میں اپنی بڑی
لڑکی مس میری کو پٹیاں اور پڑیاں دے کر بھیجوں گی وہ بندش کو ٹھیک ٹھاک کر جاوے
گی ہادی بیگم۔ کیا آپ کی بیٹی پھر اس کو وہی شراب سنگھائیں گی؟ میم صاحب نہیں اب
سنگھانے کی کچھ حاجت نہیں۔ بندش کو کس دینا ہو اور بس آپ کسی طرح گھبرائیے نہیں
کولھا میرے نزدیک بہت درستی کے ساتھ بیٹھ گیا ہو۔ ہادی بیگم۔ اب یہ چلیں پھر کس کی

کب ہ؟ میم صاحب۔ اس وقت تو اس کی بڑی احتیاط چاہیئے کہ کسی طرح ہلیں جلیں نہیں۔ بھلا زیادہ نہیں تو ایک ہفتے اسی طرح لیٹی رہیں۔ ایک ہفتے بعد میں آپ آ کر بندش کھولوں گی اور اُس وقت بتا سکوں گی کہ کب تک چلیں پھریں گی۔ اگلے دن ابھی اچھی طرح دھوپ بھی نہیں نکلی تھی کہ مس میری سامان بندش لیئے ہوئے آموجود ہوئیں اور بڑی پھرتی کے ساتھ جکڑ بند کر کے دونوں پہلوؤں میں اس طرح تکیئے لگا دیئے کہ مریضہ ہلنا چاہے بھی تو نہ ہل سکے۔ آزادی کی عام تن درستی ماشاء اللہ شروع سے ایسی عمدہ حالت میں تھی کہ گو اُس کو بہت بڑا جھکولا پہنچا تھا مگر وہ مہینے کے اندر ہی اندر اچھی خاصی تن درست ہو جاتی لیکن وہ کچھ تھی بھی چلبلی بہتیرے انتظام کیئے مگر وہ نچلی نہ رہ سکی مس میری۔ بیمار۔ اور بیمار دار سب کو ڈراتی تھی کہ چوٹ کو دیر ہو جاتی ہ؟ اور خدا نہ خواستہ کہیں پاؤں چھوٹا پڑ گیا تو ساری عمر کو لنگ رہ جائے گا اور ہماری بھی بد نامی ہوگی لیکن تم لوگ کچھ پروا نہیں کرتے جب میں آتی ہوں بندش کو ڈھیلا پاتی ہوں اگر یہ ہلتی جلتی نہیں ہیں تو بندش آپ سے آپ کیونکر کھل جاتی ہ؟ ؟ بادی بیگم۔ اپنی جانب میں تو ہم اس کو ہلنے نہیں دیتے یہ آپ بھی سمجھ دار ہ؟ جہاں تک ہو سکتا ہ؟ احتیاط کرتی ہ؟ سوتے میں پاؤں بے کل ہو جاتا ہو تو مجبوری ہ؟ مس میری۔ کچھ مجبوری نہیں باری باری سے ایک آدمی جاگتا رہے مگر تم لوگوں سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اسی اثنا میں آزادی کو کچھ تپ بھی آنے لگی تپ نے مفارقت نہیں کی تھی کہ پیچش ہو گئی اور اب وہ پوری بیمار ہوئی۔ اور اوپر والوں کی نیتیں لگیں ڈانواڈول ہونے۔ مگر مس صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اب تک ہم اس کا علاج آپ لوگوں کی خاطر سے کرتے تھے اور اب اپنی خاطر سے کریں گے علاج کا کچھ قصور نہیں شروع سے ٹھیک قاعدے کے مطابق ہو رہا ہ؟ سارا قصور اوپر والوں کا ہ؟۔ بیمار داری درستی کے ساتھ نہیں ہوتی اس کو چاہیئے ہمہ وقت ہمارے پیش نظر رہتا لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اس کو میرے بنگلے پر جہاں اس کو تمھارے گھر سے یقیناً زیادہ آرام ملے گا نہیں بھیجو گی خیر اب ہم میں سے ایک آدمی یہاں رہے گا۔ رات کو میری سویا کرے گی بخار اور پیچش عارضی ہ؟ میں اس کی تن درستی کا بیمہ لیتی ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا

کہ سوا ڈیڑھ مہینے تو اس کے پیچھے جان ماریں ہم اور اب کہ اس کے اچھے ہونے کے دن قریب
ہیں۔ دوسرا اپنا نام کرے کہ میں نے اچھا کیا۔ مس میری نے مکان میں صفائی کرائی۔ ہوادار
جگہ میں آزادی کی اور اپنی چارپائی بچھوائی۔ آزادی کے تکیے بچھونے بدلوائے۔ دوا اور غذا
اور مالش اور ہر چیز کا آپ اہتمام کیا ایک ہی ہفتے میں ساری شکایتیں رفع ہو گئیں خشکی
کے وقت کچھ یوں ہی خفیف سا درد کولھے میں ہوتا تھا سو مالش جاری تھی۔ آزادی جھمیلے
میں تو پڑ گئی تھی لیکن انگریزنوں کی حسنِ تدبیر سے تیسرے ہی مہینے بالکل تن درست ہو گئی
اور بیماری سے اٹھ کر اس کا رنگ ایسا نکھرا جیسے گلاب کا پھول۔ میم صاحب تو کم مگر میری
اس قدر گھلی ملی کہ آزادی کے اچھے ہوئے بعد بھی بلا ناغہ ہر روز آتی اور گھنٹوں بیٹھتی۔
آزادی تو اس پر دموں دیوانی تھی ہی خود ہادی بیگم بھی اس کے ساتھ اس قدر انس کرنے
لگی تھی کہ کبھی کبھار میری دیر کر آتی تو انتظار کرتی یا سویرے جانا چاہتی تو روکتی۔ قومی
اور مذہبی اجنبیت جو آزادی اور میری میں تھی وہی دونوں کے زیادہ اختلاط کا باعث بھی تھی
وہ دونوں ایک دوسرے کو ایسا جاننا چاہتی تھیں کہ گویا ایک گھر میں پیدا ہوئیں ایک جگہ
رہیں سہیں اور ایک ساتھ کھیلیں۔ گھنٹوں گزر جاتے اور ان کی باتوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا۔
مناسبت عمری تو کچھ ایسی نہ تھی کیوں کہ آزادی اصل خیر سے اب بارھویں میں لگی تھی اور میری
کچھ دن کم انیس کی لیکن خدا جانے میری کی ملنساری کی کشش تھی یا آزادی کی بیماری
میں جو اس نے کسی طرح کی طمع نہیں لالچ نہیں سابقہ معرفت نہیں محض بے غرضانہ
خدمتیں اور ہمدردیاں اور دلجوئیاں کی تھیں ان کا اثر تھا کہ ہم نے دو سگی بہنوں میں
بھی اس طرح کا ملاپ نہ دیکھا نہ سنا جیسا میری اور آزادی میں۔ شروع شروع میں
تو آزادی نے رکاوٹ سی کی اور کواری لڑکی ایک اوپری عورت کے ساتھ جلد
بے تکلف ہوتی بھی کیوں۔ لیکن تین مہینے تک روز کے دو دو تین تین پھیرے اور
آخر کو رات کا رہنا۔ بیمار اور طبیب کا تعلق اور پھر اجنبیت ملاقات سے انس ہوا
انس سے الفت الفت سے محبت اُٹھان تو آزادی کا بھی اس ملک کی لڑکیوں میں کسی سے
کچھ دبا ہوا نہ تھا لیکن میری تو اچھی خاصی پوری عورت تھی۔ اس کے ڈیل ڈول سے اپنے اوپر

قیاس کرکے عورتیں اس کو جانچتی تھیں کہ کچھ نہ ہوگی تو دو تین بچوں کی ماں ہوگی۔ اسی دھوکے میں ایک
دن آزادی نے میری سے کہا آپ اپنے بچوں کو ہمارے یہاں کبھی نہیں لاتیں؟ ہمارا جی اُن کے
دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ میری (مسکراکر) میرا تو ابھی بیاہ بھی نہیں ہوا میں صرف نام کی میری (مریم)
ہوں[۱] کیا سمجھیں؟ آزادی۔ کیا آپ اُن عورتوں میں ہیں جو آپ لوگوں میں بیاہ نہیں کرتیں؟ اور جن
کا مذکور ایک دن آپ نے کیا تھا۔ میری نہیں میں نن نہیں ہوں اور نن ہونا پسند بھی نہیں کرتی
بلکہ میری والدہ نے اپنی زندگی میں مجھکو نن بنانا چاہا تھا مگر میں نے صاف انکار کیا اس سے شاید
وہ مجھ سے کسی قدر ناراض بھی مری ہوں تو تعجب نہیں۔ میری والدہ کے وقت کی ایک بہت پرانی
لکھنؤ کی رہنے والی آیا ہے اسی نے مجھکو دودھ پلایا اور اُس نے مجھکو پالا اور کھلایا اب
بہت ضعیف ہوگئی ہے ۔ اور میں نے اُس کی پنشن کردی ہے۔ اُس نے اپنی جوانی
میں کہیں نن لوگوں کی نوکری کی تھی اور اُن کے حال سے خوب واقف تھی۔ اُس کو دودھ
پلانے اور پالنے کی وجہ سے میرے ساتھ ایک خاص طرح کی محبت تھی اور اب بھی ہے۔ میری
عمر تو اُن دنوں میں چھوٹی تھی آیا نے مجھکو سمجھا دیا تھا کہ مسی بابا میں نے لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر
کی اچھوتیوں کی اور نن لوگوں کی خوب خوب سیر دیکھی ہے تم نن بننے کی ہامی ہی نہ بھرنا۔ میں
یہ نہیں کہتی کہ ماما[۲] سے میں تم کو زیادہ چاہتی ہوں۔ مگر ماما کی عقل کو مذہب نے چرلیا ہے وہ تم کو
جیتے جی جہنم میں جھونکنا چاہتی ہیں۔ میں بہتیرا لڑ چکی ہوں اور لڑوں گی بھی مگر میری اچھی بیٹی
ایک اتنی سی بات میری بھی مان لو میں تمہارے ہی فائدے اور آرام کے لیے کہتی ہوں
اس میں میرا اپنا مطلب کچھ بھی نہیں خدا نہ کرے کہ تم نن بنو ورنہ میری آج کی بات یاد کرکے
بہت پچھتاؤ گی۔ آیا نے جو اس اصرار سے کہا اُس کی نصیحت میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں
نے جی کو مضبوط کرکے اپنی والدہ سے دو ٹوک بات کہدی اُنہوں نے اپنے خیال کے
مطابق بڑا ہی رنج کیا اور مریں تو وہ اپنی موت سے مگر اس رنج نے ان کو جلد تحلیل کردیا۔
آزادی تو کیا یہ میم صاحب آپ کی ماں نہیں ہیں؟ میری ماں ہیں مگر سوتیلی میری والدہ کے
مرے بعد میرے باپ نے ان سے نکاح کرلیا پہلے شوہر سے بھی ان کے بچے ہیں۔ اور

[۱] اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت مریم کے بے شوہر حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے ۱۲ [۲] انگریزی ماں کو ماما کرکے پکارتے ہیں ۱۲

میرے والد سے بھی پانچ ہو چکے ہیں۔ خاندان بہت بڑھ گیا ہے اور مذہب کی تسلی نہ ہو تو میں
کہہ سکتی ہوں کہ خوش حالی نہیں ہے۔ آزادی۔ سوتیلی ماں آپ کو کیا چاہتی ہوں گی؟ میری۔ مجھکو
ان کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ بحث نہیں۔ میرے لیئے میری والدہ اس قدر چھوڑ مری ہیں
کہ میں اُس کی آمدنی سے بافراغت زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ آزادی۔ پادری صاحب کا
آپ کے ساتھ کیا رنگ ہے؟ میری۔ رنگ کیا ہوگا۔ میں اُن کے پاس رہی نہیں۔ سہی نہیں
آبو کے پہاڑ پر مدرسہ ہے وہیں رہی وہیں پڑھا۔ اب کوئی چار مہینے سے مہمان داخل
یہاں آئی ہوئی ہوں آزادی۔ شاید ماما کے مرجانے سے آپ کے بیاہ میں اتنی دیر ہوئی
میری۔ دیر تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔ ہم لوگ بس ایسی ہی عمر میں شادی کیا کرتے
ہیں۔ اس سے پہلے شادی کر دینا گڈے اور گڑیا کی شادی کا سا کھیل ہے۔ آزادی
پھر اب میم صاحب کو تو ایسی کیا پیٹر پڑی تھی۔ پادری صاحب ہی کہیں بات ٹھہرا رہے
ہوں گے۔ میری۔ شادی میری اور بات ٹھہرائیں پادری صاحب؟ اس کے کیا معنی؟
جی میں نے اپنی بات آپ ٹھہرائی ہے۔ آپ کو ہم لوگوں کا دستور معلوم نہیں۔ ہم لوگوں کا قاعدہ
یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کو پسند کر کے آپس میں رضامند ہو لیتے ہیں ماں باپ اور
دوسرے بزرگوں کی اجازت ایک رسمی بات ہے۔ آزادی۔ تو کیا آپ لوگوں میں کنواری
لڑکیاں غیر مردوں سے مل سکتی ہیں؟ میری۔ بے شک جیسے ہم اور آپ اور اگر ملیں نہیں
تو ایک دوسرے کا مزاج ایک دوسرے کا اصل حال کیوں کر معلوم ہو اور بے جانے
بوجھے زندگی بھر کے لیئے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تو اندھیرے کا نشانہ ہے لگا
تو تیر نہیں تو تکا۔ آزادی۔ بھلا فرض کیجیئے کہ آپ کسی شخص کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند
ہوگئیں اور پادری صاحب نے اجازت نہ دی تو آپ کیا کریں گی؟ میری۔ ایسا
اتفاق شاذ و نادر واقع ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا آخر میں بھی تو عقل رکھتی ہوں ایسے شخص سے
راہ و رسم ہی کیوں کرنے لگی جس کی نسبت پادری صاحب کو یا کسی کو اعتراض کی گنجائش ہو۔
صورت شکل۔ خاندان۔ ذاتی لیاقت۔ تندرستی۔ مزاج۔ عادت۔ آمدنی پیشہ یہی چیزیں دیکھنے کی ہوتی
ہیں۔ تو کیا میں نہیں دیکھ سکتی؟ اور بیاہ تو مجھکو کرنا پڑے گا میرا ہی دیکھنا مقدم ہے مرد اور عورت

ہیں جب اس طرح کا تعلق ہونے کو ہوتا ہے تو گھر والوں سے چھپا نہیں رہتا اور چھپانے کا دستور
بھی نہیں۔ کثرت سے آنا جانا۔ خط و کتابت تحفے تحائف بہت سی باتیں ہیں جن سے معلوم ہو جاتا
ہے کہ ایک دوسرے کی طرف مائل ہیں تو اگر گھر والوں کو کچھ اعتراض ہوتا ہے وہ ملاقات کو بڑھنے
ہی نہیں دیتے۔ آزادی۔ آپ نے جہاں اپنی بات ٹھہرائی ہے پادری صاحب نے اُس کو منظور
کر لیا؟ میری۔ بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ امتحان بڑی نام آوری کے ساتھ پاس کرتی رہی ہوں
دو برس سے لوگ درخواست کر رہے تھے میں نے کہا تھوڑے دنوں کی بات اور رہ گئی ہے
میں اپنی تعلیم کو ادھورا کیوں چھوڑوں اب کوئی چھ مہینے ہوئے میری پڑھائی ختم ہوئی
میں اس ننہال سے چلی آئی کہ باپ پاس رہ کر شادی کروں گی تو مجھ کو اُن سے صلاح
لینے کا موقع ملے گا اور باپ کے دم کے سوائے دنیا میں میرا ہے بھی کون؟ جن لوگوں
کو میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال تھا اُن میں سے دو صاحب میرا آنا سن کر یہاں بھی آئے
ہیں اور یہاں کے چند انگریزوں نے بھی ایسی خواہش ظاہر کی۔ آخر میں نے چار مہینے خوب
سوچ سمجھ کر ایک صاحب کو پسند کیا ہے مگر ابھی تک ہامی نہیں بھری اور انکار بھی نہیں کیا
بات کو ٹال رکھا ہے۔ ان صاحب میں اور کچھ تو عیب نہیں۔ خاندان کے شریف ہیں۔ لائق
ہیں۔ مزاج کے بھی ٹھنڈے ہیں۔ دل کے نیک ہیں۔ گو اس وقت صرف چار سو کے نوکر ہیں
مگر ترقی کے سلسلے میں ہیں۔ جوں جوں دن گزریں گے نمبر سے عہدہ بڑھتا جائے گا۔ مجھکو ان
کی ایک ہی بات کھٹکتی ہے کہ بازی بد کر گھڑ دوڑ کی لت ہے جو ایک قسم کا جوا ہے۔ میں نے ان
سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ گھڑ دوڑ کا عہد کر دو تو میں تم کو زبان دوں؟ ابھی تک نہ انہوں نے
عہد کیا نہ میں نے زبان دی اور نہ اپنے باپ کی منظوری حاصل کی۔ مگر اُن کی طرف سے
راہ و رسم میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بے چارہ عجب کشمکش میں پڑا ہے۔ ادھر بچپن سے
گھڑ دوڑ کا عشق اُدھر میری محبت۔ دور سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کا ہے پکا مونہ سے کہے گا
تو اس کو ضرور پورا بھی کرے گا۔ ورنہ کیا مشکل تھا؟ کہنے کو کبھی کا کہہ چکا ہوتا لیکن میں نے
اُس کے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو میری جگہ بہت ہے بیس بسوے تو وہ گھڑ دوڑ سے توبہ کرے
کرے اور فرض کیا کہ نہ بھی کرے تو میں زیادہ اصرار نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ شادی

ہوئے پیچھے میں اس پر زیادہ دباؤ ڈال سکوں گی اور اُس کو میرا کہنا ماننا پڑے گا۔ آزادی آپ نے مہر کا بھی فیصلہ کر لیا ہے؟ ہمارے یہاں تو اس کا بڑا جھگڑا ہوتا ہے اور اکثر مہر کی وجہ سے لگی ہوئی باتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ میری۔ ہم لوگوں میں مہر وہر کچھ نہیں ہوتا کیوں کہ مرد نہ تو عورت کو چھوڑ سکتا اور نہ اُس کے جیتے جی دوسرا نکاح کر سکتا۔ غرض اس طرح کے بہت سے تذکرے میری اور آزادی میں رہا کرتے تھے اور دونوں کا اختلاط بڑھتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میری نے بہت سے ناول[۱] آزادی کو سنائے۔ کئی بار بڑے بڑے البم[۲] لا لا کر لوگوں کی۔ عمارتوں کی۔ پہاڑوں کی۔ اور کاہے کاہے کی تصویریں دکھائیں جن میں بعض میری کی اپنی بھی کھینچی ہوئی تھیں۔ ایک دن وہ بڑا گٹھر مزدورنی کے سر پر لدوا کر لائی۔ اُس میں گلوبند۔ موزے۔ دستانے۔ میز پوش۔ غلاف۔ کنارے۔ زیر انداز اس قسم کی چیزیں تھیں۔ اس کے اپنے ہاتھ کی سی ہوئی۔ بنائی ہوئی۔ کاڑھی ہوئی۔ کبھی اُس کا جی چاہتا تو انگریزی باجا بجاتی۔ گاتی۔ زیادہ مزے میں آتی تو ناچتی بھی۔ ایسا تو کئی بار ہوا کہ اُس نے ہندوستانی کپڑے پہنے۔ گھڑیوں آئینہ دیکھا کی اور ایک ایک سے پوچھتی رہی کہ مجھے یہ کپڑے کچھ اوپری اوپری تو نہیں معلوم ہوتے۔ میری کے ساتھ اس طرح کا اختلاط ایسا کچھ بہت دنوں تک تو نہیں رہا۔ آزادی کے غسل صحت کے چوتھے ہی مہینے میری کا بیاہ ہو گیا۔ تیسرے پہر بیاہ ہوا شاموں شام ہنی مون[۳] کے لیے صاحب کے ساتھ پہاڑ کو روانہ ہو لی۔ مگر اتنے دنوں کے میل جول نے بھی آزادی کی ماہیت بدل دی۔ میری کے رہتے تو اُس نے کچھ ایسا خیال کیا نہیں۔ میری کی باتوں میں اُس کو کسی چیز کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی تھی میری گئی تو مدتوں اُس کی مفارقت کا ملال رہا ہمہ وقت میری کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور اُس کی باتیں یاد آتیں۔

---

[۱] قصے کی کتاب کو انگریزی میں ناول کہتے ہیں ۱۲ [۲] کتاب جس میں تصویریں لگی ہوں ۱۲ [۳] انگریزوں کا دستور ہے کہ شادی کے پہلے مہینے دو لہا دولہن کسی تفریح کی جگہ اکیلے جا کر رہتے ہیں اس کو انگریزی میں ہنی مون کہتے ہیں ۱۲

چوتھی فصل آزادی کے بیاہ کی چھیڑ چھاڑ اور اپنے بیاہ کے بارے میں اُس کے خیالات

اسی اثنا میں آزادی کی نسبت ناطے کے پیغام بھی آنے شروع ہوئے۔ جب کہیں سے رقعہ یا زبانی پیام آتا اور لوگ تو بے تکلف اُس میں گفتگو اور ردوکد کرتے مگر آزادی ایسی چُپ چاپ اور الگ تھلگ بیٹھی رہتی کہ گویا اُس کو کچھ سروکار ہی نہیں۔ پوچھنا اور صلاح لینا تو درکنار آزادی اگر لوگوں کی گفتگو کو دھیان لگا کر سنتی تو اُس کا اتنا سننا بھی داخلِ بے شرمی سمجھا جاتا تھا۔ بیبیاں لگیں کن انکھیوں سے اشارہ کرنے تو ماں نے بیٹی کو اُس کی دوا سے سمجھوایا کہ جب تمہارے بیاہ برات کا مذکور ہوا کرے تو تم ٹل جایا کرو یا ٹلنے کا موقع نہ ہو تو آنکھیں نیچی کر کے سر جھکا لیا کرو۔ عورتیں اس کی پرچول کرتی ہیں ایسا نہ ہو کوئی سمدھیانے میں جا لگائے اور دیکھو خبردار اپنی سہیلیوں میں بھی اس کی بڑی احتیاط کرنا ورنہ بعض شریر لڑکیاں آپ ہی تو کھود کھود کر پوچھتیں اور آپ ہی محلے میں ڈھنڈورا پیٹتی پڑی پھرتی ہیں۔ آزادی نے ماں کے کہنے اور دا کے سمجھانے پر عمل تو کیا مگر وہ دل ہی دل میں کہتی تھی کہ ایک عورت تو میری ہی جس نے اپنا میاں آپ ڈھونڈا اپنا بیاہ آپ کیا۔ اور اسی طرح کی ایک میں ہوں کہ بولنا تو بولنا سننے تک کی ممانعت ہے۔ کیا حقیقت میں یہ لوگ مجھ کو ایک اجنبی آدمی کے حوالے کر دیں گے جس کی صورت تک سے میں واقف نہیں؟ عادت اور مزاج کی کون کہے۔ ایسا غضب؟ اتنا اندھیر اگر میں نے اُس کو ناپسند کیا یا میری اُس کی مرضی نہ ملی تو میں تو جیتے جی مر لی؟ یہ سچ ہے کہ یہ لوگ مجھ سے زیادہ عقل رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے دنیا کے نشیب و فراز بہت دیکھے ہیں اور سچے دل سے میرے خیرخواہ ہیں (اولاد سے بڑھ کر بھی کسی کی مامتا ہو گی؟) اور بلاشک میرے لئے بہتر سے بہتر گھر تلاش کرنے میں ہرگز ہرگز کسی طرح کی کوتاہی نہیں کریں گے۔ مگر لاکھ ہو بھرنا تو مجھ کو پڑے گا۔ ماں باپ تو بیاہ کر فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ مہمان کھا پی گا بجا کر چلتے پھرتے نظر آئے کوئی کسی کی آنچ میں نہیں جلتا۔ میرا اکیلا دم ہو گا اور یہ پہاڑ زندگی اگر تقدیر بھلی ہے اور کسی اچھے سے پالا پڑا تو بیڑا پار ہے۔ ورنہ ایک ایک گھڑی دشوار ہے۔ میں تو ایک موٹی سی بات جانتی ہوں کہ اماں جان کو مٹھائی بہت بھاتی ہے اور یہ مٹھائی پھر کی گھر میں

دھری رہتی ہی میں کبھی بھول کر جھگڑتی تک نہیں۔ تو جس طرح کھلنے پہننے کی چیزوں میں میرا مذاق الگ
اُن کا الگ کون جانے اس بات میں بھی اُن کی رائے کچھ ہو اور میری کچھ۔ ان دونوں میاں بی بی
میں آئے دن بات بات پر رد و کد ہوتی ہی اور میں سنا کرتی ہوں۔ دونوں کے بیچ میں بول تو نہیں
سکتی مگر جہاں تک میں نے خیال کیا ہی ابا جان کی رائے اکثر درست اور معقول ہوتی ہے
اماں جان ناحق ضد کر کے اپنی بات کی پچ کرتی ہیں۔ اگرچہ ان میں بیچ بچاؤ کرانے کا مجھکو
منصب نہیں لیکن اتنا تو سمجھ میں آتا ہی کہ دونوں کے خیال ایک دوسرے سے اس قدر
مختلف ہیں کہ ایک کہتا ہی رات تو دوسرا کہتا ہی دن۔ اور یہی سبب ہی کہ ابا جان میرے
معاملے میں اوپری دل سے کچھ یوں ہی سا دخل دیتے ہیں وہ بھی جب کہ اماں جان زبردستی
اُن کے سر ہونے لگتی ہیں اُن کے بشرے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ وہ ان باتوں
کو پسند نہیں کرتے اور بہ مجبوری ہاں میں ہاں ملا دیا کرتے ہیں۔ اچھا تو فرض کرو کہ اماں جان
نے اپنے خیال اور اپنی مرضی کا داماد ڈھونڈا اور فرض کرنے کا کیا محل ہی یوں ہی ہوتا
ہوا دکھائی دے رہا ہی اور یوں ہی ہوگا ابا جان بچارے کی تو نہ چلی ہی اور نہ چلے
گی تو یہی کھٹ پٹ وہاں مجھ سے رہا کرے گی۔ یہ دونوں تو صبح کو لڑے شام کو من گئے
اور میرا مزاج ہی اور طرح کا مجھ کو تو کسی کی بات کی مطلق برداشت نہیں۔ کوئی میری ذری
سی بات بھی کاٹتا ہی تو بے اختیار میرا جی چاہتا ہی کہ اُس کو کاٹ کھاؤں۔ ایسے آدمی کے
ساتھ میرا تو ایک دن بھی گزر ہونا مشکل ہی۔ بے مزہ بیاہ سے تو کوارا بیٹھنا ہزار درجے بہتر
اچھا تو نرے سوچنے سے تو کچھ فائدہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنی جگہ سوچتی کی سوچتی ہی
رہوں اور یہ لوگ اپنی کر لی گزریں۔ کیا کروں کس سے کہوں میری سہیلیوں میں تو کوئی اس
قابل نہیں پیٹ کی ہلکیاں چھچھوری۔ ان سے کہنا تو سارے شہر میں اپنے تئیں رسوا کرنا ہی
دو استری ہیں بہتری۔ اس کو تو ڈھب سے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ اور پھر کسی سے کہوں
بھی تو وہ اپنے جی میں کیا خیال کرے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میں اُس کی نظروں سے گر
جاؤں گی۔ اتنے لوگوں میں ایک ہی شخص سمجھ میں آتا ہی کہ میں اُس سے اس بارے میں
کچھ کہوں اور وہ مجکو حقارت سے نہ دیکھے میری نسبت کسی طرح کی بدگمانی اُس کے ذہن

میں نہ آئے اور ساتھ ہی میری تائید بھی کرے یعنی میرا باپ لیکن ارادہ کرنا آسان ہے اور دُو
بدو کہنے کو چاہیئے ہمت۔ وہ مجھ کو چاہتے بھی بہت ہیں اور میں اُن کی خدمت میں کسی قدر
گستاخ بھی ہوں اور محبت کی وجہ سے اُن کو میری کوئی بات بُری بھی نہیں لگتی لیکن
آخر ہیں تو مرد اپنے ہی معاملے میں مونھ پھوڑ کر مجھ سے کیوں کر بات کی جائے گی ؟ نہیں
نہیں کتنا ہی دل کو مضبوط کروں اُن کے آگے ایک حرف بھی مجھ سے نہیں بولا جائے گا اُن
کو لکھ کر کیوں نہ دوں۔ تحریر میں اپنا مطلب بھی اچھی طرح آجائے گا اور کسی کو کانوں کان بھی
خبر نہ ہوگی۔ کہ میں نے کیا لکھا اُنھوں نے کیا پڑھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اُن کے بس کی بات
ہوتی تو وہ بے میرے کہے آپ کر لیتے۔ اور جب وہ کچھ کر نہیں سکتے تو اُن سے کہنا بیٹھے بٹھائے
اُن کو بے فائدہ رنج دینا ہے۔ اس سے کہ تیرا میرا سہارا ڈھونڈتی پھروں میں آپ ہی اپنی
اماں جان سے کیوں نہ کہوں ؟ کرنے والی تو وہ ہیں دوسرے (گو وہ ابا جان ہی کیوں نہ ہوں)
بہت کریں گے تو صلاح کے طور پر ایک بات ان کے کان میں ڈال دیں گے۔ اور یہ کتنی بڑی خوبی
ہے کہ ابا جان کی طرح مجھ پر ان کی ہیبت نہیں۔ اگر میں ابا جان کی خدمت میں گستاخ ہوں
تو اماں جان کے ساتھ بے تکلف۔ عورت وہ بھی عورت میں بھی۔ اُن سے ایسی شرم کرنے کی
بھی کوئی وجہ نہیں۔ سب منصوبے لغو ہیں بس یہی ٹھیک ہے کہ میں آپ ابھی اُٹھوں اور اماں جان سے
چل کر خود گفتگو کروں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیئے آزادی کو خیالی اُدھیڑ بن سے فرصت
ملی اور وہ موقع ڈھونڈ رہی تھی کہ ماں کو گھر کے کام دھندے سے فارغ پاؤں تو اپنی رام کہانی
سناؤں۔ اتنے میں پھر اس کو خیال آیا کہ میں نے اعتراض تو بہت سے سوچ رکھے ہیں لیکن
اگر وہ پوچھ بیٹھیں کہ آخر کرنا کیا چاہیئے تو میں کیا جواب دوں گی۔ وہ مہری کی بات تو مہری
کے ساتھ رہی اُن لوگوں میں پردے کا دستور نہیں۔ غیر مردوں سے ملنے بات چیت کرنے
کا عیب نہیں۔ ہم لوگ ٹھیرے پردہ دار ہم سے اُن کی ریس کیسے ہو سکتی ہے۔ پردے کی پابندی
کے ساتھ تو اتنا ہی ممکن ہے کہ اوپر والے چھان بین کر لیں سو کر رہے ہیں میں بہت کروں تو کسی
طرح چھپ چھپا کر دور سے جھانک دیکھ لوں وہ بھی شاید ؟ سو ابا جان بھائیوں کو ٹھیک سمجھایا
کرتے ہیں کہ صورت شکل ڈھلتی چھاؤں ہے یا چار دن کی مگر چاندنی۔ آدمی کا بڑا ہنر لیاقت ہے اور

اُنہی سے کام پڑتا ہے اور اُنہی کی پرستش ہے۔ تو میں جو اتنے کے واسطے انگشت نما ہوں مجھ سے
بڑھ کر بھی کوئی احمق ہوگا۔ رہیں دوسری باتیں عادت، مزاج وغیرہ برسوں ایک ساتھ
رہنے کا اتفاق ہو تب کہیں جا کر معلوم ہوں تو ہوں۔ شیخ سعدی نے بہت درست کہا ہے ؎

تواں شناخت بہ یک روز از شمائل مرد — کہ تا کجاش رسیداست پایگاہ علوم
ولے ز باطنش ایمن مباش و غرہ مشو — کہ خبث نفس نہ گردد بہ سالہا معلوم

پھر آدمی کے مزاج کا بھی کیا ٹھکانا ہے۔ لوگوں کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے اپنی آنکھوں سے
دیکھا ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ کسی سے نہ کچھ کہوں نہ سنوں۔ تقدیر پر شاکر ہو کر خاموش
بیٹھی رہوں جو کرے سو خدا۔ آخر انگریزنوں کے علاوہ دنیا میں لاکھوں کروڑوں عورتیں
ہیں اور اسی طرح پر بیاہی گئی ہیں شاذ و نادر کہیں کہیں کچھ نا اتفاقی بھی ہے۔ سو انگریزوں میں
بھی ہوتی ہے۔ خود میری نے ایسی کئی مثالیں بیان کی تھیں۔ اگر ہر جگہ ان بن رہا کرے
تو دنیا کا کام کیوں کر چلے۔ اور پھر جب ایک شخص کے ساتھ نباہ کرنا ٹھہرا تو اپنا مزاج اُس کی
مرضی کے مطابق بنا لینا کیا بڑی بات ہے۔ اور جو اپنے مزاج کے بدلنے پر قادر نہ ہو وہ دوسرے
کو کیوں اُلاہنا دے؟ اس طرح کی باتیں آپ ہی آپ سوچ سمجھ کر آزادی ماں کے پاس جاتی
جاتی رُک گئی۔ اور خوب ہوا کہ اُس تک نہ گئی ورنہ اُس کو ایسی باتوں کی ٹھٹی چڑھ۔ اس کو ایسا
ڈانٹتی کہ یاد ہی تو کرتی۔ جو عورت اپنی رائے پر ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو کہ ساری عمر سیاپا
کو سمجھاتے گذری اور اپنی مرغے کی وہی ایک ٹانگ وہ اس چار دن کی لڑکی کی بات کی کیا
وقعت کرتی کوئی ایسا ہی دن جاتا ہوگا کہ میاں سے اس کی تکرار نہ ہوتی ہو اور تکرار بس ایک
بات کی تھی کہ خواجہ آزاد ہر پہلو سے انگریزوں کی دانشمندی۔ ان کے حسن انتظام کی۔ ان کے
رسم و رواج کی۔ ان کے اخلاق کی۔ غرض ان کی سب باتوں کی یہاں تک کہ کھلم کھلا نہیں تو ایما
و در پردہ اشارتاً کنایتاً ان کے مذہب کی بھی مدح کیا کرتا تھا۔ اور ہادی بیگم تھی مولویوں کے
ایک بڑے نامی خاندان کی بیٹی۔ بھولے پن اور نرم دلی کی وجہ سے عورتوں کے عقاید مذہبی
یوں بھی بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ ہادی بیگم اس بارے میں عام عورتوں سے بھی کسی قدر
بڑھی ہوئی تھی۔ آزاد کی چھیڑ چھاڑ نے اس کو اور متعصب بنا دیا۔ وہ جو اعتراض یہاں سنتی

میکے میں جاکر ایک ایک کے چار چار جواب دندان شکن سیکھ آتی۔ اس نے میاں کی ضد پر انگریزی سوسائٹی کی ایسی روئی دھنکی کہ گویا مسٹریز آف لنڈن[1] اس کو ازبر تھی۔ وہ میری کے گھر میں آنے ہی کو کب پسند کرتی تھی مگر بیٹی نے ایسی بُری ٹانگ اڑائی تھی کہ اُس کو کچھ بن نہیں پڑتا تھا۔ اور میری کی وہ باتیں جن سے آزادی کا دل بگڑا ہادی بیگم کے فرشتوں کو بھی اُن کی خبر نہ تھی۔ لڑکیاں لڑکیاں آپس میں سر جوڑے ہوئے صلاحیں کیا کرتی تھیں۔ ہادی بیگم بوڑھی عورت کو کیا مناسب تھا کہ ان کی مشورتوں میں کھنڈت کرے تو اگر آزادی ماپاس جاکر میری کی سند پکڑ لی یا انگریزوں کی ایسی قلعی کھولتی کہ آزادی شاید ساری عمر میری کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ ہوتی مگر خدا کو میری کا پردہ رکھنا تھا۔ آزادی نے ماپاس جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ اگرچہ آزادی نے اُس وقت فیصلہ کر لیا کہ اپنے نسبت ناطے بیاہ برات کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا سننا فضول اور لاحاصل ہے اور یہ معاملہ ہی اس قسم کا ہے کہ چار و ناچار حوالہ تقدیر کرنا چاہیئے مگر کوئی سرسری بات ہو تو آدمی اس کے خیال کو دل سے دور بھی کرے۔ وہ طبیعت کو دوسری طرف مشغول کرنا چاہتی تھی مگر رہ رہ کر آپ ہی آپ اس کو سوچ پیدا ہوتا تھا کہ دیکھیئے میری قسمت میں کیسے آدمی کے پلّے بندھنا لکھا ہے۔ اے ہے اس تردد سے تو بہتر ہے کہ میرا بیاہ ہی نہ کریں۔ یہ کیوں میرے بیاہ کے پیچھے پڑے ہیں؟ میرا تقاضا ہے یا میں نے درخواست کی ہے؟ اس بات کے دل میں آتے ہی اُس نے اپنی معرفت والوں میں نظر ڈالی تو کوئی عورت ایسی نہ دکھائی دی جو کواری بیٹھی ہو پھر لگی اس کا سبب سوچنے کہ شاید بڑے ہو کر بیاہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہوگا لیکن خدا جانتا ہے میرے دل میں تو اس وقت تک اس کا خیال بھی نہیں آیا اور میں تو بیاہ کے نام سے گھبراتی ہوں اور جن کے بیاہ ہو گئے ہیں اُن کو بھی ایسا کہاں کا سکھ ہے۔ کم عقل لڑکیوں کو دلہن بننے اچھے کپڑے زیور۔ پھول اور چوڑیاں پہننے مہندی لگانے خوشبو ملنے کی شاید چند روز خوشی رہتی ہوگی اس کے بعد سے تو میں نے جس کو دیکھا دُکھڑا ہی روتے ہوئے دیکھا۔ میاں کی بدمزاجی۔ ساس نندوں کے طعنے۔ بچوں کا جننا، پالنا۔ گھر کی ٹہل۔

[1] انگریزی کی ایک کتاب ہے جس میں انگریزی سوسائٹی کے عیوب چن چن کر بھر دیئے ہیں۔ ۱۲

خانہ داری کے بکھیڑے ایک مصیبت ہو۔ میں نہیں جانتی عورتیں کیوں یہ آفت مول لیتی ہیں؟ ہو نہ ہو یہ کم بخت پیٹ سارے جتن کراتا ہو۔ عورتیں نکمی بے ہنر کچھ کمائی تو کر نہیں سکتیں مردوں کا سہارا نہ پکڑیں تو کھائیں پہنیں کہاں سے؟ ماباپ زیادہ دن تک بار اُٹھا نہیں سکتے بیٹیاں بیاہنے جوگی ہوئیں اور ماباپ نے اُن کو کسی نہ کسی کے سر منڈھا۔ لیکن خیر میں ایسی بے ہنر بھی نہیں محنت کروں گی تو گو دیدہ ریزی ہو کیا چار پانچ آنے روز کی بھی سلائی نہیں کر سکتی؟ بخوبی اور بافراغت لیکن پھر مزدوری کا نام مزدوری۔ تنگی ترشی سے گزر تو ہو جائے گی مگر بدنامی کتنی بڑی ہو۔ خواجہ آزاد کی بیٹی مولوی مقتدیٰ کی نواسی اور سلائی پر گزران! ہی ہی خدا نہ کرے کہ بڑوں کے نام کو بٹہ لگاؤں۔ یہ کیا بیہودہ خیال ہو؟ خدا کے فضل و کرم سے ددھیال ننھیال دونوں صاحب مقدور ہیں۔ کیا میرے اکیلے دم کے لیئے اتنا بھی نہیں کر سکیں گے کہ میں ان کے نام کے مطابق عزت لیئے بیٹھی رہوں؟ کریں گے اور ضرور کریں گے۔ لیکن کسی کے ماباپ سدا زندہ نہیں رہے۔ بھائی بھاوجوں کو میری ایسی کیا پڑی بھائی ابھی کچھ کماؤ نہیں ہیں کسی سے بولتی نہیں چالتی نہیں اس پر سے بھی بھاوجوں کا مزاج نہیں ملتا یہ تو مجھکو ایک دم بھی نہیں ٹکنے دیں گی۔ بھلا اماں جان سے اس کا ندکور تو کروں اور اُن کو ٹٹولوں تو سہی؟ اب میں تو کوئی ایسی بدلحاظی کی بات نہیں کہ میں بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔ ابھی تک میں اپنے ہی دل سے باتیں جوڑ رہی ہوں کہ یوں کہیں گی اور دوں کہیں گی۔ کیا معلوم کیا کہیں گی شاید گفتگو میں کوئی بات نکلے جس سے میرا تردد رفع ہو اور اماں جان کو ناگوار بھی نہ گذرے۔ یہ سچ ہو کہ کواری لڑکیاں اپنے بلکہ پرائے بیاہ برات کی باتوں میں بھی بُری یا بھلی کسی طرح کی بات مونہ سے نہیں نکالا کرتیں۔ لیکن میں تو ایسی شرم کو شرم نہیں سمجھتی۔ ایک آدمی چوری کرنے سے شرماتا ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ چوری بُری ہو اور وہ بھی چوری کو بُرا سمجھتا اور چھپاتا ہو اور اگر اُس کی شرم سچی ہو تو ایک نہ ایک دن چوری کو چھوڑے گا بھی ضرور۔ یہ کیسی شرم ہو کہ دنیا جہان میں بیاہ کا ڈھنڈورا پٹے۔ میکے اور سسرال میں مبارک باد کا غل مچے۔ لڑکی دلھن بننے سے خوش۔ لڑکا دولھا پکارے جانے سے راضی۔ آدمی کی دو آنکھیں ایک شرمائے دوسری فرمائے؟ اماں جان اگر ابّا جان کے ساتھ ہٹ دھرمی کرتی بھی ہیں تو اُن کو بات کی پچ آ پڑتی ہو ورنہ یوں اماں جان بڑی

معقول پسند آدمی ہیں۔ بے خطا بے قصور کیوں ناراض ہونے لگیں۔ بہت کریں گی مجکو آہستگی سے سمجھا دیں گی۔ غرض آزادی ایک بار پھر ماں باپ پاس جانے پر آمادہ ہوئی۔ اُن کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر بیٹھ گئی اور لگی دل میں غور کرنے کہ بات کا سلسلہ کس طرح پر شروع کروں۔ یہی نہ کہ تم میری منگنی کی بات چیت کر رہی ہو مجکو اپنا بیاہ کرنا منظور نہیں۔ یہ تو بات کاہے کو ہوئی کہ ایک پتھر سا مار دینا ٹھیرا؟ اور اگر سُن کر اُنہوں نے جھڑک دیا اور کہا کہ چل پرے ہٹ ؟ مونہ لگائی ڈومنی گائے آل پتال تجکو کس نے دخل دیا ہے جا اپنے ٹھکانے سے جا کر بیٹھ۔ تو یہ تو کچھ بھی نہ ہوئی؟ بڑی کی بُری بنی اور مطلب کا مطلب فوت ہوا۔ وہ تو کہیں ایسا اتفاق ہوتا کہ کوئی اس کا مذکور چلاتا میں بیٹھی سنتی اور موقع پا کر بول اُٹھتی۔ مگر ایسا اتفاق نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ پہلے سے اماں جان نے دداکے ہاتھ منع کروا بھیجا ہے کہ اس قسم کی بات چیت ہوتی ہو تو تم ٹل جایا کرو۔ بس اس کا تو فیصلہ ہے کہ یا تو کہنے سننے کا نام نہ لوں اور کہوں تو آپ کہوں اور تنہائی میں کہوں۔ اچھا تو ذرا اور سوچ لوں۔ کہوں بھی تو ایسے طور سے کہوں کہ بات خالی نہ جائے۔ جس وقت سے ایسے تصورات آزادی کے دل میں پیدا ہوئے ان کا سلسلہ ہی ختم ہونے پر نہیں آتا تھا آزادی اُکتا کر گھبرا کر بہتیرا طبیعت کو دوسری طرف مصروف کرنا چاہتی مگر ان خیالات نے اُس کے تمام حواس کو معطل کر دیا تھا اور جس طرح کسی کو جنون ہو۔ اور ایک بات کی زٹر لگ جائے چلتے پھرتے۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے اس کو اسی کی دھن تھی۔ وہ آپ ہی ایک منصوبہ بناتی آپ ہی بگاڑتی آپ ہی ایک رائے قائم کرتی آپ ہی اُس کو بدلتی۔ اس کا آخری خیال یہ تھا کہ بیاہ سے انکار کرنا تو ٹھیک نہیں۔ یہ سمجھنا کہ لوگ روٹی کپڑے کے لیئے بیٹیوں کو بیاہتے ہیں صریح غلط ہے۔ ورنہ جتنے صاحبِ مقدور ہیں بیٹیوں کو بٹھا رکھا کریں۔ میرے لیئے معاش کا معقول بندوبست بھی بآسانی ہو سکتا ہے لیکن بڑی مشکل ناموس کی ہے جس کے آگے شریف لوگ جان اور مال کسی کی بھی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے اور بیاہ کے سوائے ناموس کی حفاظت اور کسی تدبیر سے ہو نہیں سکتی۔ پس بالکل نامناسب ہے کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے ایسی نالایق بات مونہ سے نکالوں۔ ایسا خیال ہی میرے دل میں کیوں آیا ہو گا؟ یہی تو میری نادانی اور ناتجربہ کاری کی دلیل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آزادی کے دل میں بہتیرے ہی ولولے اُٹھے مگر انجام کار سب فرو

ہوہو گئے اور تن تبقدیر چپ چاپ بیٹھی تماشا دیکھتی رہی نہ کچھ کیا اور نہ کچھ کرتے بن پڑا۔ باپ کا حال بھی بیٹی ہی کے قریب قریب تھا کہ وہ لادو۔ یہ بنوادو۔ اس کے سوائے اُس کو بھی کچھ دخل نہ تھا اور دخل ہو تو کیوں کر ہو۔ وہ جو چاہتا تھا بیٹی اٹھارہ برس کی بیاہی جائے ناممکن اس کی مرضی تھی کہ بیٹی بے تکلف اپنی رائے ظاہر کرے۔ محال۔

پانچویں فصل۔ آزادی کو مولویوں میں بیاہنے کی تجویز اور مولویوں کے حالات

آزادی تو ہالا کی ذہین تھی ماں کے خیالات سے واقف اُس کے اختیارات سے آگاہ پہلے ہی تاڑ گئی تھی کہ جیسی آپ ہیں ویسا ابا جان کا ہونا چاہتی ہیں۔ انہیں میں کے فرق سے ایسا ہی داماد کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ نکالیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا خدا جھوٹ نہ بلوائے آزادی کے لیئے کوئی دس بارہ جگہ سے پیغام آئے ایک سے ایک بہتر ایک سے ایک عمدہ مگر ہادی بیگم جیسی روح ویسے فرشتے اپنے ڈھب کے ایک ملانے ہی پر گری۔ ہر چند زمانے کا رنگ دیکھ کر لوگوں نے کہا کہ ان مدرسے والوں میں سے کوئی چلتا ہوا سا دیکھ لو۔ اور کئی کے نام بھی لیئے کہ ان کا دو برس ہوئے انٹرنس پاس کر چکا ہے۔ ڈھمکا دس روپے وظیفہ پاتا ہے لیکن ہادی بیگم ذرا نہ پسیجی۔ وہ پکارے کہتی تھی مجھ سے تو آنکھوں دیکھتے مکھی نہیں نگلی جاتی؟ ساری عمر مجھ کو مدرسے کی آفت جھیلتے گزری۔ کیا میں آزادی کی سوتیلی ماں ہوں کہ آنکھیں میچ کر اس کو گڑھے میں ڈھکیل دوں؟ یہ سچ ہے کہ مدرسے والوں کو نوکری کی کمی نہیں اور میں اس سے بھی انکار نہیں کرتی کہ ہوشیار بھی ہوتے ہیں لیکن یہ بڑا سخت عیب ہے کہ عقیدے کے ٹھیک نہیں ہوتے۔ سو ایسی دنیا کو لے کر کیا بھاڑ میں ڈالنا ہے جس میں دین کا ضرر ہو۔ سدا سدا کو دنیا میں رہنا نہیں تھوڑے دن کی زندگی ہے بری طرح بھی کٹ جائے گی اور بھلی طرح بھی کٹ جائے گی۔ میں زندگی کی بڑی کام یابی اسی کو سمجھتی ہوں کہ انجام بخیر ہو اور وہاں چل کر خدا سے اچھی بنے۔ میں نے جس مشکل سے اپنے ایمان کو سنبھالا ہے بس خدا ہی کو خوب روشن ہے اور وہ بھی بچے کی امداد سے کہ جمعے جمعے کا وعظ ناغہ نہیں ہونے دیا۔ ذرا سا بھی خدشہ ہوا اُس کو جھٹ سے جا کر صاف کر لیا اور یہ تو کچی لکڑی ہے اور

کس باوا کی بیٹی ہے۔ یہ اگر کسی بد عقیدے کے پالے پڑ گئی جاتے ہی بے دین ہو جائے گی اور اُسی کا
کلمہ بھرنے لگے گی۔ میں اس کا وبال اپنے سر کیوں لینے لگی۔ اور جو گھر میں نے تلاش کیا ہے
خدا کے فضل سے کھاتا پیتا خوش حال ہے کہنے کو توکل کی گزران ہے مگر حیثیت نوکری والوں
سے کم نہیں بیبیوں پاس سونے کا زیور ہے کپڑا لتا بھی خاصہ تن زیب جو ہم پہنتے ہیں۔ ایک
چھوڑ دو دو مامائیں ہیں گھر کا چلن اچھا ہے۔ ماشاءاللہ کسی سمدھیانے میں کوئی شاکی
نہیں۔ لڑکا خدا اُس کی عمر میں برکت دے ہمارے سارے میکے والے کہتے ہیں۔ جوان صالح
ہے۔ ضروری کتابیں پڑھ چکا ہے۔ تھوڑے دن سے باپ نے وعظ پر لگایا ہے۔ سننے والے بیان
کی تعریف کرتے تھے۔ تو صاحب میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھ کر ہاں بھری ہے آگے اس کی تقدیر۔
آزادی مولویوں میں اپنی منگنی سُن کر کچھ اُداس سی ہو گئی تھی وہ بھی مولویوں کے گھر اپنے
کی اور ددھیال میں تو نہیں مگر ننھیال میں ابھی تک مولویت ہی کا پیشہ تھا بھی۔ کہ کسی کے
نوکر نہیں چاکر نہیں طالب علموں کو پڑھا دیا وعظ کہہ لیا۔ فتویٰ لکھ دیا۔ امامت کر دی۔ اللہ
اللہ خیر صلاح۔ دنیا دار لوگ گھر بیٹھے خدمت کرتے اور سعادت سمجھتے۔ خرچ سے معلوم ہوتا
تھا کہ دو چار جگہ سے تنخواہ کے طور پر بھی ضرور کچھ مقرر ہے۔ مگر مولوی اس کا پتہ چلنے نہیں دیتے
تھے بہر کیف گزر کا یہ رنگ تھا کہ ظاہر خراب باطن آباد۔ وہ وہ کھانے جو ہم غریبوں کو اور ہم بیچارے
تو بھلا کس گنتی میں ہیں اچھے اچھے امیروں کو بھی کبھی کبھار نصیب ہوتے ہیں خدا مولویوں
کو بے زحمت بے مشقت نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری دونوں وقت مفت کھلاتا ہے۔ مولوی لوگ
دنوں کی نحوست کو نہیں مانتے اور حقیقت میں بات ہے بھی بے اصل سب دن خدا کے۔ مگر ہم دیکھتے
ہیں مہینے میں زیادہ نہیں دو چار دن مولویوں پر بھی نحوست کے گزر جاتے ہیں۔ وہ کون؟ جن
دنوں چولھے میں آگ سلگانی پڑے۔ کیا کہیں شروع میں ایسی غلطی ہوئی کہ ساری عمر اس کا پچھتاوا
رہے گا نوکری پیشہ لوگوں کا ظاہر دیکھا خوش حال دھوکے میں آ گئے اور سمجھے کہ اس سے بہتر معاش
کا کوئی ذریعہ نہیں۔ نوکری کی اور خدا کا شکر ہے عزت کی۔ حکومت کی۔ بڑی تنخواہ کی لیکن پھر جو
مولویوں کی حالت سے مقابلہ کر کے دیکھا تو اُن ہی کا پلہ بھاری۔ اول تو نوکری بڑی ہو یا چھوٹی پرائی
تابعداری جس کا دوسرا نام ہے غلامی۔ بس ایک غلامی میں بے عزتی۔ ابنائے جنس کی خوشامد۔ رضا جوئی

لتّو پتّو۔ ہر وقت کی کوفت محنت اور ڈر سب ہی باتیں آگئیں۔ دوسرے پردیس کہ سو نوکری پیشیوں میں ننانوے باہر ہیں تو شاید تقدیر کا سکندر ایک وطن میں ہم سے پہلے مولوی کہ جن کے نوکر ہیں یعنی جن سے رزق پاتے ہیں اُلٹے وہی اُن کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں، ہم سے اگر کسی انگریز نے شیک ہینڈ[1] کر لیا تو سمجھے کہ خلعت سرفرازی بخش دیا۔ اور معتقدین ہیں کہ مولویوں کے پاؤں چومتے ہیں۔ مولوی شاہ اسحاق کی نسبت ایک صاحب ناقل تھے کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر جامع مسجد کے مکبّر کے پاس آکر بیٹھتے۔ لوگ مصافحے کے لیئے ہجوم کرتے اور ایسی دھکا پیل ہوتی کہ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تو مولوی صاحب کا خادم عصا پر اُن کا رِدا لٹکا کر چاروں طرف گھماتا اور جو لوگ مصافحے کے لیئے نہیں پہنچ سکتے تھے ردا کو آنکھوں سے لگاتے۔ یہ صورت تو دیکھنے میں نہیں آئی مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے قریب قریب مولویوں کی تعظیم و تکریم اب بھی ہوتی ہے ؎

زاہدا اپنی اپنی قسمت ہے تجکو طوبیٰ وہم کو قامت یار

رہا پردیس۔ مولویوں نے نماز سفر کے مسئلے کتابوں میں ضرور دیکھے ہوں گے مگر پوچھو تو کسی کو تمام عمر نماز سفر پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے؟ کبھی نہیں۔ اور یہ جو گھٹکے مولوی گاؤں گاؤں دورے کرتے پڑے پھرتے ہیں اُن کا بھی کیا حال ہے کہ شہر میں تو اُن کی دال گلتی نہیں۔ اُردو کے دو چار رسالے دیکھ لیئے چند مسائل جائیں یاد ہو گئیں گنواروں کے پھسلانے کو بہت ہے جس گاؤں میں پہنچے بہتر سے بہتر مکان یعنی خانہ خدا میں جا کر اُترے۔ گاؤں میں خبر ہوئی۔ ان بیچاروں کو جوار باجرے کی روٹی اور دال ساگ کے سوائے کچھ میسر نہیں۔ مگر مولوی صاحب کے لیئے جورو کی نتھنی بکے تو بکے اور پانی پینے کی لٹیا گروی ہو تو ہو ایک چوزہ صبح ایک چوزہ شام گیہوں کی چپاتیاں۔ دودھ جتنا پیا جائے گھی جس قدر ہضم کر سکو۔ موسمی چیزوں کی جیسے بونٹ[2] ہوئے رساول ہوئی کچھ کمی نہیں پیئے دودھ اور کھائے مال۔ گاؤں کی تازی شفاف ہوا ستھرا ہاضم پانی بے فکری اور گاؤں والوں کی آؤ بھگت۔ مولوی صاحب کا ماشاءاللہ وہ رنگ و روغن نکلا کہ لوٹ کر آئے تو گھر کی بی بی نے پہچان تو لیا مگر ذری دیر کے بعد۔ اور ایک دورہ لعنت بر پیچ ہمارا ہے کہ کُہر برس رہا ہے جاڑے کے مارے لحاف سے مونہ باہر نکالنے کو جی نہیں

---

[1] انگریزی میں مصافحہ کو کہتے ہیں ۱۲ [2] کچے دانہ دار چنوں کے درخت ۱۲

چاہتا مگر ڈبل کوچ سر پر سوار ہے۔ پندرہ میل سے سفر کم کرو تو بھنہ سوخت۔ راہ میں سوانے[1] کے
تین مقدمے فیصل کرنے ہیں۔ دوران زیادہ دن کا ہو گیا ہے۔ ہر سہ ماہی میں وجہ تعویق گھڑنی
پڑتی ہے۔ اور صاحب کلکٹر کے روبکار پر روبکار چلے آتے ہیں۔ مجبور دو بسکٹ کھا اوپر سے
چائے کی پیالی پی لرزتے کانپتے سوار ہوئے۔ سمجھتے تھے کہ کھانے کو تا وقت تو ضرور ہو گا
مگر خیر دو بجتے بجتے خیمے میں جا داخل ہوں گے۔ یہاں پہلے ہی مقدمے میں دوپہر ہو گئی۔ ڈرایا
بھی دھمکایا بھی مگر زمیندار کم بخت چپے چپے زمین پر جان دیتے ہیں مختاروں سے کہا
تم الگ لے جا کر سمجھاؤ۔ مختار۔ بہت خوب۔ جیسا ارشاد حضور کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ہمارا فریق
تو راضی ہے فریق ثانی ناحق کی ضد کر رہے ہیں۔ حضور ذرا تامل کریں میں اپنے لوگوں سے ابھی
راضی نامہ لکھوا کر لاتا ہوں۔ یہاں تو یہ کہہ کر گیا اور الگ جا کر خدا جانے ظالم نے کیا پٹی پڑھائی
کہ اسی کا فریق ہتے سے اکھڑا ہوا تھا۔ روح پر اس قدر صدمہ ہوتا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا
ہو ذی واقعات کا انکار کر رہے ہیں غصہ آتا ہے اور ضبط کرنا پڑتا ہے مجھی سے غلطی ہوئی حاکمانہ
فیصلہ کر دیتا تو ہرگز اتنی دیر نہ لگتی۔ میں نے چاہا رضامندی سے فیصلہ کرنا کہ اپیل نہ کر سکیں غرض
ایک ہی مقدمے میں سارا دن ڈھل گیا۔ ٹھیک دوپہر کو لوگ ذرا کی ذرا دم لینے چبینا کرنے اور
پانی پینے کو ٹھیرے میں بھی ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا بھی کہ حضور
کے لائق تو اس وقت کوئی چیز میسر نہیں آ سکتی اگر حکم ہو دودھ حاضر کریں میں نے سوچا کہ قیمت یہ
لیں گے نہیں اور مفت کا دودھ پی لوں گا تو چھٹی تک کا دودھ اگلنا پڑے گا۔ انکار کر دیا۔ اب میں
ان سے کیوں کر کہتا کہ مارے بھوک کے مجھ سے کھڑا ہوا نہیں جاتا اور میری آنکھوں کے آگے
ترمرے سے چلے آتے ہیں دور کی جھنڈی نہیں سوجھتی۔ سارے دن کی محنت سے تھک کر چور ہو گیا
تھا مگر جی میں خوش تھا کہ بڑا پیچیدہ اور جھگڑے کا مقدمہ طے ہوا اب مقام پر مڑے ہیں تان کر
سوؤں گا گاؤں کے قریب پہنچ کر جھٹپٹا سا ہو چلا تھا۔ دیکھتا ہوں تو لب سڑک جو میں نے جگہ بتا دی
تھی خیمے کا پتہ نہیں۔ الٰہی عملے۔ خلاصی، بہرے، نوکر یہ سب کہاں غارت ہو گئے۔ کہیں گاؤں
تو نہیں بھولے؟ نظر اٹھا کر دیکھا تو دھندلے میں کوئی آدمی نہ دکھائی دیا جس سے پوچھوں
بستی کی طرف مڑا۔ گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سن کر کتوں نے آگھیرا۔ گھوڑا سارے دن کا تھکا ہوا

[1] گاؤں کی سرحد کو سوانہ کہتے ہیں۔ ۱۲

ونے کا وقت گنتوں کا نرغہ لگا الف ہونے۔ آخر اُترے پڑا گاؤں میں جاکر دیکھا تو سناٹا۔ بارے
بڑی دیر میں ایک چوکیدار نکلا اُس نے بتایا کہ سوانے والی لٹھیا میں کوئی ایک کوس کے فاصلے
پر لشکر ٹھیرا ہے۔ یہ کوس بھر کی مسافت بجائے خود ایک منزل تھی۔ جگہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہنوز
ڈیرہ نہیں کھڑا ہوا۔ سنتے کے ساتھ جی ہی تو بیٹھ گیا۔ زمیندار۔ بنیئے بقال۔ سب لشکر کی آمد
سن کر بھاگ کھڑے ہوئے گاؤں میں چڑیا تک باقی نہیں۔ لکڑی۔ گھاس۔ آٹا۔ دال۔ کسی کو
کوئی چیز نہیں ملی۔ جانور کھڑے ٹاپ رہے ہیں۔ اور آدمی سکڑے ہوئے بیٹھے تاپ رہے ہیں
لوگوں نے اپنا کچھ بندوبست کر کرا لیا ہوگا۔ میرے آدمیوں نے ساری عمر میں یہ ایک نمک
حلالی تو ضرور کی کہ تھوڑے سے چاول لگا، گھٹنے جلدی سے خشکہ اُبال لیا۔ تڑاقے کی بھوک
میں وہ پھیکا خشکہ ایسا مزے کا لگا آج تک مجھکو ایسا لذیذ کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا
غرض میں تو دونوں شکم بھر کر ایک درخت کے نیچے ایسا بے خبر ہو کر گرا جیسے کسی کو سانپ
سونگھ جاتا ہے لیکن ابھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ گندہ بہار کے تھے دن یکایک سنا کو ابر
آیا اولے گرے اور اس زور کا مینہ برسا کہ باغ میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہوگیا۔ صبح ہوتے
بھرا بھر وقت گاؤں میں جاکر پناہ لی جہاں جس کے سینگ سمائے گھس پڑا۔ لوگوں نے میرے لیے
مسجد تجویز کی اور فی الواقع سارے گاؤں بھر میں اس سے بہتر کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ مولوی صاحب
جن کا میں نے اوپر ذکر کیا اُن کو میں نے اسی مسجد میں دیکھا میرے تو دانت سے دانت بج رہے
تھے اور مولوی صاحب ہیں کہ حجرے میں الاؤ روشن ہے مزے سے اکہرا کرتہ ڈانٹے ہوئے بیٹھے
ہیں ہاں صاحب یہاں تک جوڑوں کی گرمی نہ ہوگی۔ مولویوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بے اختیار
شیخ ابراہیم ذوق کی رباعی یاد آیا کرتی ہے **قطعہ**

نذر دیں نفس کش کو دنیادار — کیا مرے حق کی بے نیازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق — مال موذی نصیب غازی ہے

خبر نہیں خواجہ آزاد کو مولویوں کی حالت پر رشک تھا یا اُس نے جو تعلیم پائی تھی اُس کا اثر تھا
مگر اس میں شک نہیں کہ وہ مولویوں کی طرف سے بہت ہی بدگمان رہا کرتا تھا۔ اور اسی کی دونوں
میاں بی بی میں لڑائی تھی۔ اس کی ناموافقت۔ اسی کا جھگڑا۔ اسی کا بگاڑ خواجہ آزاد

لہ چھوٹا سا باغ

چوں کرنے کی کہتا تھا۔ ہادی بیگم آگ ہو ہو جاتی تھی اور یہ خواجہ آزاد کی بے تدبیری بھی تھی
مولویوں کی بیٹی پوتی - نواسی۔ مولویوں کو بُرا کہنے کی اُس کی چڑ ٹھیرائی جائے تو کہاں
تک اُس کو بُرا نہ لگے نتیجہ یہ تھا کہ جس قدر خواجہ آزاد چھیڑتا اُسی قدر ہادی بیگم کی ضد بڑھتی جاتی
ہادی بیگم کو تو اپنے میکے والوں کے توکل پر بڑا ناز تھا۔ خواجہ آزاد اس کے چڑانے اور
چھیڑنے کو کہتا بھیک کہو بھیک جس کو تم توکل سے تعبیر کرتی ہو میرے نزدیک وہ بھیک سے بھی
بدتر ہے۔ فقیر اگر بھیک مانگتا ہے تو شاید وہ اپاہج ہے۔ معذور ہے تو۔ اس نے اپنے چپّے کو مار لیا ہے
دروازے دروازے پھرتا ہے کہیں دھکے کھاتا ہے کہیں گھُرکی سنتا اور کہیں سے ٹکڑا بھی ملتا
یہ اچھے چنگے۔ ہٹے کٹے۔ موٹے تازے۔ اندھے نہیں۔ لولے نہیں۔ لنگڑے نہیں اُن کو
دوسروں کی کمائی کھانے کا کیا حق ہے؟ اور پھر اس ہیکڑی اور سرزوری سے کہ منہ لگا
مخادیم بنے ہوئے بیٹھے رہیں؟ ہادی بیگم۔ تم بھی تو اپاہج نہیں ہو تم کاہے کی تنخواہ پاتے
ہو؟ آزاد۔ میں کام کرتا ہوں تنخواہ کے معاوضے میں اپنا وقت دیتا ہوں۔ ہادی مولوی
بھی کام کرتے ہیں۔ وعظ کہتے ہیں طالب العلموں کو پڑھاتے ہیں۔ لوگوں کو مسئلے مسائل
بتاتے ہیں۔ کیا ان باتوں میں ان کا وقت صرف نہیں ہوتا؟ آزاد۔ تو لوگ ثواب سمجھ کر
مولویوں کی خدمت نہ کرتے۔ ہم جو کسی کو مزدوری دیتے ہیں ہرگز ثواب کی توقع نہیں
رکھتے۔ حق دار کو اس کا حق دینے میں کاہے کا ثواب؟ ہادی۔ تو اس بات کا کہ ہمارا روپیہ نیک کام
میں صرف ہوا۔ مولوی معاش سے بے فکر ہوں گے تو لوگوں کو ہدایت کریں گے۔ آزاد وہی
ایک ثواب ہے کہ مولوی الگ اس کے دعوی دار ہیں اور مولویوں کے خدمت گزار الگ اس کے امیدوار۔ ہادی
کیا خدا کے یہاں کسی چیز کی کمی ہے وہ بڑا کریم ہے اُس کو اختیار ہے ایک عبادت پر جس کو جتنا چاہے ثواب
بخش دے۔ تو تم کیوں دیکھنے لگے تھے اور دیکھا ہوگا تو یاد کیوں رہنے لگا تھا۔ حدیث شریف میں آیا
ہے لفظوں کی کمی بیشی کو خدا معاف کرے کہ پیغمبر صاحب نے یہود اور نصاریٰ اور اپنی امت کی مثال
بیان فرمائی کہ ایک شخص نے صبح سے دوپہر تک چند مزدوروں سے مزدوری ٹھہرا کر کام لیا اور دوپہر
بجتے ہی اُن کی مزدوری پوری پوری چکا دی۔ چار گھڑی دن رہے سے شام تک اور مزدوروں
سے دگنی مزدوری پر کام لیا اور دن چھپے اُن کو دوہری مزدوری دی۔ تو کیا جن مزدوروں نے

پہلے کلام کیا شکایت کر سکتے ہیں کہ ہم کو مزدوری کم لی؟ ہرگز نہیں - یہ مثال اس لئے بیان فرمائی
تھی کہ ہمارے پیغمبر صاحب کی امت کی عمر تھوڑی عبادت کم اور ثواب زیادہ - خواجہ آزاد - اس حدیث
کو مطلب سے کچھ بھی مناسبت نہیں - اگر خدا اپنا ثواب ایسی بے احتیاطی سے لٹانا چاہتا ہے جیسے ہندوستانی
رئیس اپنی دولت کو تو بے شک اس کا ہاتھ نہیں پکڑا جا سکتا لیکن میں اس وقت اس میں بحث نہیں
کرتا میں کہتا ہوں کہ مولوی اور جو لوگ مولویوں کی خدمت کرتے ہیں تمہارے عندیے میں تو دونو
ثواب کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک اسلام کا ضعف مسلمانوں کی تباہی زحمت حالی مفلسی -
دون ہمتی - نالیاقتی - سب کا وبال مولویوں کی گردن پر ہے - خدا نے انگریزوں کو وقت کا حاکم
بنایا استحقاق - اور ہم پر ان کو مسلط کر دیا بزور عقل - تم تو حدیث سے سند پکڑتی ہو اور میں
قرآن سے استشہاد کرتا ہوں - وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ[1]
کیوں یہ قرآن کی آیت ہو یا نہیں؟ اچھا اپنے میکے میں جا کر تحقیق کر لینا کہ مفسروں نے صالحون
کے معنے لکھے ہیں جن کو ملک داری کی صلاحیت ہو - ہم کسی بات میں انگریزوں کے مدمقابل
نہیں ہو سکتے - نہ بہادری ہے نہ محنت ہے - نہ جفاکشی ہے - نہ لیاقت ہے - نہ ہوشیاری
ہے اور اگر ہم میں یہ مادہ ہوتا تو انگریز پانچ ہزار کوس سے ہندوستان میں آ کر عمل داری ہی
کیوں کرنے پاتے؟ پس ہم رعیت ہو گئے - اور یہی لیل و نہار ہے تو زبردست کا ٹھینگا سر پر - اب سے
سیکڑوں برس تک رعیت بن کر رہنا پڑے گا - ان سے روٹھنے اور بگڑنے میں ہماری خیر نہیں -
دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر؟ لیکن مولویوں کی عقل پر کچھ ایسے پتھر پڑے ہیں کہ اتنی موٹی بات
بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتی یہ ہدایہ اور درمختار کیا خاک سمجھتے ہوں گے؟ اپنی غرض کے لئے
گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے - اور انگریز تو اہل کتاب ہیں خدا نے کئی جگہ قرآن میں اُن کی مدح
کی ہے - موتہ سے لو تو کہاں کی ہے؟ اور اہل کتاب ہونے سے قطع نظر ان کی عمل داری میں امن
اور آرام اور انصاف اور رعایا پروری اس قدر ہے کہ ہندوستان کو ایسا اطمینان کبھی
نصیب ہوا نہیں - مولویوں نے کفر کو مولیوں اور گاجروں سے زیادہ سستا کر رکھا ہے
اور بات بات پر لوگوں کو کافر اور مشرک ٹھہرا دیتے ہیں مگر یہاں چون کہ اپنا قدم درمیان میں ہے

(۱) اور ہم زبور میں (پند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین (کی سلطنت) کے وارث ہوں گے ۱۲

[1]مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ۔ پر کبھی بھول کر بھی نظر نہیں کرتے۔ حال آنکہ انگریزی عملداری کی
قدر نہ کرنا صریح کفرانِ نعمتِ الٰہی ہے۔ ہادی بیگم تم کیوں مولویوں کے پیچھے پڑے ہو ان بچاروں
نے تمہارا کیا لیا ہے۔ یہ غریب کسی کے لینے میں نہیں۔ دینے میں نہیں۔ ان کے پاس لاؤ
لشکر نہیں؟ مسجدوں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ کوئی پڑھنے آیا اس کو پڑھا دیا کسی نے
مسئلہ پوچھا بتا دیا یا جو وعظ کہتا ہے اُس نے دو چار مسلمانوں کو جنہیں دین کا خیال ہے اور جو اُن
کے پاس آ بیٹھے نماز روزے کی باتیں سکھا دیں۔ اس کے سوائے مولوی کچھ اور بھی کرتے
ہیں؟ تم کو خدا واسطے کی عداوت اُن کے ساتھ آ پڑی ہے۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ سارے
بھرے مولویوں پر۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ خیال تو کرو۔ کتنے آدمی مولویوں
کی طرف رجوع کرتے ہیں؟ سو میں مشکل سے ایک۔ اور مولویوں کی طرف کثرت سے
رجوع ہونے کا کوئی سبب بھی تو نہیں۔ مولوی تو یہی کہیں گے کہ نماز پڑھو۔ رمضان کے
روزے رکھو۔ جن کو مقدور ہو زکوٰۃ دو حج کرو۔ نشہ نہ پیو۔ میلے ٹھیلے میں نہ جاؤ۔ ناچ تماشہ
نہ دیکھو۔ اجنبی عورت پر بُری نظر نہ ڈالو۔ چوری نہ کرو۔ جھوٹ نہ بولو۔ لڑو جھگڑو نہیں۔ کسی
کو ستاؤ نہیں۔ سازگاری اور ملنساری سے زندگی بسر کرو۔ قسم نہ کھاؤ۔ کسی کو اُس کے پیچھے
بُرا نہ کہو۔ چھوٹوں پر مہربانی اور بڑوں کا ادب ملحوظ رکھو۔ مال جو خدا نے تم کو دیا ہے اُس کو
ضائع نہ ہونے دو۔ ہمہ وقت مرنے اور خدائے تعالیٰ کے روبرو چل کر اپنے اعمال کی جواب دہی
کے لیے طیار رہو۔ کتنے آدمی ہیں جو ایسی باتوں کو رغبت سے سننا چاہیں گے۔ وہی سو میں
مشکل سے ایک۔ پس اگر واقع میں لوگوں کو مولوی بگاڑتے ہیں تو ایک سے صبر کرو۔ ننانوے
کی درستی کا تم ٹھیکہ لو۔ کیا اُلٹی سمجھ ہے مولویوں پر لوگوں کے بگاڑنے کا الزام۔ لوگ بگڑے اپنی
بے دینی سے۔ خدا رسول کی نافرمانی سے۔ لوگوں میں وہ اگلی سی بھلائی نہیں۔ خوش معاملگی
نہیں۔ حلال کی کمائی نہیں ویسی ہی برکت نہیں۔ آج کو اسلام کی عملداری ہوتی تو لوگوں
میں اس قدر بے دینی کیوں پھیلنے پاتی؟ جس کے جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے کوئی اُس کا روکنے
منع کرنے والا نہیں۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ مولویوں کی کون سنتا ہے؟ اور تم نے

---

[1] جو آدمی کا شکر گزار نہ ہو وہ خدا کا شکر گزار نہیں ۱۲

ایسی گھڑی کا مولویوں کو ہونا شروع کیا ہی کہ اب ہیں بھی کہاں؟ غدر کے پہلے تک یہ حال تھا کہ مدرسے اور خانقاہیں تو رہیں الگ۔ کوئی مسجد مولوی سے خالی نہ تھی۔ اور مولوی بھی نام کے مولوی نہیں۔ ایسے ایسے جید کہ سارا ہندوستان اُن کا لوہا مانتا۔ عرب تک اُن کے فتوے چلتے۔ اور پھر قدر بھی ایسی تھی کہ بادشاہ تک اُن کے گھر آتے بہتیرا ہی اکبر شاہ نے مولوی اسمعیل کو واعظ کے لیئے بلوایا۔ مولوی صاحب نے صاف کہدیا کہ حرموں اور خواصوں کو طلاق دو تو آتا ہوں۔ اکبر شاہ مرتے مر گئے اور مولوی اسمعیل نے قلعہ کے اندر پاؤں نہ رکھا۔ پر نہ رکھا مشہور بات ہی کہ مولوی شاہ اسحاق صاحب نے ہجرت کی تو اُن کا کتب خانہ مال و متاع چار بیٹیوں کو ملا۔ ایک ایک بیٹی کے حصے میں ایک ایک لاکھ روپیہ آیا۔ یہ غدر کیا ہوا تھا مولویوں کے حصے کی قیامت تھی۔ بہتیرے مر کھپ گئے۔ بہتیرے جلا وطن ہو گئے خال خال بچے تو وہ سرکاریں جن کے گھر سے مولویوں کی پرورش ہوتی تھی۔ باقی نہ رہیں مولوی لگے دربدر بھیک مانگنے۔ اور حقیقت میں یہ جو تم دیکھتے ہو بھیک ہی مانگنا ہی۔ آخر معاش سے تنگ ہو کر مولویوں نے یہ پیشہ ہی چھوڑ دیا۔ شہر میں سیکڑوں آدمی اس طرح کے نکلیں گے جن کے بزرگ نامی گرامی مولوی تھے اور یہ لوگ الف کے نام بے بھی نہیں جانتے۔ اور جو ابھی تک مولویت کا پیشہ کرتے ہیں شاید کوئی بچا ہو تو بچا ہو ورنہ سب کے بچے کھلم کھلا نہیں تو چوری چھپے برابر انگریزی کا پڑھ رہے ہیں۔ بس مولویت کا تو یوں بھی خاتمہ ہی۔ یہ دو چار بڈھے ٹھڈے جو اپنی وضع کو نباہے چلے جاتے ہیں بس ان کی آنکھ بند۔ ہوئی اور مطلع صاف۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ غرض مولویوں پر تو ناحق کا الزام ہی قصور تو اپنا اور تھوپیں دوسروں پر۔ خواجہ آزاد۔ یہ سچ ہی کہ مولویوں کے دام میں بہت تھوڑی مچھلیاں پھنسی ہوئی دکھائی دیتی ہیں لیکن جس طرح ایک دیا سلائی سارے شہر کے جلانے کو کافی ہی۔ ایک مولوی ملک کے مسلمانوں پر اثر ڈال سکتا ہی سنتا ہی ایک اور اُس سے سیکھتے ہیں ہزار بہت سے لوگ ہیں جو ظاہر میں مولویوں کے ساتھ کسی طرح کا تعلق نہیں رکھتے وہ شاید سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے کہ مسجد میں جائیں مولوی صاحب کے مقتدی بنیں یا اُن کا وعظ سنیں وہ صرف نام کے مسلمان ہیں اس لیئے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے۔ نہ اُن کو دین تا ہی سے بحث۔ نہ خدا کے حکم کی پروا۔ نہ رسول کے فرمانے سے مطلب اُنہوں

نے زندگی کا ایسا طرز اختیار کر رکھا ہو کہ اُن میں اور عام حیوانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو لیکن باایں ہمہ یہ لوگ بھی مولویوں کی حکومت سے بری نہیں۔ ورنہ تم بتاؤ کہ یہ عام نفرت عام وحشت۔ عام اجنبیت جو مسلمانوں کو انگریزوں سے ہو اور جس نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا اور رہا سہا اور تباہ کر کے رہے گی اس کا ماخذ کیا ہو اور یہ بلا آئی تو کہاں سے آئی بے شک یہ خیال مولویوں سے پیدا ہو کر عام مسلمانوں میں پھیلا۔ ہندو کھلے بت پرست اور اُن سے ایسا میل جول کہ ہندو مسلمان چولی دامن کا ساتھ۔ اُن کے میلوں میں شریک۔ اُن کی رسموں کے پیرو۔ اور اہل کتاب سے اتنا پرہیز۔ ہادی بیگم۔ ایک جگہ کا رہنا سہنا بغیر ہیر پھیر بن نہیں پڑتی۔ خواجہ آزاد۔ جزاک اللہ۔ تو انگریزوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ ملاپ رکھنا ضرور ہو۔ ہندو اور ہم پڑوسی ٹپڑوسی ہیں اور انگریز اور ہم حاکم و محکوم۔ پڑوسی کی بے پڑوسی کے گزر بھی سکتی ہو محکوم کی بے حاکم ایک گھڑی نہیں گزر سکتی۔ ہادی بیگم۔ میل ملاپ بھی برابر والوں ہی میں ہو سکتا ہو۔ انگریز ہندوستانیوں کو کیوں مونہ لگانے لگے۔ آزاد۔ ہاں یہ بات بھی سچ ہو مگر میری مراد یہ ہو کہ ہم کو اپنی طرف سے بگاڑ نہیں رکھنا چاہیئے۔ ہادی بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہو؟ خواجہ آزاد۔ تم کہتی ہو کہ ہو سکتا ہو؟ ابھی یہی تو بڑا ابل آ کر پڑا ہو۔ مولویوں نے مذہب کا حیلہ بنا کر لوگوں کو کچھ ایسا ڈرایا ہو کہ اب بھی صاف دل سے نہ کوئی انگریزی پڑھتا ہو اور نہ انگریزوں کا علم سیکھتا۔ ہادی۔ کیوں ناحق ناروا مولویوں کا گناہ سمیٹتے ہو کیا مولوی لوگوں کے پیچھے دُرّہ لیئے پڑے پھرتے ہیں۔ تم حاکموں کے آگے بھی مولویوں کی ایسی ہی بدیاں روتے ہوگے۔ خواجہ آزاد۔ حاکم؟ میں تو خدا کے آگے ان کی شکایت کرنے کو موجود ہوں۔ ہادی۔ شنوائی بھی ضرور ہو گی۔ بھلا کس قسم کی شکایتیں؟ آزاد۔ ایک شکایت ہو تو بیان کروں درجنوں۔ کوڑیوں۔ اول نمبر تو وہی کہ اُن کو دوسروں کی کمائی کھانے کا کوئی حق نہیں۔ دوسرے یہ کہ اوروں کو زہد کی تعلیم کرتے اور آپ مُردے کی جانماز تک نہیں چھوڑتے۔ تیسرے آپ تو نکھٹو تھے سو تھے انھوں نے احدیوں کی ایک پلٹن کی پلٹن تیار کی یعنی اُن کے شاگرد جو سارے ملک کو لوٹ کر کھا گئے اور ڈکار تک نہ لی۔ چوتھے ریاکاری کہ لوگوں کو دکھانے کو تکلف بنک بنتے اور حقیقت میں جیسے ہیں سو معلوم۔ پانچویں۔ لوگوں کو

ٹھگنے اور دھوکہ دینے کے ایسے ایسے ڈھب یاد ہیں کہ بڑے شاطر چور کی بھی کیا اصل ہو مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کے نام سے چندے جمع کرتے اور بے دریغ اپنے خرچ میں لاتے گویا شہر یا در یا میراث پدر ہی۔ کلکتہ اور بمبئی اور ڈھاکہ اور پٹنہ اور حیدر آباد اور مدراس اور دور دور کے شہروں کے دھاوے مارتے کہ ہم نے دلی میں اسلامی مدرسہ جاری کیا ہو مسلمانوں کو چاہیئے کہ مدرسوں کی تنخواہوں طالب العلموں کے وظیفوں اور کتابوں کے لیئے جس سے جتنا ہوسکے اس کار خیر میں ضرور مدد کرے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین[سلہ] - لوگوں نے دیکھا ایک مقدس وضع آدمی کرتہ جبّہ پہنے سر پر عربی عمامہ باندھے۔ ماتھے پر گٹّا پڑا ہوا۔ بڑی ڈاڑھی۔ اونچا پائجامہ پھٹی جوتی۔ آنکھیں بیچ میچ اور گردن ہلا ہلا کر ایک مصرف خیر کے لیئے امداد چاہتا ہو اور دلی ہو بھی دار الاسلام اور وہاں کے مسلمان غدر کے بعد سے بے مقدور بھی ہو گئے ہیں اس مدرسے میں دینا عین خدا کی مٹھی میں سونپنا اور فردوس کا مول لینا ہو۔ دیا اور خوب جی کھول کر دیا اتنی دور کون تحقیق کرنے آتا ہو کہ مدرسے کا کہیں وجود بھی ہو یا نہیں اور ہو تو اس میں آدھی کا خرچ بھی ہو یا نہیں۔ جو کچھ ملا اتفاقاً وجنس مولوی صاحب نے لاگھر والی کے حوالے کر دیا کہ لے

بنگ بخت ۵ چو احمق درجہاں باقی ست مفلس کس نمی ماند + کھاؤ پہنو مگر اس طرح کہ کسی کی نظر نہ لگے۔ العین حق[سلہ]- اکثر لوگوں کا قاعدہ ہو کہ زکوٰۃ یا جاڑے کے دنوں میں لحاف توشک جو کچھ خدا کے نام دینا ہوا کھٹّا مولوی صاحب کی خدمت میں لا حاضر کیا کہ آپ جس جس کو مستحق سمجھیں بقدر مناسب پہونچا دیں۔ اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ مولوی صاحب کو بیواؤں اور یتیموں اور مسکینوں اور محتاجوں اور درماندوں اور مسافروں جیسا تو سب ہی کا آیا اور سب کے ساتھ اپنا اور اپنے خاندان کا بھی اب یہ خطائی الاجتہاد ہو کہ انہوں نے اپنے ہی تیئں زیادہ مستحق سمجھا۔ بدگمانی بُری ہوتی ہو۔ ان بعض الظن اثم[سلہ]- خاص کر عالم کی شان میں لیکن آج تک یہ عقدہ حل نہ ہوا کہ مولوی صاحب اس کثرت سے گاڑھے کی چاندنیاں کیوں بنوایا کرتے ہیں؟ بھلا خیر اپنا اپنا شوق ہو تو ہر ایک چاندنی میں ٹھیک لحافوں کے بیوت کے جوڑ

سلہ اللہ نیکی کرنے والوں کے عملوں کو اکارت نہیں جانے دیتا ۱۲ سلہ نظر کا لگنا حق بات ہو ۱۲ سلہ رائے کی غلطی ۱۲ سلہ بعض گمان داخل گناہ ہیں ۱۲

کیسے؟ مولوی صاحب کی نیت کے بارے میں تو جو چاہے کلام کرے۔ کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی لیکن تاویل کا تو یہ شخص بادشاہ ہے مسلم الثبوت۔ سوچ کر ایسا حیلہ شرعی منفر سے اُتارتا ہے کہ چاروں اماموں میں سے کسی کی گرفت میں نہیں آتا۔ باوجودے کہ اضعاف[1] نصاب کے مالک ہیں مگر صدقہ لینا جائز سمجھتے ہیں۔ ایک دن کوئی ہم جیسا بدعقیدہ بول پڑا کہ آپ تو غنی ہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا تو مجھے فقیر کہتا ہے۔ اللّٰہ الغنیّ وانتم الفقراء۔ انتم جمع مخاطب کی ضمیر ہے اور تم غنی بتاتے ہو۔ اب نہیں معلوم تم دونوں میں کون سچا ہے۔ پیغمبر صاحب کے تو یہ انتظام تھے کہ اپنی نسل پر زکوٰۃ کو حرام کر گئے تاکہ مولویوں کی طرح کاہل اور آرام طلب اور دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ مولوی صاحب کو یہ مشکل کہ سید بننا بھی ضرور۔ شرافت نسب بھی تو ایک ذریعۂ عزت ہے اور سامنے آئی ہوئی زکوٰۃ بھی نہیں چھوڑی جاتی۔ خدا دے اور بندہ لے۔ تم نے پہیلیاں بہت بوجھی ہوں گی شاید مشکل سے مشکل گورکھ دھندے بھی سلجھائے ہوں گے مگر جب جانیں ایسا کوئی راستہ نکالو کہ سیادت اور مولویت دونوں میں سے کسی پر حرف نہ آئے اور زکوٰۃ بھی نہ جانے پائے۔ خیر تم تو کیا بتاؤ گی ہم بھی بہتیرا سر مار چکے ہیں آخر ہار کر جھک مار کر مولوی صاحب ہی سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ایسے ایسے سیکڑوں چٹکلے ان کے ناخنوں میں بھرے پڑے ہیں ایک ادنیٰ سا حیلہ تو یہ ہے کہ کسی مستحق کو دے کر اس سے اپنے نام کسی بہانے سے ہبہ کرا لیا۔ لک[2] صدقۃ ولنا ہدیۃ۔ اسی طرح کا ایک حیلہ ہم نے ایک دوست کو کرتے ہوئے دیکھا۔ ہو نہ ہو کسی مولوی ہی سے سیکھا ہوگا۔ کیونکہ ہر ایک کا ذہن تو اس طرف کیوں منتقل ہونے لگا۔ چاندی کے خاصدان میں گلوریاں بھری ہیں۔ خاصدان میں سے گلوری نکالی اور ذری کی ذری تکیئے پر رکھ دی تکیئے پر سے اٹھا منہ میں۔ اے صاحب یہ کیا؟ تو کیا وید ے کی صفائی ہے کہتے ہیں کہ چاندی کا استعمال منع ہے ایسے بہانے ڈھونڈنے پر آؤ تو نہ کوئی امر امر ہے۔ نہ کوئی نہی نہی۔

خیر مولوی لوگ اپنے کمانے کے لیئے جو جو جتن کرتے ہیں چندیں شکل برائے اکل۔ وہ ان کے دل کا کھوٹ ہے مجکو تو ان کے اس حمق پر غصہ آتا ہے کہ جس درخت پر چڑھے ہوئے پھل توڑ رہے ہیں دشمن عقل اسی کی جڑ بھی کھوکھلی کیئے ڈالتے ہیں ہر مولوی اپنی شہرت کے لیئے ایک نہ ایک

[1] نصاب مال کی وہ مقدار جس پر زکوٰۃ دینی ہوتی ہے اور اضعاف نصاب یعنی دسی دسیوں گنی مقدار میں ۱۲ [2] تیرے لیئے خیرات اور ہمارے لیئے تحفہ ۱۲

بات ایسی ایجاد کرتا ہے جس کو سن کر مسلمان چونکتے ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئے نئے گروہ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ایسی بری طرح لڑتے ہیں کہ کافروں سے بھی ایسی بیہودگی اور ناشائستگی کے ساتھ لڑنا درست نہیں۔ زوال سلطنت نے اسلام کو ضعیف کر ہی دیا تھا مرتے کو مارے شاہ مدار یہ نادان دوست اس کو اور بھی نہیں پنپنے دیتے۔ خواجہ آزاد مولویوں کی طرف سے خدا جانے کب کا بھرا ہوا تھا کہ اس نے تو مولویوں کی شکایت کا ایک تار باندھ دیا۔ ہادی بیگم آخر کار دق ہو کر سامنے سے اٹھ گئی اور اگر اٹھتے نہیں تو آزاد گھنٹوں کی خبر لے۔ آزاد نے جالی کو روکا بھی کہ ذرا تو اور سنو ذرا تو اور سنو مگر ہادی بیگم یہ کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی کہ بس بہتیرا سن چکی۔ مولوی ورثۃ الانبیاء اور ان کا تو یہ تو بہ فضیحتا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں کوئی کوئی ان میں ایسے بھی ہوں گے۔ تم لگے سب کو ایک لکڑی ہانکنے لیکن اتنا میں پھر بھی کہوں گی۔ مکار ہیں تو اور فریبیئے ہیں تو۔ دین اسلام کا جو کچھ چرچا ہے ان ہی کے دم قدم سے ہے۔ تم جیسے مسلمان ہوں تو اذان تک کی آواز کان میں نہ پڑے۔

چھٹی فصل مولویوں اور مذہب کے بارے میں آزادی کی رائے

آزادی نے مونہ سے تو کبھی کوئی بات کہی نہیں جس سے معلوم ہوتا کہ ماں باپ کے اس اختلاف میں اس کی کیا رائے ہے مگر ہاں عمر کے لحاظ سے اور اب جو مولویوں میں اپنی منگنی سن کر وہ کچھ اداس سی ہوئی اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اگر باپ کی طرح مولویوں سے برگشتہ نہ تھی تو ماں جیسی لمبی چوڑی عقیدت بھی نہیں رکھتی تھی۔ لوگوں نے اس کی افسردگی کو اس پر محمول کیا کہ یہ معمولی طور کی لڑکی تو ہے نہیں کہ اس کو زیور اور کپڑوں کی خوشی ہو ماشاء اللہ بڑی سمجھ دار ہے کچھ نہ کچھ بیاہ کا سوچ کرتی ہوگی؟ آزادی کے خیالات اب دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح بے پوچھے میری منگنی کر دی۔ اسی طرح ایک دن بے پوچھے نکاح بھی پڑھا دیں گے۔ اور منگنی اور بیاہ میں ایسا فرق بھی کیا ہے؟ شریف لوگوں میں جیسا مونہ سے کہا ویسا نکاح پڑھا دیا۔ اچھا تو مجھے اب کیا کرنا چاہیئے؟ معاملہ نازک مقدمہ مشکل کسی سے صلاح لینے کا موقع نہیں وہ اکیلی بیٹھی ہوئی آپ ہی آپ دل ہی دل میں سوچتی کہ میری حالت میں کیا بڑا انقلاب ہونے والا

ہے۔ کیا اس کے لیئے مجھ کو کچھ بھی طیاری کرنی نہیں۔ ابھی تک تو میں نے میکے میں ایسی فراغت سے
زندگی بسر کی کہ میں نے نہیں جانا کہ کدھر صبح ہوتی ہے اور کدھر شام۔ مجکو نہ کھانے کا فکر نہ پہننے
کا تردد۔ پکّی پکائی کھالی اور سلا سلایا پہن لیا۔ لوگ جن میں رہی پرورش پائی بڑی ہوئی ہر وقت
سب کے سب میرا دل ہاتھوں میں لیئے رہے۔ امّاں جان کا یہ حال کہ ایک دم کے لیئے مجکو اپنی نظر سے
اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ ذری کی ذری ہمسائے میں جا کھڑی ہوتی ہوں تو تراہ تراہ مچ جاتی
ہے۔ ابّا جان نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا اور مجکو پکارا۔ بھائیوں میں کسی کو اتنی سہار
نہیں کہ میری آنکھ پر میل آئے۔ وہ تو کچھ ایسی ہی مجبوری ہے کہ ان لوگوں نے مجھ سے بچھڑنا
گوارا۔ مگر کیا۔ ابّا جان چپ ہیں۔ بھائی بھی اُداس معلوم ہوتے ہیں۔ اور امّاں جان تو میری
نظر بچا کر دو دو تین تین دفعہ رو بھی لیتی ہیں۔ میکے کے سے چلن تو نہ کسی کو نصیب ہوئے
ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ میں نے بھی بہتیری بیاہی لڑکیوں کو دیکھا جب میکے سے گئیں
روتی ہوئی۔ لیکن جب ایک حالت پیش آنے والی ہے اور ضرور پیش آکر رہے گی تو پہلے
سے طبیعت کو اُس کے لیئے آمادہ بلکہ اُس سے مانوس کر رکھنا میں جانتی ہوں ضرور مفید ہوگا
اب اُس نے اپنے طور پر بیاہی ہوئی عورتوں کے حالات کی تفتیش شروع کی اور کچھ سرسری نظر سے
کتابوں میں دیکھا تھا اُس کو بھی غور سے دُہرایا۔ تو معلوم ہوا کہ بیاہ سے بالکل ایک نئے طور کی زندگی
شروع ہوتی ہے۔ گویا ہندوؤں کے خیال کے مطابق وہ دوسرا جنم ہے۔ اگلے تعلقات دفعۃً نہیں تو
رفتہ رفتہ موقوف اور معدوم ہو کر آدمی کے پیچھے نئے تعلقات لگ جاتے ہیں۔ ماں بہنوں کی جگہ
ساس نندیں ہیں اور باپ بھائی کے بدلے سسر اور دیور۔ اور ایک شخص اور ہے جو کسی کے عوض نہیں آیا اس
سے ایک خاص طرح کا تعلق ہے اور وہی تمام جدید تعلقات کی اصل ہے بلکہ یوں کہو کہ اگلے پچھلے سارے
تعلقات رد ہو کر یہی ایک تعلق ہے جسے ساری عمر نباہنا ہے۔ یہی عورت کی تقدیر ہے اور یہی اُس کی
قسمت یہی اُس کے حق میں رحمت ہے اور یہی زحمت۔ اگر اس تعلق میں مزہ داری ہے تو دنیا کا عیش
ہے آرام ہے۔ عزت اور آبرو ہے۔ اور اگر کہیں خدانخواستہ اس میں بے لطفی ہے تو بدنامی اور رسوائی
کے علاوہ زندگی تلخ ہے۔ پس بڑی بات جو بیاہ کے بعد مجکو کرنی ہے یہ ہے کہ جس شخص سے [illegible] ایسا
قوی تعلق ہے کسی ڈھب سے اُس کو رام کروں اور اپنے قابو میں لاؤں اور اسی دن کے

واسطے تو میں سٹ پٹائی پڑی پھرتی تھی کہ جس کے پلّے مجکو باندھیں مجھ سے پوچھ کر باندھیں خیر وہ تو نہ ہوا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا تو کیا جب تک مجھ کو اُس کا طرز مزاج معلوم کرنے کا موقع ملے صبر کیئے بیٹھی رہوں۔ اور اگر اُن جان پنے میں مجھ سے کوئی بات سرزد ہو گئی اور اُس کو ناگوار گزری اور لگاڑ کی بنیاد پڑ گئی تو پھر میں کدھر کی ہوئی۔ اس سلسلے میں اُس کو پھر وہی خیالات عود کرنے لگے جن کو اُس نے ہار کر زبردستی دل سے دُور کر دیا تھا لیکن اُس کی طبیعت اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ اُس کو بے چین کیئے رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ بلا سے کسی طرح ایک نظر صورت بھی دیکھ پاتی تو کچھ نہ کچھ عقل دوڑاتی۔ شرافت بھلمنساہٹ بُردباری۔ نیک بختی یہ سب خلق جو جیسا ہوتا ہے اُس کا قیافہ بول اُٹھتا ہے۔ اور تیور سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔ سمدھیانے کی ماما روز بلا ناغہ خیر صلاح کی خبر کو آتی ہے اور گھڑیوں بیٹھ بیٹھ کر وہاں کی باتیں کیا کرتی ہے مجکو تو سامنے جانے کا حکم نہیں ورنہ اتنی ہی باتوں سے سارا پتہ لگا لیتی۔ خیر اتنا بھی غنیمت ہے کہ مولوی لوگ ہیں اگرچہ ابا جان مولویوں کا بہت ہی برا بھلا کرتے ہیں مگر اُن کے اعتراضات دوسری قسم کے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ نہ سب مولوی سولوی برابر۔ نہ سارے جاہل جاہل یکساں بلاشبہ بعض مولوی دکھاوے کے لیئے بھی روزہ نماز کرتے ہوں گے آپ فضیحت دوسروں کو نصیحت لیکن بلا سے ان کا ظاہر تو اچھا ہے۔ سو دفعہ آدمی دکھاوے کے لیئے کرے گا تو ایک نہ ایک دفعہ اُس کو خیال آہی جائے گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں خراب ہوں۔ اس کے علاوہ ظاہر کا پاس بھی انسان کو بہت سی بُرائیوں سے بچاتا ہے۔ ابا جان کا یہ اعتراض تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ جب میری تقدیر میں مولوی لکھے ہیں اور چار ونا چار مجھ کو مولوی کے گھر جانا ہے تو میں جو ابھی سے اُن کے عیبوں پر نظر کر کے اپنے دل کو اُن کی طرف سے پھیر لوں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ لڑائی کی ابتدا بگاڑ کی تمہید میری طرف سے ہوئی تو میں کسی کو رام کیا کروں گی خاک؟ دوسرے رام کرنے کی تدبیر تو یہ ہے کہ میں خود رام ہو جاؤں اور یہ بدوں اس کے ہو نہیں سکتا کہ اُن کی خوبیاں اس طرح میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہوں جیسے پتھر میں نقش اور مولویوں میں چاہے کچھ ہی عیب

کیوں نہ ہوں خانہ داری کے تو بڑے نہیں ہوتے اور مجھ کو اور چاہیئے بھی کیا؟ ہاں جب کبھی ننھیال جاتی ہوں نانا ابّا کے پاس میاں بیبیوں ہی کے اکثر جھگڑے دیکھتی ہوں مگر مولویوں کا اس قسم کا کوئی جھگڑا دیکھنا کیسا۔ سُننے میں بھی نہیں آیا۔ ہاں وہ مولوی محمد عمر کا مذکور البتہ خدا جانے کس سے سُنا تھا کہ اُنھوں نے اپنی بی بی کو طلاق دے دی تھی تو اُس سے مولوی صاحب کی اعلیٰ درجے کی دین داری پائی جاتی ہے۔ بہت دنوں کی بات بھول سی گئی تھی اب سوچا تو یاد آئی کہ مولوی صاحب بڑے ہی متقی پرہیزگار تھے اور رات دن سوائے عبادت کے اور کوئی کام نہ تھا۔ اُن کو اپنی بی بی سے بھی بڑا ہی اُنس تھا اور نہ کیوں ہوتا ہی تو اُن کے پیچھے دیندار ہونے کی شناخت تھی۔ اس بی بی سے مولوی صاحب کے تین یا چار بچے بھی تھے۔ مولوی صاحب عادت کے مطابق کھانے کے بعد لیٹے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے اتنے میں سُسرال کے رشتے کی کوئی بی بی آئیں اپنے میاں کا حال بیان کرنے لگیں کہ آج پانچواں دن ہے اس طرح کا بخار چڑھا ہے کہ بدن پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔ یہ آبخورہ لائی ہوں پانی دم کر دو اور کوئی دوا ہو تو بتا دو۔ مولوی صاحب نے پانی دم کر دیا اور طب نبوی میں سے دیکھ کر کوئی دوا بتا دی۔ دوا کا نام سن کر گھر والی بی بی بول اُٹھیں اے ہے لو یہ دوا تو نرچ دینا یہ تو بڑی گرم ہے الیسا نہ ہو سر کو گرمی چڑھ کر سرسام ہو جائے مولوی صاحب نے کہا دوا میں نے طب نبوی میں سے دیکھ کر بتائی ہے۔ خدا نے چاہا پیغمبر صاحب کی برکت سے فائدہ دے گی۔ بی بی کی جو آئی شامت لگیں کہنے یہ بلا کی تو گرمی پڑ رہی ہے اور ایسے زور کا بخار ہے اور تم کہتے ہو شہد میں کلونجی لت کر کے چٹا دو؟ نہ صاحب میری صلاح تو نہیں۔ مولوی صاحب۔ جب میں طب نبوی کا حوالہ دیتا ہوں تو اُس پر جرح کرنا خلاف شان اسلام ہے۔ اس پر بھی بی بی اپنی ہی سی کہے چلی گئیں۔ مولوی نے حمیت مذہبی کے جوش میں آ کر فوراً بی بی کو طلاق دے دی۔ اور دونوں میاں بی بی ایک دوسرے کے غم میں برس کے اندر ہی اندر مر گئے یہ تو ایک خاص صورت تھی اور اس میں مولوی صاحب پر کسی طرح کا الزام بھی نہیں۔ دنیا دار لوگ مولویوں کو چھیڑنے کے طور پر زن مرید کہا کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اُن کی بیبیوں کے دل سے پوچھے؟ میں تو ایسا

سمجھتی ہوں کہ کوئی مولون بادشاہ بیگم ہونا بھی پسند نہیں کرے گی۔ امیروں میں پس یہ ظاہر
ہی کہ کھانے پانے کپڑے لتے اور نوکر چاکر دیکھ لو دلوں کا خدا مالک ہی میاں الگ روٹھے
ہوئے ہیں اور بی بی علحدہ منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ ہفتوں صاحب سلامت بدارد
مہینوں گفتگو ترک۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہی۔ اس سے کہیں بہتر ہی فاقہ اور موافقت تنگی
اور یکرنگی۔ اب رہی یہ بات کہ مولویت کا پیشہ فی نفسہ کیسا ہی؟ سو ابّا جان بے شک اس کو نظر
حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن وہ حقارت بھی خدانخواستہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ معاذاللہ مولوی
کمینے ہیں کسی سے حسب نسب میں ہیٹے ہیں۔ یا علم قدر و عزت کی چیز نہیں بلکہ صرف اس خیال سے
کہ بعض مولوی ریاکار اور طمّاع ہیں۔ یہ تو کچھ پیشے کی نہیں بلکہ اُن خاص لوگوں کی بُرائی ہوئی
جن میں ریاکاری اور طمع کا عیب ہو۔ یوں تو بہتیرے نوکری پیشہ رشوت لیتے لوگوں کے
حق تلف کرتے ہیں تو کیا اس سے نوکری ذلیل سمجھی جائے گی؟ نہیں نہیں۔ ریاکاری اور طمع کا
عیب بھی اکثر اُن ہی مولویوں میں ہی جو ہیں تو کٹھ مُلّا اور کہلانے لگے مولوی۔ کہ اُن کو قصور
استعداد کی تلافی کے لیے ناجائز تدبیروں کی ضرورت واقع ہوتی ہی۔ اور جو مستند عالم ہیں
جیسے ہمارے نانا یا بڑے ماموں ان پر تو ابّا جان بھی کوئی حرف نہیں لگا سکتے؟ اور گنجایش پاتے تو
بھلا کہیں وہ چوکنے والے تھے؟ اگرچہ انگریزی پڑھ پڑھ کر لوگ مولویوں کی طرف سے بدعقیدہ
ہو چلے ہیں مگر جو سچ مچ کے مولوی ہیں اُن کا خدا کے فضل سے ابھی تک ہی ادب قایم ہی
اور خدا نے چاہا تو ہمیشہ ہمیشہ کو قایم رہے گا۔ لوگ مولویوں کا ادب نہیں کرتے بلکہ سچ پوچھو تو
ادب کرتے ہیں دین کا۔ ادب کرتے ہیں خدا اور خدا کے رسول کا۔ اور میں تو کہتی ہوں مولوی
کیسا ہی کیوں نہ ہو چاہیے وہ خود اپنا ادب بھی کرے کیوں کہ آپ اپنے حال سے آگاہ ہی
پھر بھی اُس کا پیٹ خدا عزت ہی سے بھرتا ہی۔ وتنی ہی آمدنی اور اسی حیثیت کے دوسرے
لوگوں کو دیکھو کس مصیبت اور بے قدری سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ خدا نے علم کو شرف دیا
ہی کسی کے پاس اور کسی پیرایے میں ہو وہ شرف اُس کو لازم ہی۔ ابّا جان مولویوں پر تو اعتراض
کرتے ہیں مگر مردوں کا حال میں کیا جانوں لیکن جہاں تک عورتوں کو دیکھا اور اُن کے حالات سنے دنیادار
کی عورتوں کو مولویوں کی عورتوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں یہ آدمی ہیں وہ حیوان بہ صفت شتے

وہ شیطان۔ خواجہ میرن صاحب کی بیٹی کے بیاہ میں سب ہی قسم کی عورتیں کثرت سے جمع تھیں
وہ آپ تو ٹھیرے امیر اُن کے علاقے سے بڑی بڑی امیر زادیاں مہمان آئی ہوئی تھیں۔ اور بی بی
اصیل النسل کی مولوی زادی ایک دالان میں اُن کے میکے کی مولونیں تھیں۔ وہاں میں نے ان
دونوں کی خوب ہی سیر دیکھی ایک ہی شہر کی رہنے والیاں اور عورت شکل۔ لباس۔ وضع
بات نشست برخاست۔ رفتار گفتار۔ ایک دوسری سے مطلق نہیں ملتی۔ امیر زادیوں کو
دیکھا بھوؤں تک پٹیاں جمائے زلفیں لٹکائے جوڑا باندھے۔ آنکھوں میں دھواں دھار
سرمہ دانتوں میں مسّی اور مسّی پر لاکھا کلّے میں بڑی گلوری دبائے۔ ٹھوڑی خال کی شکل بنائے
ماتھے پر افشاں ہاتھ پاؤں میں مہندی اپنا اور مانگے کا خدا جھوٹ نہ بلوائے سیر لوں گہنا لادے
سارے بزازے کا۔ ایک پائجامہ اور سر سے کر تک گویا ننگی۔ چلتے پھرتے سنجی اٹھتے بیٹھتے اترانا۔ ا
کی غیبت۔ اُس کی بدی۔ اِدھر آوازہ۔ اُدھر پھبتی۔ لونڈیوں کو گالی۔ ماماؤں کو جھڑکی اُس پر
جو بات اس کے لات پہلے قسم اور پیچھے بات۔ ضلع جگت میں مشتاق۔ شرم وحیا بالائے طاق۔
میں سچ کہتی ہوں کہ بیہودگی اور چھچھورپن کی حرکتیں کرتی تو وہ تھیں اور شرم مجکو آتی تھی کہ عورت
ہو کر اس قدر بے باکی اتنی بدلحاظی۔ ان میں سے آدھی کے قریب تو اکثر جب دیکھو ڈیوڑھی میں
کھڑی رہتی تھیں۔ میری برابر اور مجھ سے بڑی بڑی جوان لڑکیاں برلئے نام کواڑوں کی
آڑ میں کھڑی بے تکلف سودے کھا اور چکارہی ہیں اور جو گھر میں ہوتی تھیں گلی سے بدتر
اور بازار سے بڑھ کر اُن کا غل تھا نہیں معلوم اُن کے حلق ہی پھٹے ہوئے تھے یا اُن کے
نزدیک چلّا کر بولنا بھی تمغائے شرافت تھا۔ پھر کھانے میں جیسی جیسی بے تمیزیاں اُن سے ہوتی
تھیں ناگفتہ بہ ہیں۔ کورا تہ در تہ دسترخوان نکال رکھا پایا ہو اور ایک ہی دفعہ میں میلا کچیلا اتنا
کھاتیں نہیں ہیں جتنا بکھیرتی اور چُراتی جاتی تھیں۔ دن میں دو دو بار چاندنی بدلی جاتی تھی جب اُٹھائی
پیک کے دھبّوں سے جا بجا ہی بنی ہوئی پائی۔ شاباش ہے گھر والی بی بی کو کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے
دیکھتی تھیں اور بے چاری دم نہیں مارتی تھیں۔ غرض ان امیر زادیوں میں میں نے تو ایک
بات بھی النسانیت کی نہ دیکھی جو حرکت تھی نالایق اور جو ادا تھی بیہودہ۔ میں امیر زادیوں کو دیکھ
دیکھ کر برابر سوچتی تھی کہ جن کے زنان خانوں میں یہ گندگی بھری پڑی ہے۔ اُن کے مردوں کی

کیا کیفیت ہوگی؟ خدا ان کے سائے سے بچائے اور کسی بھلے مانس کو ان کے پڑوس میں نہ بسائے
عین ان کے مقابل صحن کے بیچ مولویوں کا دالان تھا۔ آدمی ادھر بھی اتنے تھے کہ تل دھرنے
کو جگہ نہ تھی مگر کیا مجال کہ کسی کی آواز سنائی دے۔ باہر کے پردے چھوڑ دو تو صحن میں کسی کو یہ
بھی شبہ نہ گزرے کہ دالان میں کوئی ہے۔ لڑکیاں تک ایسی سدھی ہوئی کہ جس کو دیکھو نچلی ماں کے
گھٹنے سے لگی بیٹھی ہے۔ سودا یہ نہیں مانگتیں۔ کھلانے کے لیے یہ غل نہیں مچاتیں۔ بیٹی کا گھر تھا اور بیٹی
بھی امیر۔ بیٹی کے نام کی خاطر مولوئیں خوب بن سنور کر گئی تھیں اور کپڑے اور زیور سے سب کی
حیثیت درست تھی قیمتی جوڑے۔ بھاری بھاری گہنے۔ اور اپنی اپنی عمر کے مطابق کنگھی چوٹی بھی
کون نہیں کرتا اور پھر ایسے موقع پر؟ لیکن بات کیا تھی ان کی ہر ایک چیز میں ثقاہت تھی۔ بالوں
میں سے خوشبو کی لپٹیں کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں مگر چوٹی سیدھی ہے پٹیاں نہیں زلفیں نہیں جوڑا
نہیں۔ مہک کہے دیتی ہے کہ کپڑے عطر میں بسائے ہیں کان میں پھویا نہیں۔ کپڑا قیمتی ہے مگر
پردہ دار اور شرع کے مطابق۔ کپڑے کے پہننے کا ایسا انداز ہے کہ بہت دیر تک میں ایک بیوی
کی تاک میں رہی کہ ان کی بالیاں دیکھوں کس وضع کی ہیں مگر نہ دیکھ سکی پر نہ دیکھ سکی۔ دو چار
بیبیاں تو جس وقت سے ڈولی سے اتریں میں نے جب دیکھا جانماز ہی پر بیٹھے پایا۔ مولویوں میں بھی
کسی قدر بے انتظامی تھی کہ ادھر ادھر بھاگی بھاگی پھرتی ہیں مگر صبح و شام کہ نماز کا وقت ہوتا تھا
تنگ اور ایک دم سے سب کی سب نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ گھر والی میکے کے لحاظ سے
مولویوں کا بہت خیال رکھتی تھیں ناشتے اور کھانے کے لیے سب سے پہلے ان ہی کو پوچھتیں مگر یہاں
سے جواب ملتا کہ ہماری کیا جلدی پڑی ہے اور لوگوں کو کھلاؤ پلاؤ ہم تو اسی سے بہت شرمندہ
ہیں کہ تم ہم سے کچھ کام نہیں لیتیں ورنہ اپنے اسی دن کے لیے ہوتے ہیں۔ کوئی ہم میں سے
مہمانوں کے ہاتھ دھلاتا۔ کوئی دسترخوان بچھاتا۔ کوئی پانی لے کر کھڑا ہوتا۔ کوئی کھانا
نکالتا۔ تم نے ہم کو احدی بنا کر بٹھا دیا ہے۔ نکمے بیٹھے بیٹھے جی بھی تو اکتایا جاتا ہے۔ میں نے
کان لگا لگا کر مولویوں کی باتیں سنیں تو وہی خدا رسول کا چرچا۔ ایک بولی آج کوئی باہر کے
مولوی فصیح آئے ہوئے ہیں۔ بولی تو پورب والوں کی سی ہے۔ مگر سبحان اللہ کیا وعظ کہتے ہیں کہ
کیسا ہی پتھر کا دل کیوں نہ ہو ایک دفعہ تو ضرور موم کی طرح ملائم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہشت اور دوزخ

کا حال بیان کیا تھا روتے روتے مردوں کی ہچکی بندھ بندھ گئی۔ دوسری۔ ہاں صاحب
خدا نے اپنے کلام میں ایسی ہی تاثیر اور برکت دی ہے۔ کیا تم نے اُن کو اپنے گھر بلوا کر وعظ کہلوایا
تھا؟ پہلی نہیں تو مولوی صاحب ہماری ہی مسجد میں آکر ٹھہرے ہیں اُن کا معمول ہے کہ نماز صبح کے بعد
شاگردوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھاتے ہیں۔ یہی اُن کا وعظ ہے۔ ایک دن آکر سنو تو سہی۔ ہمارا
گھر تو مسجد سے ملا ہوا ہے مسجد کی ذرا ذرا بات گھر بیٹھے سنائی دیتی ہے۔ دوسری میں تو ضرور آتی
لیکن کچہری جانے کے لیئے سویرے سے کھانے کی رول پڑ جاتی ہے۔ پہلی۔ کیوں خیریت تو ہے؟
دوسری۔ وہی آمین کا جھگڑا ابھی طے تھوڑا ہی ہوا ہے۔ پہلی۔ ہاں کچھ سنا تو تھا مگر کیا تمہارے
میاں بھی اس مقدمے میں کسی طرف ہیں؟ دوسری۔ لو اصل تکرار تو اُن ہی سے ہے۔ اُنہوں
نے ہی پکار کر آمین کہنی شروع کی تھی لوگوں نے اُن کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ پھر مسجد میں
اُن کے آنے کی بندی کی۔ اس پر مردوں مردوں میں فساد ہوا۔ مار کٹائی کی نوبت پہنچی دو
مہینے فوجداری میں مقدمہ لڑا۔ جرمانے ہوئے۔ مچلکے لیئے گئے۔ اب دیوانی میں مسجد کی تولیت
کا دعویٰ دائر ہے۔ دیکھیئے کیا ہوتا ہے؟ پہلی۔ کیوں بُوا آخر تم نے بھی کچھ تحقیق کیا کس کی زیادتی
ہے؟ مولویوں کی باتیں مولوی ہی جانیں اپنی سمجھ تو کچھ کام نہیں کرتی۔ ہم تو اندھے ہیں۔ جدھر
کو کسی نے بتا دیا اُدھر ہی کو ہو لیئے۔ بُرا نہ ماننا ایک موٹی سی بات تو میں سمجھتی ہوں کہ آخر
سیکڑوں برس سے ایک وضع پر لوگ نماز پڑھتے چلے آتے ہیں اور مولویوں سے بھی کوئی زمانہ
خالی نہیں رہا۔ اب یہ نئی نئی باتیں کیا سننے میں آتی ہیں۔ دوسری۔ اتنی پڑھی ہوئی تو
میں بھی نہیں ہوں کہ دونوں کی دلیلوں کو سمجھوں مگر ہاں جب پکار کر آمین کہنے پر فساد ہوا
تو میں اپنے میاں سے بہت لڑی تھی۔ آخر اُنہوں نے کہا کہ نماز کچھ ایسی چیز تو نہیں کہ جس
وقت چاہی اور جس طرح پر چاہی پڑھ لی۔ نماز خدا کی اور اُسی نے جبرئیل فرشتے کے ذریعے سے
حضرت پیغمبر صاحب کو سکھائی۔ حدیث میں آیا ہے کہ پہلے حضرت جبرئیل نے امامت کی اور
پیغمبر صاحب نے مقتدی بن کر جبرئیل کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر دوسری بار حضرت پیغمبر صاحب
امام ہوئے اور جبرئیل مقتدی پس ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس طرح کی نماز تھی جو پیغمبر صاحب نے
جبرئیل سے سیکھ کر پڑھی اور پڑھائی؟ اس کا پتہ لگے گا حدیث کی کتابوں سے جن میں پیغمبر

صاحب کے اقوال اور افعال موجود ہیں۔ نماز میں کئی باتوں کا اختلاف ہے۔ اول تو آمین کہ ہم
لوگ پکار کر کہتے ہیں اور حنفی آہستہ۔ دوسرے رفع یدین کہ ہم لوگ رکوع سے پہلے اور رکوع
کے بعد تکبیر اولیٰ کی طرح ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ یہ نہیں اُٹھاتے۔ تیسرے ہم امام کے پیچھے ہر رکعت
میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں یہ چپ کھڑے رہتے ہیں۔ چوتھے جلسہ استراحت کہ ہم لوگ دوسری
اور چوتھی رکعت میں کھڑے ہونے سے پہلے ذری کی ذری بیٹھ جاتے ہیں اور یہ سجدے سے
اُٹھ کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پانچویں ہم لوگ امام کے پیچھے پاؤں سے پاؤں جوڑ کر کھڑے
ہوتے ہیں اور یہ ایک سے ایک الگ۔ سو خیر۔ آمین بالجہر کے بارے میں تو حنفیوں کے پاس بھی
کچھ روایتیں ہیں۔ گو ضعیف ہیں مگر رفع یدین اور پاؤں ملانے کے خلاف اُن کی کسی کتاب میں کوئی
سند نہیں۔ یہ نری ان لوگوں کی ہیکڑی اور ہٹ دھرمی ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ لوگ بُرا
مانتے ہیں۔ تو کیا ضرور ہے جس طرح اور لوگ نماز پڑھتے ہیں تم اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ اور آخر اتنی مدت
سے پڑھتے ہی تھے۔ اس کا جواب انہوں نے ایسا برجستہ اور معقول دیا کہ میں چپ کی چپ
رہ گئی اور سمجھ گئی حنفیوں ہی کی زیادتی ہے۔ انہوں نے مجھکو رمضان میں سمجھایا کہ مجھ پر یہ اعتراض
تو کرو نہیں کہ تم اتنی مدت سے حنفیوں کی طور کی نماز پڑھتے تھے۔ یہ میری غفلت تھی۔ عام مسلمانوں
کی طرح میں بھی جانتا تھا کہ امام ابو حنیفہ۔ امام شافعی۔ امام احمد بن حنبل۔ امام مالک۔ یہی عمارت
دین کے چار ستون اور جسم اسلام کے چار عنصر ہیں۔ حق ان ہی چار میں دائر ہے مجھکو اپنی ذات
سے تحقیقات کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اور چونکہ میں ایک حنفی کے گھر پیدا ہوا ہوں اسلئے حنفی تھا
ہوں اور امام ابو حنیفہ کی تقلید میرے لیے کافی ہے چنانچہ میں نے حنفیوں ہی کی فقہ پڑھی
اور جس مسئلے میں جو کچھ امام ابو حنیفہ نے کہا ہے میں اسی کو وحی آسمانی خیال کرتا رہا۔ یہاں تک
کہ میں نے حدیث شروع کی جوں جوں مجھکو حدیث پر عبور ہوتا گیا میری آنکھیں کھلیں اور میں
نے سوچا کہ خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک شرع نازل کی اور آخرکار فرمایا اَلْیَوْمَ
اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ آج میں نے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ پیغمبر صاحب نزول وحی سے تیئیس برس
تک زندہ رہے اور یہ سارا وقت اُن کا دین ہی کی تعلیم میں صرف ہوا جو کچھ خدا نے فرمایا وہ کلام اللہ
قرآن میں جمع ہے۔ اور جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اور کیا احادیث میں۔ پس مسلمانوں

کو اپنے دین کی تکمیل کے لئے اول قرآن چاہیئے اور قرآن کے بعد حدیث میں نہیں جانتا کہ چاروں امام بیچ میں کہاں سے کود پڑے۔ پیغمبر صاحب کے ساتھ نسبت نہ کرتے ہیں کوئی مصلحت تھی تو صحابی کا نام لیتے اور کوئی اپنے کو صدیقی کہتا کوئی عمری کوئی عثمانی کوئی علوی کوئی انسی کوئی ابو ہریری وغیرہ تو ایک جا بھی تھا۔ کیونکہ پیغمبر صاحب نے اپنے اصحاب کی شان میں فرمایا ہے کہ میرے اصحاب کی مثال ستاروں کی سی ہے چاہو جس کے پیچھے ہو لو رستہ نہیں بھولوگے۔ پیغمبر کو چھوڑا اصحاب اور تابعین سے مونہ موڑا ایک دم سے تبع تابعین پر آرہے جیسے کوئی زینے کی دو سیڑھیاں چھوڑ کر دھڑام سے تیسری پر گرے ہیں اس کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک طرح کی توہین سمجھتا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ دوسرے بزرگانِ دین مثلاً حضرت پیرانِ پیر یا قطب صاحب یا سلطان جی صاحب وغیرہ کے عرس کرتے ہیں ان کی نسبت بھی میں اکثر خیال کیا کرتا ہوں کہ پیغمبر صاحب کے بعد اصحاب کا درجہ ہے اصحاب کے بعد تابعین اور تابعین کے تبع تابعین کا۔ ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم[1]۔ یہ بزرگانِ دین تو اُن کے آگے اُمتی ہیں۔ وہ بے شک اچھے اور بہت اچھے اور نہایت اچھے ہیں ہم سیاہ کاروں سے۔ اور ہم اُن کی خاک پاک کی برابری بھی نہیں کرسکتے لیکن ع گرفرق مراتب نہ کنی زندیقی + سب کچھ ہو اصحاب کو نہیں پاسکتے جنہوں نے مصیبتوں میں پیغمبر کا ساتھ دیا۔ جنہوں نے دین کی خاطر وطن چھوڑے عزیز و اقارب چھوڑے مال و متاع چھوڑے جنہوں نے پیغمبر پر جانیں قربان کیں بس یہ میرا عقیدہ ہے اگر اس میں کوئی بات میں بے جا کہتا ہوں کوئی مجھے قائل کردے میں خدا کی نماز پڑھتا ہوں اور جو وضع میں نے خوب سوچ سمجھ کر اختیار کرلی ہے۔ اگر مجھ کو لوگ ہندوستان بلکہ روئے زمین سے بھی نکال دیں تو میں اُس میں سے ایک تل کی قدر بھی ترک نہیں کروں گا۔ آج حنفیوں کے کہنے سے آمین چھوڑ دوں کل کو ہندوؤں کے خوش رکھنے کے لئے نماز پرسوں عیسائیوں کی خاطر توحید۔ تو دین نہ ہوا لڑکوں کا کھیل ہوا؟

یہ باتیں یاد کرکے آزادی مولویوں کی طرف کو ڈھلتی جاتی تھی۔ مگر آخر تھی تو نوجوان لڑکی ایک دن اُس کو خیال آیا کہ مولویانہ زندگی کچھ بھی ہو اُداس اور بے رونق تو ضرور ہے۔ یہ نہیں

[1] پھر جو اُن کے پھر جو ان کے بعد ۱۲

کہ ان میں صاحب مقدور نہیں رہیں مگر بہت کم۔ اور ایک مصیبت یہ ہی کہ جن کو مقدور ہی زندگی اُن کی بھی غریبوں کی طرح بسر ہوتی ہی بلکہ غریبوں سے بدتر۔ کیوں کہ غریب کے پلّے ٹکا نہیں اور یہ مجبوری نہوت کی وجہ سے شکستہ حال رہتا ہی۔ لیکن مولوی خوش حال بھی ہی۔ تاہم اُس کی صورت پر نکبت اور مفلسی برستی ہی۔ معلوم نہیں جیسا آپا جان کہتے ہیں دکھانے کے لیے بتکلف اپنے تئیں زدہ حال بنائے رہتے ہیں کہ لوگ اُن پر رحم کریں اور کچھ دیں یا یہ بھی داخل تواضع ہی بہر کیف آدمی پہلے پتے کو مارے تن بدن کو خاک کرے۔ جوانی میں بوڑھا اور تونگری میں مفلس بنے۔ تو مولویوں میں ملنے کا نام لے۔ سو میرے تو کھانے پہننے کے دن ہیں۔ امّا جان کو اتنی بات نہ سوجھ پڑی اور مجھے کہاں جا پھنسایا؟ اُن کو اتنا خیال نہ آیا کہ اس کے پاس بھی دل ہی اور دل میں اُمنگ؟ یہ بھی آدمی ہی اور اس عمر میں آدمی کیسے کیسے ارمان کیا کرتا ہی؟ آخر یہ وقت کبھی ان پر بھی تو گزرا تھا اپنے اُسی وقت کو یاد کر کے سمجھ گئیں ہوتیں؟ اور اب بھی کیا گیا ہی؟ جمعے کے جمعے سر نہیں دھوتیں؟ یا پندرھویں دن مہندی نہیں لگاتیں سہینے کے مہینے چوڑیاں نہیں پہنتیں؟ رنگے ہوئے ڈوپٹے نہیں اوڑھتیں ہوتیں آج کسی مولوی کے گھر تو ہم بھی دیکھتے بوی کیسی بنیں سنوری رہتی ہیں۔ ان خیالات نے آزادی کو ہفتوں ماسے بدگمان اور اپنی منگنی کی طرف سے پریشان رکھا۔ لیکن آدمی کا دل ہمہ وقت یکساں نہیں رہتا۔ وہ ایک بار پھر چلی اور خدا جانے کس کا مرنا سنا تھا کہ اُس کو دنیا کی بے ثباتی کا تصور بندھا اور اُس نے سوچا دنیا ہی کیا چیز۔ لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا ہوتے اور ایک وقت خاص تک زندہ رہتے اور آخرکار فنا ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ کھیتی کا سا حال ہی کسان نے زمین کو جوت بو کر چھوڑ دیا۔ خدا نے پانی برسایا ابھی تھوڑے دن ہوئے کھیت میں خاک پڑی اڑ رہی تھی اور نظر بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا یا اب لگا غلہ لہلہانے جس کی سبزی سے آنکھوں کو تراوٹ اور دل کو فرحت پہنچتی ہی کسان ہی کہ کھیت کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا۔ اور بڑے بڑے باغ دار امیر صبح و شام سیر دیکھنے کے لیے اس کے گرداگرد منڈلائے پھرتے ہیں۔ پھر اُس میں پھل آیا وہ جوبن تو گیا گزرا ہوا مگر کسان کی جان اُس میں لڑی ہی۔ بادل آیا اور سہم گیا کہ

کہیں اولے نہ پڑیں پچھوا ہوا چلی اور سرد ہو گیا کہ ایسا نہ ہو پالا مار جائے۔ بارے خدا خدا کر کے غلہ طیار ہوا کاٹ کر چلتے ہوئے۔ طبیعت ہے کہ پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ وہی وحشت وہی سناٹا۔ وہی بے رونقی۔ وہی اداسی۔ دوسری فصل آئی اور پھر وہی چکر۔ دنیا حقیقت میں ایک عجائب خانہ ہے جس میں ایک سے ایک چیزیں اچنبھے کی ہیں۔ آدمی عجیب۔ اس کا پیدا ہونا عجیب۔ اس کا جینا عجیب۔ اس کا مرنا سب سے زیادہ عجیب۔ اتنی تو مختصر زندگی کہ بہت سے بہت ہوئی تو ساٹھ ستر اور وہ بھی بے ٹھور بے ٹھکانے کہ صبح ہوئی تو شام کا بھروسا نہیں شام ہوئی تو صبح کا اعتماد نہیں۔ بچے کو جوان ہونے کا یقین نہیں۔ جوان کو بڑھاپا دیکھنے کا اذعان نہیں۔ اور اس پر کیسے کیسے ارادے۔ کیسے کیسے حوصلے۔ کیسے کیسے سامان کہ گویا سدا سدا کا رہنا اور ہمیشہ ہمیشہ کا بسنا عقل اور عقل کے ساتھ نادانی ہوشیاری اور ہوشیاری کے ساتھ غفلت۔ مجبوری اور مجبوری کے ساتھ سینہ زوری۔ یہ انتظام الٰہی نہیں تو پھر کیا ہے؟ فرض کرو۔ کہ ایک فرشتہ انسان اور انسان کے حالات سے ناواقف محض تھوڑی دیر کے لیے آسمان سے زمین پر اتر آئے تو وہ ہماری کون سی ادا سے شناخت کر سکے گا کہ ہم مخلوق فانی ہیں۔ وہ دیکھے گا ہم نہایت پائدار اور مستحکم عمارتوں میں رہتے ہم آئندہ کے سیکڑوں برسوں کے انتظام سوچتے۔ ہم بڑی سے بڑی اور لمبی سے لمبی میعادوں کے واسطے معاملات کرتے۔ ہم باغ لگاتے جن میں بعض درخت ایسے بھی ہیں جو انسان کی عمر طبعی میں بار آور نہیں ہوتے اور پھر توقع رکھتے کہ ہم آپ ان کے پھل کھائیں گے۔ ہم ایک حویلی یا کپڑا خریدتے تو اس کو بھی چلاؤ دیکھ کر لیتے۔ بے شک ہم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو مرتا ہوا دیکھ کر کبھی خیال کرتے کہ شاید ہم بھی مریں تو تعجب نہیں لیکن وہ خیال ساون بھادوں کی بدلی سے زیادہ ثبات نہیں رکھتا۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ اپنے ہی جیسے آدمی کو بلکہ شاید اپنے سے عمر میں چھوٹے ہاتھ پاؤں کے کھلے اور کاٹھی کے مضبوط اور توانا تن درست کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دبایا اور قبرستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بے شمار آدمی مٹی میں دبے پڑے ہیں اکثر کی تو قبر تک کا بھی نشان نہیں بعض کا ہے اور ان کی قبر پکی اور اس پر کندہ کیا ہوا پتھر بھی نصب ہے مگر کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس نام کے کون صاحب تھے

اور کہاں رہتے تھے۔ یہ سب کچھ ہے مگر گورستان سے لوٹے نہیں اور وہی بے فکری اور ویسی ہی لاپروائی۔ لوگ کہتے ہیں کہ خاک و آب و آتش و باد چار عنصروں سے انسان کی ترکیب ہے مگر اُس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ غفلت بھی اس کے خمیر میں ضرور ہے بلکہ دوسرے عنصروں سے زیادہ ہے۔ انتظام دنیا جہاں تک اُس میں انسان کو دخل ہے۔ مبنی ہے اسی غفلت پر غفلت نہ ہو تو انسان سے اُٹھ کر پانی بھی نہ پیا جائے۔ کاشت کاری اور تجارت اور دوسرے کاموں کی تو کون کہے۔ اور بتحقیق سُنا ہے کہ جن مجرموں کو پھانسی کا حکم سنا دیا جاتا ہے اور اُن کو یقیناً معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ہم نہیں بچ سکتے تو ہفتوں آگے سے دانہ پانی چھوٹ کر مردے سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیند ایسی بُری چیز ہے کہ پھانسی پر بھی آئے بدون نہیں رہتی لیکن یہ اُن کا کہنا ہے جنہوں نے پھانسی کا حکم نہیں سنا پھانسی کا حکم سنیں اور سو کر دکھا دیں تو جانیں۔ انسان کی طبیعت میں غفلت کا ہونا بھی حکمت سے خالی نہیں اگر ہر وقت موت آنکھوں کے آگے کھڑی رہے تو مارے ڈر کے آدمی کے حواس مختل ہو جائیں اور اُس سے بُرا یہ کہ کسی طرح کا کام ہی نہ ہو سکے۔ اور انسان کے پیدا کرنے سے جو غرض ہے بالکل فوت ہو جائے پس غفلت کا ہونا ضرور ہے اور بے غفلت کے دنیا کا کام نہیں چل سکتا لیکن نہ اس درجے کی کہ ہم موت کو کبھی بھول کر بھی یاد نہ کریں اور اپنے تئیں ایسی گھڑی سمجھ لیں جس کی کوک کبھی ختم نہ ہو گی۔ یا ایسا چراغ جس کا تیل کبھی نہیں ہو چکے گا۔ ایسی عمارت جو کبھی نہیں گرے گی۔ یا ایسا چشمہ جو کبھی نہیں سوکھے گا۔ یہ سچ ہے کہ کسی آدمی کو مرنے سے انکار نہیں اور انکار ہو سکتا بھی نہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی آدمی ایسا دیکھنا تو کیا سننے میں بھی نہیں آیا جو کسی تدبیر یا حیلے سے حضرت عزرائیل کی نظر سے بچ گیا ہو۔ لیکن مونہہ سے انکار نہ کرنا اور نہ کر سکنا اور چیز ہے اور معاملات سے اور روزمرہ کے برتاؤ سے ثابت کر دکھانا اور چیز۔ مجھکو تو حضرت علی علیہ السلام کی وہ حکایت کبھی نہیں بھولتی کہ جنگ جمل میں جب لڑائی کا بہاڑ سا اُبل رہا تھا حضرت گھوڑے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے خادم نے گھبرا کر کہا کہ لوگوں کے سر گنبد کی طرح اُچھل رہے ہیں اور تم کو سونا سوجھا ہے؟ حضرت نے مسکرا کر فرمایا کیا تو قرآن کی وہ آیت بھول گیا؟ اذا جاء اجلھم[۱] لا یستاخرون ساعۃ و لا یستقدمون۔

[۱] جب ان کی موت آئے گی تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے

وہ خادم بھولا تو کیا ہوگا۔ اور ایسا کون مسلمان ہے جس کو یہ آیت یاد نہیں اور لفظ نہ بھی یاد ہوں
تو اس کا مطلب کیا طوطوں کی طرح زبان پر چڑھا ہوا ہے لیکن عمل کی طرح ایسے وقت میں کوئی
سو کر دکھا دے تو ہم اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو طیار ہیں۔ جب ایسے راسخ عقیدے
تھے تو ان کو یہ کہنا بھی بجا تھا۔ لو کشف الغطاء[1] لما ازددت یقیناً۔ ایک مسلمان وہ تھے
کہ غیب پر اس طرح کا ایمان لائے تھے اور ایک ہم ہیں نجات کے طالب جنت کے امیدوار
شفاعت کے مستحق مغفرت کے آرزومند کہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور بات جی میں نہیں بیٹھتی۔
اس واسطے کہ غور کی عادت نہیں۔ سوچنے کی فرصت نہیں۔ شوق نہیں۔ رغبت نہیں۔ موت
کا اگر کبھی خیال آتا بھی ہے تو اسی قدر کہ موت کے معنے ہیں مرنا۔ بےشک موت کے معنے مرنا تو ہیں
لیکن اس کے لوازم پر بھی نظر کی اس کے نتائج کو بھی سمجھا۔ آدمی جب تک مر نہ جائے اس کو
کیفیت مرگ سے آگاہی ہو نہیں سکتی۔ دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بعض بڑی ہی
سختی سے جان دیتے ہیں ان کے ہوش و حواس آخر تک برجا رہتے اور جو کچھ ان پر گزرتی ہے۔
دوسروں سے کہتے اور ان کے کرب سے ان کو تکلیف کی پہچان پڑتی۔ بعض جان کنی سے پہلے بے
ہوش ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایذا اوپر والوں کو محسوس نہیں ہوتی۔ اور کوئی کوئی اللہ کے بندے
ایسے بھی ہیں کہ باتیں کرتے کرتے پھونک نکل گئی اور ہو چکے کیا معلوم کس طرح اپنی تقدیر میں
مرنا لکھا ہے اور چونکہ بُرے سے بڑے خوف کا انجام موت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت
بڑی ہی خطرناک چیز ہے۔ لیکن اے کاش مرنے سے آدمی کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا۔
اگر ایسا ہوتا تو سخت سے سخت جان کنی کے ساتھ سب سے پہلے مرنے کی میری درخواست
ہوتی لیکن خاتمہ کیسا۔ مرنے سے انسان کی ابدی اور دائمی زندگی شروع ہوتی
ہے جس کا بھلا یا بُرا راحت بخش یا مصیبت مند ہونا موقوف ہے اعمال پر جو اس نے
اس چند روزہ زندگی میں کیے۔ پس یہ زندگی بے ثبات اور غیر متیقن اور چند روزہ ہونے
کے علاوہ اور انواع مصائب اور اقسام تکالیف اور طرح طرح کے تردّدات سے قطع نظر
زندگی کاہے کو انسان کے حق میں عذاب اور وبال ہے جب کہ اس کا نتیجہ عاقبت معلوم

[1] اگر وہ پردہ اٹھا دیا جائے تو میرا یقین اس سے زیادہ نہ ہو جیسا اب ہے ۱۲

نہیں۔ اور بعض بزرگان دین سے جو یہ منقول ہو کہ وہ تمنا کرتے تھے کہ ہائے ہم درخت یا پتھر نہ ہوئے تو اس کا یہی سبب ہو۔ یہ تو مذہبی خیال ہو اور یوں آدمی اس کو اپنے ذہن میں نہ آنے دے تو دوسری بات ہو مگر ذرا بھی سوچے اور غور کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس کا قائل نہ ہو لیکن یوں بھی دنیا کی زندگی قدر اور پسندیدگی کی چیز نہیں۔ اور کیوں قدر اور پسندیدگی کی چیز ہونے لگی جب کہ آدمی آج تخت نشین ہو اور کل پیوند زمین آج صاحب مقدور ہو اور کل عاجز و مجبور۔ آج خزانہ اس کے ساتھ ہو اور کل خالی ہاتھ۔ آج لباس و پوشاک ہو۔ اور کل بستر خاک۔ آج با وقعت و اعتبار ہو اور کل ذرۂ بے مقدار۔ آج عزیز ہو اور کل حقیر و ناچیز۔ آج مرجع معظمات الامور ہو۔ اور کل داخل اصحاب القبور (یعنی آج زندہ ہو اور کل مردہ۔ آج ہو اور کل نہیں) وہ کسی کا ہندی کا دوہرا کیسا عمدہ ہو۔

چلنا ہو رہنا نہیں اور چلنا اپوئے ہیں   ایسے سہج سہاگ پر کون گندھائے سیس

ان خیالات نے جو آزادی نے کچھ کتابوں میں پڑھے اور اکثر وعظ میں سنے تھے اس کے تمام جوش ٹھنڈے کر دیئے اور یہ باتیں ہیں بھی اسی قسم کی کہ ہر روز بلکہ دن میں کئی کئی بار آنکھوں کے سامنے گزرتی ہیں خدا دیکھنے اور سمجھنے کی توفیق دے تو آدمی کو ایسا بے دھا بنا دیں جیسے جنتری میں نکلا ہوا تارہ۔ اب آزادی نے دل میں پکا عہد کر لیا کہ خدا نے چاہا اس کے بعد سے تو میں اپنی شادی بیاہ کی نسبت کسی طرح کا فکر کروں گی نہیں۔ جو خدا کو منظور ہو۔ ہو ہو رہے گا میں اپنی تدبیر سے پیدا نہیں ہوئی اپنی تدبیر سے اتنی بڑی نہیں ہوئی۔ جو عیش و آرام مجکو اس گھڑی تک بسر ہوا اپنی تدبیر سے میں نے اس کو بہم نہیں پہنچایا جس نے اپنے فضل سے یہ سب کچھ کیا ہو کیا وہ آگے کو میری خبر نہیں رکھے گا اور ضرور رکھے گا۔ یہ بھی میرے ایمان کا ضعف ہو کہ اس پر پورا بھروسا نہ رکھ کر اپنی تدبیر کو دخل دوں۔ کیا میں اور کیا میری تدبیر؟ قسمت اور تقدیر قسمت اور تقدیر

ساتویں فصل آزادی مولوی مستجاب کے ساتھ بیاہی گئی اور آخر اُن سے مولویت چھڑا کر رہی

وہ بھی خدا جانے کیا بات تھی کہ آزادی کی منگنی پہلے ہو گئی ورنہ مولوی لوگ منگنی کے رگڑے جھگڑے کیا جانیں۔ بات پکّی ہوئی۔ گئے نکاح پڑھا کر رخصت کرا لائے۔ نہ باجا نہ گاجا نہ ڈھول ڈھمکّا۔ نہ آرایش نہ آتش بازی نہ دھوم دھڑکّا۔ ایک زمانہ تھا کہ محلّے میں کسی کھاتے پیتے گھر بیاہ ہوتا تو سارے شہر میں غل مچ جاتا ہفتوں پاس پڑوس والوں کو نقار خانے کے شور سے رات کو سونے کی نوبت نہ آتی۔ آتش بازی سے دس بیس کے منہ جھلستے۔ آرایش کے لوٹنے میں دو چار کے سر ٹوٹتے۔ اُس وقت تو شیخی میں کچھ نہ سوجھ پڑتا پھر بیٹی والے تو ساری عمر بھیک مانگتے اور بیٹے والے بہو کا جہیز بیچ بیچ کر گزر کرتے۔ خدا مولویوں کا بھلا کرے کہ انھوں نے وعظ کہہ کہہ کر اس کفر کو توڑا اور خلاف شرع رسموں کو موقوف کرایا۔ اب کوئی خدا کا ایسا ولی پیدا ہو کہ مولویوں نے جو مسلمانوں کے پیچھے اپنے اور اپنے فضول مدرسوں کے خرچ لگا دیے ہیں کسی طرح ان کو بند کرے تو ہم بھی اپنے جیتے جی مسلمانوں کو چٹنی کی جگہ دال کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے دیکھ کر ذری کی ذری خوش ہو لیں۔ اب تو حقیقت میں لوگ ایسے چپ چپاتے بیاہ کر لیتے ہیں کہ جب ان کے بچے گھٹنیوں کھسک کھسک کر گلی میں آ بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فلانے کا فلانا ہے۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ ایک گلی میں برات چلی جا رہی تھی ساتھ والوں کے گھٹنوں[1] سے معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہ[2] کے تو نہیں مگر کسی مولوی کے مقلد ہیں۔ اتنے میں کوئی صاحب بغلی گلی سے نکل کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے اور لگے کلمہ پڑھنے پھر آپ ہی آپ بولے لاحول ولا قوۃ۔ اس وقت کیا دھوکا ہوا۔ میں نے جانا جنازے کے ساتھ ہیں۔ آزادی کا بیاہ سیدھا سادہ ہونے کی دو وجہیں ہوئیں۔ ادھر تو مولویوں

---

[1] اونچے پاجاموں کی طرف اشارہ ہے ۱۲ [2] یہ طنز کی بات ہے کہ ابو حنیفہ کی تقلید کو تو برا سمجھیں اور اس زمانے کے مولویوں کے مقلد ہوں ۱۲

کی ڈیڑھ[1] اینٹ کی مسجد الگ۔ سسرال مولوی۔ ماموں لوگ، اُدھر باپ کے خیالات انگریزی۔ مولوی تو اتنا ہی چاہتے تھے کہ کانوں کان خبر نہ ہو اور جیب تک منہ سے قبلت[2] نہ کہے پہچان نہ پڑے کہ ان میں دولہ کونسا ہے۔ باپ کی رگ اس لئے ظاہر نہیں کی) یہ رائے کہ دولھا دلھن نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں جان پہچان نہیں ملاقات نہیں ایسا نکاح خلاف عقل بعید از مصلحت؟ غرض آزادی کا بیاہ تو ہوا مگر جہاں تک مولویوں سے کرتے بن پڑا بے رونق۔ آزادی آج کو گڑیا ہوتی مگر ہوتی کسی نواب کی کھلائی کی پوتی یا نواسی کے کھیلنے کی۔ تو بیاہ کی سیر دیکھتے۔ نواب صاحب بے چارے کے پلّے نواب کیا دھرا تھا۔ بزرگوں نے وقتوں کے گاؤں با نات۔ کٹڑے گنج معافیاں۔ وہ کاہیں سب ٹھکانے ہوئیں خالصے لگا چکے۔ رہنے کی محل سرا تک گروی پڑی ہے۔ بیگم صاحب کے پاس گہنے کا تار باقی نہیں۔ سو سوا سو روپے مہینے کی دوامی انگریزی پنشن تھی وہ ساہوکار کے قبضے میں نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن کے لئے منتقل کر دی گئی۔ گٹھریوں پشتینے میں سے ایک دقیانوسی جامہ وار اور ایک چار باغ رومال مگر بیسیوں جگہ سے رفو کیا ہوا اور بڑے بچے تھے سو ایسا پیچ آ کر پڑا کہ پچھلی گرمیوں میں آکاونگ کے ساتھ پتنگ لڑے وہ دونوں ریزے بھی کوڑیوں کے مول زبردستی کسی کے سر منڈھے۔ خیر وہ پرانے چیتھڑے گئے تو گئے بارے بازی تو نواب صاحب کے ہاتھ رہی۔ ظاہر حال تو نواب صاحب کو کہیں سے کوڑی کی آمدنی معلوم ہوتی نہیں لیکن بنیا جو اُدھار دیئے چلا جاتا ہے بنیئے کی ذات بھی بڑی ہی سیانی ہوتی ہے آخر اس نے کچھ نہ کچھ تو سہارا دیکھ لیا ہوگا۔ آہا تیسرا برس ہے پھول والوں کی سیر کے لیئے پانسو کی اشرفیاں دو سو بدل رکھوائی تھیں کہیں اُن کا لیکھا برابر سرابر کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ سو لالہ کے کان کھول دینا کہ یہ اشرفیاں نواب صاحب کے دادا کے وقت کی ہیں اُنہوں نے جناب بڑی بیگم صاحب سے لڑ جھگڑ کر بڑی مشکل سے نکلوائیں سو بھی کس طرح کہ اپنی جوانی کی قسم کھائی کہ میں بیچنے کا نہیں۔ بس ہم تو خاندانی امیروں کی اسی ادا پہ لٹو ہیں کہ کیسے ہی تنگ دست بلکہ تہی دست کیوں نہ ہو جائیں فطری سیر چشمی اور جبلّی داد و دہش جو ہے سو ہے امیر اگر اصل نسل کا امیر

[1] مشہور کہاوت کی طرف اشارہ ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا ۱۲ [2] نکاح کے وقت مرد کو یہ لفظ کہنا ہوتا ہے جس کے معنے ہیں کہ میں نے قبول کیا ۱۲

ہے تو اس کی نظروں میں چٹکی خاک ہے اگرچہ اکسیر ہے۔ نواب صاحب ذرا سُن پائیں کہ دادا کی نواسی گڑیا کے بیاہ کے لیے مچل رہی ہے پھر چاہے ایک ایک کے چار چار بلکہ سو سو اور ہزار ہزار دینے پڑیں تو پڑیں مگر دادا کا دل میلا ہو یہ کب اُن کو گوارا ہو سکتا ہے۔ اور خدا رکھے زنانہ دل بھی ایسے ہیں کہ گڑیا کے بیاہ کے ساتھ سارے مشغلے چھوڑ چھاڑ وہ نواسی کے سر ہو جائیں گے دیوانہ رہا ہوئے بس ست۔ وہ تو ایسے بہانہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں + آزادی ایسے دل و دماغ کی عورت تھی کہ اُس کی پسند کے شوہر کا ملنا بھی ذرا مشکل۔ خدا جانے مولوی مستجاب کی کون سے وقت کی دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو گئی تھی کہ آزادی جیسی بی بی اُن کو ہاتھ لگ گئی صورت اور سیرت ایک سے ایک عمدہ ایک سے ایک بہتر۔ مولوی صاحب آزادی کی نظروں میں جنچے تو کیا ہوں گے۔ مگر آزادی کسی بات کی شاکی کسی مدارات کی فریادی بھی نہ تھی۔ اُن میں جس چیز کی کمی رہی ہو اُس کی تلافی اس سے بخوبی ہو تی تھی کہ مولوی صاحب بی بی کی جورو بنے ہوئے اُس کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ آزادی کہتی اُٹھ تو بے تکان اُٹھ کھڑے ہوتے وہ کہتی بیٹھ تو بے عذر بیٹھ جاتے۔ اِدھر آزادی بھی ایسی نادان تھی کہ میاں کو فرماں بردار دیکھ کر نخرے میں آجاتی اور اپنے تئیں کھینچنے لگتی۔ وہ میاں کو میاں ہی سمجھتی اور اس کی بہت احتیاط کرتی رہی کہ آج جو میری جگہ ان کے دل میں ہے ایسا نہ ہو کل کلاں کو اُس میں کسی طرح کا فرق آئے اور ان کی نظر میری طرف سے پھر جائے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں ایسی محبت پیدا ہوئی کہ سو لونیں بھی آزادی کا رشک کرنے لگیں۔ جان پہچان میں کہیں بیاہ ہوتا تو شگون کے لیے آزادی سے سورۂ اخلاص[1] پڑھوا کر دولھا دولھن کے مونہہ پر دم کرواتے کہ جیسا پیار اخلاص ان دونوں میاں بی بی میں ہے خدا کرے ویسا ہی دولھا دولھن میں بھی ہو۔ مولوی مستجاب کی زندگی تو معمولی طور کی تھی جیسے میزان و منشعب کی گردان وہ کبھی اپنے حالات بیان کرتے بھی تو اسی قدر کہ میں نے اتنے دنوں میں قرآن حفظ کیا پھر فارسی پڑھی۔ پھر عربی شروع کی۔ صحاح ستہ میں بخاری کا نصف اخیر رہ گیا ہے یہ ہو جائے تو حدیث کی سند لوں۔ فرائض کے فتوے میں ہی لکھتا ہوں ایسا ہی کوئی بکھیڑے کا مناسخہ

---

[1] یعنی قل ہو اللہ ۱۲۔

آیا تو احتیاطاً دکھا لیا فتاویٰ عالم گیری کے معاملات مجکو خدا کے فضل سے مستحضر ہیں جواب استفسار کے لکھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہی وعظ میں مجکو بڑی دقت پیش آئی میں ٹالتا تھا کہ یہ کام اختیار نہ کروں۔ والد صاحب نے نہ مانا تو میں نے اُن ہی کی صلاح سے پہلے اپنے ہی گھر کی عورتوں میں وعظ شروع کیا۔ عورتیں اول تو لایق کم ہوتی ہیں بلکہ نہیں ہوتیں۔ دوسرے مذہبی باتوں کو بڑی عقیدت سے سنتی ہیں۔ رفتہ رفتہ محلّے کی عورتیں جمع ہونے لگیں جب عورتوں میں میرا ہیاؤ کھل گیا تو پھر شہر کے گرداگرد دیہات میں جا جا کر وعظ کہنے لگا۔ جیسے سبزی منڈی اور پہاڑ گنج۔ اور اب تو خدا کے فضل سے جامع مسجد کے بیچ کے در میں جمعے کے جمعے وعظ ہوتا ہی اور لوگ گھروں میں بھی بلانے لگے ہیں۔ صرف و نحو منطق اور فقہ کے بھی چھ سات سبق ہوتے ہیں۔ غرض رنگ جمتا چلا ہی۔ مستجاب کے پاس اور بیٹھا بھی کیا کہ وہ آزادی کے سامنے بیان کرتا۔ مگر آزادی کی داستان بڑی لمبی تھی کہ وہ پہروں اپنے ماں باپ کے اختلافات کو بیان کرتی اور گھنٹوں اپنے ذاتی خیالات میں مستجاب کو مشغول رکھتی۔ یہاں تک کہ آزادی کی باتیں سُن سُن کر مستجاب کے دل میں مولویت کی طرف سے نہیں بلکہ مولویت کے پیشے کی طرف سے از خود ایک نفرت سی پیدا ہوئی۔ اگر آزادی کی یہی غرض تھی تو واقع میں اُس نے بڑی عمدہ تدبیر سوچی۔ اُس نے منصب ناصح نہیں اختیار کیا جس سے سننے والوں کی طبیعت میں ضد اور مخالفت پیدا ہو۔ قصہ کہانی کے طور پر بات بھی کہہ گزری اور دل بھی نہ دُکھایا۔ نفرت سے پیدا ہوئی بے دلی اور بے دلی سے معمولات میں آیا فرق لگے وعظ ناغہ اور سبق گنڈہ دار ہونے۔ یا تو دعوتوں کے بارے میں یہ اہتمام تھا کہ گویا حق العباد میں سے یہ ایک حق ہی جو کسی وقت اور کسی حالت میں ساقط نہیں ہو سکتا اب طبیعت لگی چلنے اور بہانے ڈھونڈھنے جس طرح مرثیہ خوانوں کے ساتھ بسورنے لگے رہتے ہیں کہ ذاکر صاحب نے گنگنانا شروع کیا اور بسورنے لگے ڈاڑھیں مارنے اسی طرح واعظوں کے ساتھ بھی مجلس وعظ کے گرم کرنے کے لئے چند بنائے ہوئے مرید خاص ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب منبر پر تشریف رکھتے ہیں جیسے کوئی بادشاہ تخت سلطنت پر۔ اور ان میں سے کوئی پنکھا جھل رہا ہی۔ کوئی مگسرانی کر رہا ہی۔ کوئی سامنے مواد ب آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھا جھوم رہا ہی اور کبھی لال لال دیدے نکال کر بیچ بیچ میں موقع بے موقع سبحان اللہ بھی کہہ اُٹھتا ہی۔ ایک کے پاس اگالدان ہی۔ دوسرے کی

تحویل میں صراحی۔ تیسرے کی بغل میں (پہلے تو شبہ ہوا کوئی کتاب ہوگی پھر معلوم ہوا نہیں) حضرت کی نعلین ہیں۔ اور چوتھا اور ہی جو پس پشت منبر کے قریب حضرت کی جریب اس شان سے لئے کھڑا ہی جیسے ہارون عصائے موسیٰ۔ اگر وعظ میں لوگ کم آئے ہیں تو کچھ پروا کی بات نہیں گھر ہی کے برائی ہتیرے ہیں سلسلہ سخن تو منقطع ہوتا ہی مگر بسوریوں کے متعلق ایک مزے کی حکایت یاد آئی ہی بدون کہے رہا نہیں جاتا۔ جونپور میں ایک میر صاحب تھے تو زمین دار مگر اوپر تلے دو چار فصلیں بگڑیں سرکار نے اپنی باقی کھڑے کھڑے وصول کرلی۔ کاشت کاروں سے لگا ملا نہیں زمین دار کی آفات کیا ایسے ٹوٹے کہ پھر نہ پنپے۔ مرتا کیا نہ کرتا آدمی تھے خوش آواز مرثیہ خوانی اختیار کرلی۔ محرم کے محرم تعزیہ داروں سے کچھ مل ملا جاتا اسی میں اگلے برس تک تنگی ترشی سے گزر کرتے۔ قصبے میں اُن کی کچھ زمین تھی اس میں رعایا کے طور پر جولاہوں کو بسا رکھا تھا۔ میر صاحب نے دو چار جولاہوں کو گانٹھ کر بسوریا بتایا اور اُن کو پٹی پڑھادی کہ ساری ساری رات گھر میں پڑے پڑے کیا کرتے ہو میرے ساتھ مجلسوں میں چلا کرو جس وقت مجکو پڑھتا سنا رونے لگے، رونے والے کا حصہ دوہرا ہوتا ہی۔ زمین دار کے کہنے کا پاس۔ دوہرے حصے کا لالچ۔ جولاہے خوشی خوشی راضی ہوگئے میر صاحب کے ساتھ مجلسوں میں جا کر رونے اور چلانے اور مزے میں دوہرے دوہرے حصے باندھ کر لاتے۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ ایک مجلس میں پونچے میر صاحب کو تو ذاکر ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اندر بلا لیا بسوریئے جولاہے اور لوگوں کے ساتھ باہر صحن میں تھے۔ مجلس کے شروع ہونے میں کسی وجہ سے ہوئی دیر جولاہوں کو تھا ضبط کہاں، لگے آپس میں صلاحیں کرنے کہ آج یہ ماجرا کیا ہی؟ آخر ایک نے چاہا کہ خود میر صاحب سے جا کر پوچھے اُن تک پونہچنے کا موقع نہ تھا۔ کھڑے کھڑے اس کو خیال آیا کہ آج کہیں چپ چپاتی مجلس نہ ہو تو پکار کر میر صاحب سے پوچھتا ہی کہ میاں جی روؤں؟ باوجودے کہ عزاداری کی مجلس تھی اور بسوریوں کا ہونا بھی سبھی کو معلوم تھا بناوٹ کا رونا کہیں چھپ تھوڑا ہی سکتا ہی لیکن جولاہے کا روؤں سن کر سب اہل مجلس بے اختیار ہنس پڑے یہاں تک کہ میر صاحب بھی۔ انھوں نے شرمندگی اُتارنے کو اپنے ہم پیشوں سے اتنا تو کہا کہ جیسا میں عطائی مرثیہ خواں ویسے اناڑی رونے والے۔ غرض جس دن سے مولوی مستجاب نے مردوں میں وعظ کہنا شروع کیا اُن کے والد مولوی ناصح نے اسی طرح کے اپنے سدھائے ہوئے کئی گرگے اُن کے ساتھ کردیئے۔ مستجاب کے وعظ نا نہ ہونے سے پہلے

بھی سُست پڑ چکے تھے۔ گر گے بلا کے تاڑنے والے مولوی صاحب سے کہنا شروع کیا کہ نکاح کے بعد سے صاحب زادے کی طبیعت کچھ اچاٹ سی معلوم ہوتی ہے۔ ادھر مولوی ناصح نے خلافِ عادت گھر میں دوسرے تیسرے مستجاب کے لئے کھانا پکتے ہوئے بھی دیکھا کھٹکے اور بیٹے سے پوچھا کیوں صاحب یہ کیا طریقہ ہے؟ دکان جمانے کے تو یہ ڈھنگ نہیں۔ جامع مسجد اور جامع مسجد میں بھی بیچ کا در آج وعظ کے لئے معراج ہے۔ میں نے اپنی برسوں کی جمی جمائی بھرٹی تمہارے حوالے کی۔ چوں کہ بے زحمت تم کو مل گئی تم نے اُس کی یہ قدر کی کہ دو دو جمعے ندارد۔ اور جاتے بھی ہو تو کیا جاتے ہو میں تو جانتا ہوں اتنی دیر میں اطمینان کے ساتھ پاؤ رکوع کا ترجمہ بھی پورا نہیں ہوتا ہوگا۔ برخوردار اٹھارہ برس دو دو پہر برابر اسی جگہ وعظ کہا ہے۔ ذری کی ذری بیچ میں نمازِ عصر کے لئے دم لیا اور پھر وعظ۔ معمول تھا کہ رمضان میں سیپارہ شروع کیا اور اتنا گھسیٹا گھسیٹا کہ مارا مار کر کے اگلے رمضان تک ایک سیپارہ ہوتا تھا تمہارا وعظ کیا ہے لڑکوں کا پالا چھونا ہے۔ تم کون وقتوں کے آئے ہوئے ہو اور ابھی نمازِ عصر میں بڑی دیر پڑی ہے اتنے میں تم گئے بھی آئے بھی نماز بھی پڑھی وعظ بھی کہا کہیں طی اللسان کا عمل تو نہیں سیکھ لیا ہے میں دیکھتا ہوں کہ دعوت میں جانے سے بھی تم کچھ جان سی چراتے ہو۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی ناشکری کی بات ہوگی کہ خدا تم کو بے زحمت بے مشقت ایسی ایسی نعمتیں مفت کھانے کو دے اور تم یوں بے قدری سے اُن کو لات مارو۔ اس سے تم نے اپنے پندرہ بیس وقتوں کا نقصان کیا سو کیا خوف ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کا نقصان نہ کر بیٹھو۔ برخوردار لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنا آسان کام نہیں ہے اس کو چاہیئے محنت۔ استقلال۔ ضبط۔ استمالت۔ تالیفِ قلوب۔ تم نے ابھی سے وہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ اگر میں لوگوں سے تمہاری طرح بے اعتنائی کرنے لگوں تو تھوڑے ہی دنوں میں کوئی پاس آن کر نہ پھٹکے۔ اور تم تو کیا آدمی ہو کر پھر شدی۔ اب تم بچے نہیں رہے زمانے کے رنگ کو دیکھو وقت کی حالت پر نظر کرو کہ ہم مولویوں کو کیسی کیسی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ نصاریٰ کی عملداری کہ یہ لوگ کھُلم کھُلا تو کسی کے دین و مذہب سے تعرض کرتے نہیں۔ لیکن تعلیم کا ایسا ڈھنگ نکالا ہے کہ لوگوں کو خود بخود دین سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔ ظاہر میں کسی پر جبر نہیں زبردستی نہیں مگر اس سے زیادہ اور کیا جبر ہوگا کہ مدرسے کا امتحان پاس کئے بدوں کسی کو نوکری نہیں ملتی چار و نا چار مدرسے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اور اگرچہ مدرسے کی کتابوں میں کوئی بات خلافِ مذہب دیکھنے میں نہیں آئی

مگر خدا جانے کیا تاثیر ہے کہ مدرسے کا پڑھا ہوا اوّل تو مذہب پر قایم نہیں رہتا اور شاذ و نادر کوئی
رہا بھی تو قسم کھانے کی بات ہے کہ مولویوں کے بس کا نہیں رہتا جس کو دیکھو مولویوں سے بدگمان
مولویوں کے ساتھ خدا واسطے کی عداوت۔ مولویوں کی بیخ کنی پر آمادہ۔ تو اگر نظر غور سے دیکھو
سرکاری انتظام کا لب لباب یہ ہے کہ ہم مولوی روئے زمین کے پردے پر نہ رہنے پائیں لیکن
ع دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست ٭ سچ ہیں تو مولوی کسی قدر جھول سے بھی گئے تھے
ان پر وہابیت کے الزام لگا کر انگریزوں کو برہم کیا۔ انگریزی خواں مسلمانوں نے بہت سر اٹھایا
پادریوں نے بڑے زور مارے لیکن چاروں طرف سے حملے ہوتے ہوئے دیکھ کر خود بخود
لوگوں میں جوش مذہبی پیدا ہوا۔ تائید اسلام اور اعانت اسلام اور رعایت اسلام اور حمایت
اسلام کے نام سے جگہ جگہ انجمنیں قایم ہوئیں قصبوں اور شہروں شہروں انجمنوں کے واعظ
گشت اور دورے کرنے لگے۔ دفتر دفتر مذہبی مضامین اور لکچر اخباروں اور رسالوں میں چھپے
بچوں کے لیے مناسب وقت بہت سی کتابیں نئی نئی بن گئیں تا کہ دنیاوی معلومات کے ساتھ ساتھ
احکام دین سے بھی آگاہی ہوتی جائے۔ مبتدی لڑکے دین سے بے خبر مذہب سے ناواقف
جو دن بھر تاریخ اور جغرافیہ رٹیں۔ پہر پہر رات گئے تک حساب میں غلطاں پیچاں رہیں اور تمام عمر
تحصیل میں عقائد کی بھنک تک اُن کے کان میں نہ پڑے بے دین نہ ہوں تو تعجب لامذہب
نہ بنیں تو اچنبھا۔ یہ تمام چرچے جو تم دیکھتے ہو اور سنتے ہو ہم مولویوں کے حق میں فال نیک ہے۔
ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ایک بار پھر مولویوں کی قدر و قعت ہو اور ہو اور نہیں ہے تاہم
معاش کا کوئی اور ذریعہ اس سے بہتر نہیں۔ لوگ ان مدرسے والوں کی طرف سے بڑے ہی دھوکے
میں پڑے ہیں ایک عالم اس خبط میں گرفتار ہے کہ فارغ البالی بے نوکری کے ہونی ممکن
نہیں اور نوکری بے مدرسے کی تعلیم کے۔ ابھی ہمارے ان اضلاع میں تو نہیں لیکن مدراس
میں جہاں سب سے پرانی عمل داری ہے فی الواقع بعض بی اے خدمت گار بلکہ سائیس بھی
ہیں بمبئی کلکتہ میں انٹرنس پاس دس دس روپیہ کی نوکری کے لیے حیران سرگردان پڑے
پھرتے ہیں اور نہیں ملتی ہمارے یہاں مڈل جیسا بے قدر اور کس مپرس ہے غالباً تم بھی
جانتے ہوگے۔ اور تم کو کچھ ان کی زحمتوں کی بھی خبر ہے محنت کرتے کرتے مڈل سے اکثر مبہوت

ہو جاتے ہیں۔ انٹرنس والے وہی۔ بی اے ٹھری۔ ایم اے از کار رفتہ۔ مولویت ہیں بڑی خوبی تو یہی ہے۔ زحمت کم بلکہ سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں اور کام یابی متیقن۔ اگر آدمی اتنی بھی شدھ بدھ رکھتا ہو کہ اردو پڑھ سکے چاہے لکھنا بھی نہ جانتا ہو اس کو بھی اس پیشے میں روٹیوں کی کمی نہیں روٹیاں بھی جوار باجرے کی نہیں بلکہ شیرمال اور باقرخانی۔

مولوی ناصح تو بڑے پرانے مشاق واعظ تھے اور خود کہتے تھے کہ ایک سیپارے کو برس روز تک گھسیٹتا ہوں ایسے آدمی کو بولنے کے لئے ایک بہانہ کافی ہے اور جب بولنا شروع کیا تو پھر کہاں رکتا ہے۔ ناصح تو عشا تک بھی چپ نہ کرتے مگر اتنے میں موذن نے آواز دی کہ حضرت جماعت طیار ہے۔ ناصح نماز کے لئے تشریف لے گئے اور مستجاب نے تمام قصہ استانی کی استانی ہونے کی بیوی آزادی بیگم کے روبرو جا دہرایا۔ اور آج میاں بی بی کی گفتگو میں مولویت کا فیصلہ ہو گیا۔ آزادی نے شوہر کی تقریر سن کر کہا کہ مولوی صاحب نے کچھ بے جا بات تو نہیں کہی۔ اس میں شک نہیں کہ مدرسے کی پڑھائی میں محنت تو بڑی ہے۔ میری اماں جان کے ماموں زاد بھائی کو تم جانتے ہو جنہوں نے انگریزی میں امتحان دے کر کوئی بڑے سے بڑا خطاب حاصل کیا ہے۔ بدن پر بوٹی نہیں بارہ مہینے بیمار۔ کتاب دیکھتے دیکھتے دماغ اس قدر ضعیف ہو گیا ہے کہ ایک دن دردِ سر سے نجات نہیں۔ یہ عمر ہے کہ بڑے بھائی کے دانت ہیں مگر سر کے بال کھچڑی ہو گئے ہیں اور شاید دو تین ڈاڑھیں بھی ہلتی ہیں۔ نگاہ ایسی کمزور ہے کہ سوتے ہیں بھی عینک لگائے رہتے ہیں۔ ڈپٹیوں کی نوکری کے لئے شاید اور امتحان کی ضرورت ہے بے چارے کتاب نہیں دیکھ سکتے اس پر بھی دو سال برابر لاہور گئے دونوں دفعہ فیل۔ اور اور نوکریاں ملتی ہیں محنت یا کمی تنخواہ یا پردیس کی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ ناچار یہیں کے مدرسے میں چالیس پچاس کی نوکری کر لی ہے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر ہماری ننھیال کے لوگ ایسے ڈر سے گئے ہیں کہ اب وہاں کوئی مدرسے کا نام بھی نہیں لیتا۔ اور واقع میں ایسی تعلیم کو لے کر کیا چولھے میں ڈالنا ہے کہ آدمی اپنی جان کی جان ہلاک کرے اور انجام کار یہی چالیس پچاس۔ اتنا اور اس سے زیادہ تو مولوی سونے بیٹھتے کما لیتے ہیں۔ اور تمہاری آمدنی کا حساب لگایا جائے تو میں جانتی ہوں کہ اس قدر یا اس سے کچھ ہی کم تم کو بھی پڑتا ہو گا۔ اور ابھی کے دن ہوئے مستجاب یہ سب

سچ ہے مگر میں اس کمائی کو پسند نہیں کرتا جب سے میں نے تمہارے والد کے اعتراضات تمہاری زبان سے سُنے ہیں میرا دل اس پیشے سے کچھ ایسا گھٹا ہوا ہے کہ نہ تو مجھ سے وعظ کہا جاتا ہے اور نہ میرا جی دعوت میں جانے کو چاہتا ہے۔ لوگ تو ظاہر میں میری تعظیم کرتے ہیں اور میں اپنی نظروں میں آپ تھوڑا تھوڑا ہوا جاتا ہوں۔ آج کوئی پانچویں چھٹے دن کا مذکور ہے کہ میں والد کے ساتھ دعوت میں گیا۔ طالب العلموں کی بھی دعوت تھی۔ سب لوگوں نے کھانا کھایا۔ اور ہم دونوں باپ بیٹے معمول کے مطابق طالب العلموں میں کھڑے ٹہلتے رہے تو میں نے دیکھا کچھ لوگ صحن میں باہر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ہماری طرف کو دیکھتے جاتے ہیں میں نے کان لگا کر سنا تو ایک شخص کہہ رہا تھا کیا بے تمیزی کی بات ہے مولوی صاحب کی تو بات بھی نہ پوچھی طالب العلموں کو کھلانا شروع کر دیا۔ دوسرے نے جواب دیا بھائی تم کو معلوم نہیں مولوی لوگ دعوت میں کھانا نہیں کھایا کرتے۔ ان کا حصہ ان کے گھر جاتا ہے۔ یہ سُن کر جتنے بیٹھے تھے تابار بیرکن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی کی معاش اور کیا ہو گی۔ اگرچہ ہم کو نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ لوگ بھی ہماری تعظیم کو کھڑے ہوئے جو ہم پر ہنس رہے تھے۔ مگر تم سمجھ سکتی ہو کہ ایسی جھوٹی اور منافقانہ تعظیم سے کیا خاک خوشی ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک مولویت کے ذریعے سے معاش پیدا کرنا کسی طرح اور کسی پیرائے میں کیوں نہ ہو فی نفسہ بے عزتی کی بات ہے۔ مانگ کر لینا اور صورت سوال بنا کر لینا لینے کا نام لینا ہیں دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا۔ جو لوگ ہم کو دیتے ہیں وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں وہی دو ہاتھ دو پاؤں ان کے وہی دو ہاتھ دو پاؤں ہمارے۔ ہم کیوں کسی کے دست نگر ہوں کس لیئے اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالیں۔ آزادی یہی اعتراض تو ابا جان بھی کرتے تھے مگر اماں جان اس کا یہ جواب دیتیں کہ جس طرح اور نوکریاں ہیں اسی طرح کی نوکری مولوی گری بھی ہے۔ اور اَور کام نہ کیئے لوگوں کو دین کی تعلیم و تلقین کی۔ اگر نوکری میں بے عزتی نہیں پیشے میں بے عزتی نہیں محنت مزدوری میں بے عزتی نہیں تو مولویت میں کیوں ہونے لگی۔ مستجاب۔ یہ مولویوں کی من سمجھوتی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے اور خود مولویوں کو بھی معلوم ہے کہ مولویوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے صدقہ اور خیرات اور للّٰہ سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ سو میں اس عار کو گوارا نہیں کر سکتا۔ آزادی بے شک یہ سچ تو ہے مگر

پڑا ہو ورنہ پیشہ تو بڑا شریف تھا۔ مستجاب۔ شرافت علم میں تو کلام نہیں مگر اس پیشے میں دو بڑے
نقص ہیں اول ریاکاری کہ ایسی بُری بلا ہو کہ یوں بھی آدمی کو خیال آہی جاتا ہو اور مولویت
کے پیشے میں پڑ کر ریا سے بچنا ایسا ہی مشکل ہو جیسا کوئلوں کی دُکان میں رہنا اور مُونہ کو کالا
نہ ہونے دینا۔ دوسرے جب نظر پڑے گی دوسروں کے عیوب پر وعظ و نصیحت اور عیب
جوئی لازم و ملزوم ہیں۔ اور اس سے پیدا ہوتا ہو عُجب کہ آدمی اپنے تئیں بہتر اور برگزیدہ
سمجھنے لگتا ہو۔ پس شاید وہ دوسروں کے سنوارنے کی کوشش کرتا مگر آپ بگڑ جاتا ہے۔ میں
عالموں کی شان میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں کیا کروں میں اپنے نفس پر مطمئن نہیں ہوں
آزادی۔ لوگوں کو ہدایت ہوتی ہو۔ خدا کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہ راست
پر آتے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ثواب کا کام ہو۔ مستجاب۔ سچ ہو مگر میرے نفس کا بھی مجھ پر حق ہو جس
کی مجھ سے باز پرس ہوتی ہو۔ وہی وقت جو دوسروں کی اصلاح میں صرف کرتا ہوں اپنی ہی
درستی میں کیوں نہ صرف کروں۔ اور اگر میں اس کام کو کار ثواب سمجھ کر کروں تو سبحان اللہ
بڑی عمدہ بات ہو مگر اس کا وہی مطلب ہو کہ اس کو ذریعہ معاش نہ ٹھہراؤں پیشہ نہ بناؤں
آزادی۔ تم نے اپنے یہ خیالات مولوی صاحب پر بھی ظاہر کئے۔ مستجاب۔ مولوی صاحب نے مجکو بات
کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُنہوں نے جو کہنا شروع کیا بس ایک تار باندھ دیا۔ اتنے میں
نماز کے لیے طلبی آئی سیدھے اُٹھ کر چلے گئے۔ آزادی۔ اُن کو یہ شبہہ ہوگا کہ تم سے محنت نہیں
ہو سکتی بلکہ تمہارے ساتھ مجکو بھی سمیٹ لیں تو تعجب نہیں۔ مستجاب۔ جو خیال بے اصل محض
ہو وہ دو دن تک ٹھہر نہیں سکتا میری بعد کی کارروائی اُن کو ضرور متنبہ کر دیگی کہ ان کا خیال
غلط تھا۔ آزادی۔ متنبہ کر دے گی یا اور اس خیال کو جما دے گی۔ دن رات گھر میں رہو گے
آتے جاتے دیکھیں گے تو ضرور جی میں کہیں گے کہ بس گھر میں پڑے رہنے کے مزے ہیں
اور میں تم سے بات کہوں صاف اگر اُن کو ہمارا خرچ بھی گراں گذرنے لگے تو تعجب نہیں یا باپ
پر بار ڈالنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہو۔ پس اگر تم نے مولویت کا ترک کرنا ٹھان لیا ہو تو یہ بھی سمجھ لینا
کہ مولوی صاحب ہمارے روادار ہونے والے نہیں۔ اور یہ کوئی الزام کی بات بھی نہیں۔ آخر تا بکے
مستجاب۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ اور تم اتنا سوچو کہ میں جو مولویت سے گریز کرتا ہوں تو کیوں۔ صرف اس درجہ

سے کہ طبیعت لوگوں کے احسان کی متحمل نہیں پس والد کا یہ احسان میں کب گوارا کر سکتا ہوں کہ وہ میرے مصارف کے متکفل ہوں خصوصاً اس حالت میں کہ انہوں نے میرا بیاہ کر دیا۔ اپنے خیال کے مطابق مجکو روٹی کما کھانے کا ہنر سکھا دیا۔ اور سچ پوچھو تو روٹی کے حیلے سے لگا دیا اب اگر اُس حیلے سے میں روٹی کمانی نہ چاہوں تو یہ میرا قصور ہی نہ اُن کا جس وقت سے میرے دل میں اس پیشے کی طرف سے کراہیت پیدا ہوئی اُسی وقت سے میں نے علیحدگی ٹھان لی۔ اور اتنے دنوں بھی تامل کیا تو تمہاری وجہ سے کہ دیکھوں تمہاری کیا رائے ہی۔ مالک مطبع محمدی سے اور مجھ سے پُرانی ملاقات ہی معرفت کے درجے سے بڑھی ہوئی اور مجکو معلوم ہی کہ بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں اپنی کتابیں اسی مطبع میں چھپواتے ہیں اور وہاں تحشیہ اور تصحیح کے لیئے ایک عربی داں آدمی کی ضرورت ہی۔ بالفعل تیس روپے تنخواہ ہی مگر بتدریج پچاس تک ترقی ہو سکتی ہی۔ میں اپنے پندار میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہوں ہر طرح کی کتابیں نظر سے گزرتی رہیں گی میری استعداد بھی بڑھے گی۔ اگر تمہاری صلاح ہو تو میں یہ نوکری کر لوں انتظام خانہ داری کو تم سوچ سمجھ لو۔ آزادی۔ ایسی کونسی لمبی چوڑی خانہ داری ہی۔ جس کے انتظام میں دقت ہو گی اس کا تم خیال بھی نہ کرنا۔ رہی نوکری ظاہر حال ہر طرح پر عمدہ ہی کام بھی تمہاری طبیعت کے مناسب ہی ایک بڑی سرکار کے توسل کا ذریعہ ہی آئندہ کی ترقی کے لحاظ سے تنخواہ بھی کچھ ایسی تھوڑی نہیں۔ صرف اتنی بات ہی کہ ایک دوست کی ماتحتی ہی دوستی میں برابری کا داعیہ ہوتا ہی نوکری میں وہ داعیہ قایم نہیں رہ سکتا۔ مستجاب۔ وہ کام جو مجکو کرنا پڑے گا اُس میں مالک مطبع کو کچھ دخل نہیں اُن کی ماتحتی صرف برائے نام ہی۔ اصلی تعلق تو نواب صاحب سے رہے گا اور اگر ایک دوست کی ماتحتی ہو بھی تو اُس سے بدرجہا بہتر ہی کہ ایک ایک دو دو پیسے یا ایک ایک دو دو وقت کے کھانے کے لیئے ہر کس و ناکس کا احسان مند ہونا پڑے۔ آزادی ایک خیال مولوی صاحب کی نارضامندی کا بھی ہی۔ تمہاری نوکری شاید اُن کے مزاج کے خلاف ہو۔ مستجاب۔ شاید کیا معنی ہی؟ نوکری یقیناً اُن کو ناپسند ہو گی مگر مجبوری ہی۔ اپنے لیئے ذریعہ معاش کا متعین کرنا میرا کام ہی البتہ اس قدر ضرور ہی کہ خلاف شرع نہ ہو اور خاندانی تعزز کو بٹہ نہ لگے سو ان دونوں میں سے کوئی سی بات بھی نہیں۔ اور پھر باپ کی نارضامندی کیا؟

دو چار دن ناخوش رہ کر آپ ہی مہربان ہو جائیں گے۔ اور جب اُن کو میری وجوہ معلوم ہوں گی تو عجب نہیں دل میں قائل بھی ہوں۔

آٹھویں فصل مولوی متجاب نوکر ہو کر بھوپال گئے۔ نوکری کی کیفیت

الغرض متجاب نے مطبع کی نوکری کر لی اور چونکہ باپ کے حکم کی نہیں بلکہ اُن کی رائے کے خلاف کی تھی اُس کو ایسی اچھی طرح بنا ہا جو نبا ہنے کا حق تھا۔ اور چھ مہینے نہ گزرنے پائے تھے کہ مولوی صاحب کے پاس ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ نواب صاحب گویا ڈھانچ بنا کر کھڑا کر دیتے اور مولوی متجاب تحشیے[ل] سے اُس میں جان ڈالتے نواب صاحب کی کتنی کتابیں ایسی دیکھنے میں آئیں کہ مولوی متجاب کی تقریظ لب لباب اور نفس کتاب بھوک حواشی دلچسپ ہیں اور متن خیر۔ مولوی متجاب کی نوکری کے تیسرے برس نواب صاحب نے ایک بڑے معرکے کی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اور چاہا جتنے بڑے بڑے مسائل ہیں جیسے تقلید۔ امامت۔ رفع یدین۔ آمین بالجہر۔ طریقۂ صوفیہ۔ بیعت۔ جہاد۔ ربوا۔ تشبہ بالنصاریٰ موالۃ بالنصاریٰ اولوا الامر وغیرہ وغیرہ کوئی اس کتاب سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور یہ کتاب ایسی جامع ہو کہ چودھویں صدی کے مسلمانوں کو اس کے ہوتے کسی اور دوسری کتاب کی حاجت باقی نہ رہے۔ یہ اتنا بڑا قصد تھا کہ اکیلے نواب صاحب سے اس کتاب کی تکمیل ذرمی دشواری تھی اور مولوی متجاب سے بہتر مددگار کا ملنا اس سے زیادہ دشوار۔ آخر مولوی صاحب کی طلبی کا تار آیا اور تار کے ساتھ اور اور بعد کو خط میں تفصیل لکھی آئی کہ تمہارے بلانے سے یہ غرض ہے۔ سو روپیہ تنخواہ۔ کھانا اور رہنا سرکار کے ساتھ کئی شخصوں نے بھوپال سے یہ بھی لکھا اور کچھ دیکھ سمجھ کر ہی لکھا ہو گا کہ سرکار تمہاری پرداخت کی طرف اس قدر ملتفت ہیں کہ عجب نہیں آنے کے ساتھ قاضی القضات کی خدمت پر مامور فرماویں۔ اور یہاں خاص خاص لوگوں کی بھی رائے ہے یہ سب ترغیبات ایک طرف تھیں اور دلی کی مفارقت ایک طرف۔ مولوی متجاب انکار کرنے ہی کو تھے کہ لوگوں نے سمجھایا کہ یہاں سے دھر بھوپال تک ریل ہے صرف ایک شبانہ روز کا سفر۔ سلمان کی عملداری بیسیہ

[ل] تحشیہ۔ حاشیہ پر چڑھانا ۱۲

کا شوہر سیاہ سفید کا مختارِ کل یوں یا آرزو بلائے اور جانے میں تامل کیا جائے اپنی سمجھ میں تو نہیں
آتا۔ ایسے مواقع ہمیشہ نہیں ملتے۔ تنہائی کا خیال ہی تو گھر کے لوگوں کو ساتھ لیتے جائیے۔ یا وہاں
کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بلوا بھیجیے۔ کیا معلوم آپ کی ذات سے کس کس کو نفع پہنچوانا منظور ہی کہ
خدا نے اپنی قدرت سے یہ سامان کیا ہی۔ جائیے اور بے تامل جائیے اور ضرور جائیے اور جلد جائیے ساری دنیا
اگر جائیے جائیے کرتی تو مولوی مستجاب گھر سے نکلنے کی ہامی نہ بھرتے۔ مگر بی بی سے صلاح لی اور اُن
کے لیے اصل میں اُسی کی صلاح صلاح بھی تھی تو آزادی نے کہا کہ میں اندرونِ دل سے تو رضامند
نہیں ہوں مگر کیا مرد کیا عورت۔ کیا اپنے کیا بیگانے سبھی نے تو میری جان کھا لی ہی کہ ہمیں بھیج
بھی چکو میں نہیں جانتی لوگوں کو ایسی کاہے کی جلدی ہی؟ اور تم جانے کے ساتھ ساری دلّی کو جیسے
کیا بھاگ لگا دوگے کہ جو آتا ہی یہی پوچھتا ہوا آتا ہی۔ ابھی گئے نہیں؟ اجی گھر سے کب سدھاریں
گے کہیں خدا نہ کرے منع تو نہیں کرا بھیجا؟ جانے کی صلاح پکّی تو ہی؟ پھر اب ہفتے کو یا جمعرات کو؟
ایسی حالت میں کہ جب ساری دُنیا ایک زبان جاؤ جاؤ بول رہی ہی۔ میں اکیلی سب کے خلاف
کیوں کر کہوں کہ نہ جاؤ؟ ابھی تک اوروں کی تو کیا کہوں خود مولوی صاحب اور اباجان سب
کو یہی شبہہ ہی کہ میں نے کہہ کر وعظ چھیڑا یا میں نے کہہ کہہ کر نوکری کرائی۔ بارے شکر ہی کہ نوکری
میں کوئی اتفاق بد پیش نہیں آیا ورنہ لوگ تو مارے طعنوں کے میرا جینا دشوار کر دیتے
نہ صاحب دل پر تمہارے جانے کا جیسا کچھ صدمہ ہی سو ہی ہی پر تو اپنے مُنہ سے کوئی ایسا لفظ نکال
نہیں سکتی کہ کل کلاں کو قسم کھانے کی جگہ نہ رہے۔ اور میں خوب سمجھتی ہوں کہ تم سے بھی رکا نہیں
جائے گا۔ موقع ہی ایسا آ کر پڑا ہی۔ جاؤ اللہ بیلی خدا کو سونپا۔ خدا حافظ و ناصر ہی۔ میں نے میاں
بی بی کے حقوق کتابوں میں پڑھے اور وعظوں میں سنے ہیں۔ میرا تو لے دے کر تم پر ایک ہی
حق مہر ہی اور بس سو میں تو پکارے کہتی ہوں کہ میں نے اپنا حق مہر خوشی اور رضامندی سے تم کو
معاف کیا لیکن تمہارے مجھ پر بہت سے حقوق ہیں ایسے کہ کسی بندے کے کسی بندے پر نہیں ہیں اور
میں خوب جانتی ہوں کہ میں تمہارے حقوق کی ضرور دین دار ہوں پس اپنے میکے میں جا کر تمہاری غیبتیں
کی ہوں گی اور کون سی عورت ہی جو نہیں کرتی؟ کسی بات میں قصور شاید تمہاری نافہمی کا ہو اور میں نے

۱؎ مولوی مستجاب کے والدین مراد ہیں ۱۲

تمہاری طرف گمان بد کرلیا۔ شاید میں نے کوئی بے جا فرمایش کی اور تم اُس کو پورا نہ کرسکے اور میں ناحق ناخوش ہوئی۔ تم نے کوئی چیز لا کردی اور میں شکر گزار نہ ہوئی۔ تمہاری خدمت کے بجالانے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ ایک وقت تمہارا حکم نہ مانا۔ تمہارا ادب نہ کیا۔ ایسی ایسی سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں۔ غرض میں تو بال بال تمہاری گنہگار ہوں اور اِس وقت ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ للّٰہ مجھ کو معاف کرنا۔ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ کیا معلوم اب کے بچھڑے ہم پھر بھی اِس دنیا میں ملیں گے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو میں تمہارے پیچھے مر جاؤں اور تمہارے حقوق میری گردن پر رہیں۔ معاف کیا؟ مُونہ سے کہو کہ معاف کیا اور دل سے معاف کیا۔ آزادی نے جو ایسے دردناک طور پر رخصت کی تقریر کی مولوی مُستجاب سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ روئے اور اِس قدر روئے کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ اُدھر آزادی کی یہ کیفیت تھی کہ ہنیتیرا مونہ کو بھینچتی جی کو تسلی دیتی اور خیال کو دوسری طرف مصروف کرتی ہو اُٹھ کر پانی بھی پیا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی ہو بیٹھی مگر طبیعت ہو کہ کسی طرح قابو میں نہیں آتی اور چیخ ہو کہ بے اختیار نکل نکل جاتی ہو۔ آخر بڑی دیر بعد مولوی مُستجاب ہی سنبھلے اور لگے کہنے تم اس قدر بے قرار کیوں ہوتی ہو میں تو تم کو ساتھ لے چلتا مگر پھر ابھی ٹھہرا اور ہر چند نواب صاحب سے خط و کتابت بہت کچھ ہو لیکن کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔ اُنھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجکو اُن کی خدمت میں نیاز نہیں۔ ان شاء اللّٰہ تعالیٰ جانے کے ساتھ مکان وغیرہ کا ٹھیک ٹھاک کرکے تم کو بُلواتا ہوں۔ آخر نوکری سے پہلے ہفتے ہفتے دو دو ہفتے وعظ کی تقریب سے میں دیہات میں رہتا ہی تھا تم سمجھنا اب بھی وعظ کو گیا ہو۔ اور اگر خدا نخواستہ تمہارے بُلانے کا موقع نہ ہوا تو آٹھویں دن مجھ کو یہیں کھڑا ہوا دیکھنا کیسی نوکری اور کہاں کی چاکری؟ اگر وہ مجکو ریاست بھوپال بھی دیں گے تو میں ٹھہرنے والا نہیں۔ آزادی۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم اطمینان سے بیٹھ کر مجکو ضرور بُلاؤ گے اور میں یہاں رہ کر بھی کیا کروں گی؟ اُدھر تم سدھارے اور میں نے چیز بست کو سمیٹنا شروع کیا۔ اسباب باندھا اور چلنے کی طیاری کی۔ لیکن خدا جانے اس وقت کچھ ایسا ہی خیال آگیا کہ طبیعت بے قرار سی ہو گئی۔ اور چونکہ مجھے روتا ہوا دیکھ کر تمہارا بھی جی بھر آیا تو میں اب نہیں رؤوں گی۔ تم بھی ہنسی خوشی سدھارو جس طرح پیٹھ دکھائے جاتے ہو خدا وہ دن کرے کہ اسی طرح

لوٹ کر مونہ دکھاؤ۔ کہنے کو کہہ دیا تھا کہ اب میں نہیں روؤں گی مگر جوں مستجاب نے چلتے ہوئے استودعکم اللہ[1]۔ کہا آخری سلام کیا اور دعائے رخصت پڑھی۔ اللّٰھم وجہنی الی الخیر اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی المال والاہل[2]۔ آزادی کی تو پھر وہی کیفیت ہو گئی بلکہ اُس سے بدتر۔ پیچھے پیچھے دروازے تک لگی چلی گئی۔ گلی کے نکڑ تک کھڑی دیکھا کی۔ اور لوٹ کر گھر میں آئی تو فرش پر اوندھے مُونہ گر پڑی۔ وہ خود نہیں سمجھتی تھی کہ اس کا دل آپ ہی آپ اندر سے اس قدر کیوں اُمڈا چلا آتا ہے۔ اور محبت کا قاعدہ بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا کہ چپکے چپکے دل میں جگہ کرتی جاتی ہے اور انسان کو اپنی شیفتگی اور فریفتگی اور گرویدگی کا شعور نہیں ہوتا اس سے پہلے آزادی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کو مستجاب کے ساتھ ایسا قوی تعلق ہے۔ میاں بی بی راضی خوشی ایک جگہ رہتے تھے۔ اتنی مدت میں کبھی کسی بات پر جھگڑا یا تکرار ہوا ہی نہیں۔ اس کو ہمہ وقت اس کی رضا جوئی منظور۔ اُس کو اس کی خاطر داری ملحوظ۔ یہ اُس کی مداح۔ وہ اس کا ثنا خواں۔ مُونہ پر کم اور پیٹھ پیچھے زیادہ۔ یہ اُس کو دیکھ کر نہال وہ اس سے مل کر باغ باغ علیحدگی ہوئی تو جانا کہ نرے میاں بی بی نہ تھے بلکہ لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک دوسرے کے عاشق زار جدائی پیش آئی تو معلوم ہوا کہ صرف زن و شوہر نہ تھے بلکہ شیریں فرہاد کی مانند یہ اُس پر قربان وہ اس پر نثار۔ ہم جتنے دنیادار ہیں ایسی ہی غلطی میں مبتلا اور اسی طرح کے دھوکے میں گرفتار ہیں۔ دنیا میں رہ کر طرح طرح کے تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم نے اُن کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ انواع و اقسام کے بکھیڑے اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ ناحق کا بوجھ ہم نے اپنے سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ شاموں شام مولوی مستجاب روانہ ہوئے۔ آزادی نے اُس رات نہ کچھ کھایا نہ پیا کچھ روئی کچھ سوئی۔ صبح اُٹھی تو لگی جی ہی جی میں حساب کرنے کہ بس اب دن بھر کا واسطہ اَور ہے۔ خدا خیر رکھے تو عصر کی نماز بھوپال میں پڑھیں گے۔ اُترنے کے ساتھ ایک روپئے کا تار دیں گے۔ ان شاء اللہ میں مغرب کی نماز پڑھ چکی ہوں گی یا پڑھ رہی ہوں گی کہ رسید آجائے گی۔ کیا بھول ہوئی ہے میں نے آج روزہ نہ رکھ لیا شام کا انتظار یوں بھی کرنا پڑیگا

[1] میں تم کو خدا کے حوالے کرتا ہوں ١٢ [2] اے خدا مجکو بہتری کی طرف متوجہ کر۔ اے خدا تو سفر کا ساتھی اور مال اور اہل و عیال میں خلیفہ اور جانشین ہے ١٢

اور دوں بھی کرنا پڑتا۔ خدا نے سچ فرمایا ہی۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً۔ انسان بڑا ہی جلد باز ہی۔
آزادی نے صبح سے شام منانی شروع کی اور وہ دن اُس کے لیئے ایک پہاڑ ہو گیا کہ کسی طرح
کٹتا ہی نہ تھا۔ آج اس کو دنیا کے سارے معمولات بدلے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ اپنی دھن میں تو یہ سمجھتی
نہ تھی کہ آپ غلطی کرتی ہی لوگوں کو تعین وقت میں غلطی کا ملزم ٹھیراتی تھی وہ ایک دفعہ گھر کی ماماؤں
سے بگڑ کر بولی کہ تم کو اتنا خیال نہیں کہ رات سے پچھلی تک میرے مونہ میں اُڑ کر نہیں گئی اور تم فراغت
سے بیٹھی رٹل فافیئے ہانک رہی ہو۔ کون وقتوں کی صبح ہوئی ہی؟ کسی کو بھی ہنڈیا چولھے کا
فکر ہی۔ ابھی تو رمضان میں بہت دن پڑے ہیں۔ مامائیں یہ سن کر سٹ پٹا سی گئیں اور ایک
برقع سر پر ڈال گوشت ترکاری یعنی بازار دوڑی گئی اور الٹے پاؤں پھر آئی کہ اس سرے سے
اس سرے تک کسی کی دکان نہیں کھلی۔ نماز ظہر کے لیئے اُس نے کئی بار مسجد میں پچھوایا کہ کہیں
موذن سو تو نہیں گیا۔ آزادی کو تو جلدی کرنے کی خیر ایک خاص وجہ بھی تھی کہ وہ میاں کے
پہنچنے کے تار کی منتظر تھی اُس کا انتظار بھی واجب۔ اور اس کی جلدی بھی حق بجانب مگر نہیں
آدمی کی کچھ خلقت بھی اسی طرح کی واقع ہوئی ہی کہ وہ ہر ایک کام کو چاہتا ہی کہ اترسوں کا
ہوتا پرسوں اور پرسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج اور آج کا ہوتا ابھی اسی دم ہو جائے
طالب العلم اس فکر میں ہی کہ کب تحصیل سے فارغ ہو اور فضیلت کی پگڑی میرے سر پر بندھے
ڈل والا انٹرنس کے لیئے مستعجل ہی۔ انٹرنس والا ایف اے کے لیئے جلدی مچا رہا ہی۔ نوجوان
آدمی کہتا ہی کہ کب بڑا ہوں کب بیاہا جاؤں۔ سر پہ بال رکھوائے ہیں اور دن میں کئی کئی بار
چٹکی میں پکڑ پکڑ کر دیکھتا ہی کہ کتنے بڑھے۔ سوداگر مال کی نکاسی کے لیئے بے چین ہی۔ ساہوکار
سود کی قسط کے لیئے بے قرار۔ غرض حضرت انسان بھی عجیب مخلوق ہیں۔ جن چیزوں کا ہونا ممکن
ہی اُن کو چاہتا ہی کہ ہوں۔ اور جس کا ہونا متیقن ہی اس کی طرف سے مطمئن ہی کہ گویا نہیں ہوگی
یعنی موت۔ اسی مطلب کو اسد اللہ خاں غالب نے کیا ہی عمدہ طور پر ادا کیا ہی ؎

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے ✦ اس کو چاہوں کہ نہ آئے تو بلائے نہ بنے

آزادی کا اضطراب اور اضطرار دیکھ دیکھ کر ہم کو یہ خیال آتا تھا کہ جہاں ریل نہیں تار نہیں وہاں
کے لوگوں میں پیار اخلاص نہ ہوتا ہوگا۔ اور پیار اخلاص ہوتا ہی تو اُن کو سفر پیش نہیں آتا ہوگا

اور سفر پیش آتا ہے تو آزادی جیسے لوگ زندہ نہ رہتے ہوں گے۔ بھلا ہوا کہ اُدھر مغرب کی اذان
ہو رہی تھی ادھر خیریت سے پہنچنے کا تار آ گیا کہ آزادی نے اطمینان سے نماز پڑھی۔ تیسرے
دن سے لگاتار خط آنے شروع ہوئے۔ ہر روز ایک تو ضرور اور کبھی دو بھی۔ مولوی مستجاب
نے لکھا کہ نواب صاحب نے مجھکو اس قدر عزت و توقیر سے لیا کہ اس کا عشر عشیر بھی میرے
خیال میں نہ تھا۔ مجھکو اپنے آرام گاہ خاص میں ٹھیرایا اور گفتگو اور نشست و برخاست میں
میرے ساتھ مدارات بالمساوات کی جاتی ہے۔ اور چونکہ نواب صاحب خود بہت بڑے عالم اور علم
دوست ہیں مولوی اس کثرت سے جمع ہیں کہ صرف مولوی ہونا یہاں کوئی امتیاز کی بات نہیں
یہ حکایت واقعی ہے کہ کسی ایجنٹ نے ایک پارسی کو اپنا دباؤ ڈال کر کسی عدالت کا ناظم مقرر
کرا دیا۔ اُس کے اجلاس کا پہلا روبکار جو نواب صاحب کی بستی میں آیا تو اس کے نام کے ساتھ مولوی
کا خطاب تھا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ روبکار نویس ایک ناواقف اور بداستعداد سا آدمی ہے
اس نے دیکھا کہ جتنے عہدہ دار اور ناظم ہیں سب مولوی لکھے جاتے ہیں بلکہ بڑی تنخواہ کے عملے
بھی سمجھا کہ مولوی منصبی خطاب ہے لازمۂ خدمت۔ بیچارے نے پارسی ناظم کو بھی مولوی لکھ دیا۔ بہت
دنوں تک لوگوں میں اس کی ہنسی رہی اور ہنسی کی بات بھی تھی۔ کیونکہ پارسی مذہب کے اعتبار سے
اصل میں تو بت پرست ہیں مگر ہندویت لیے ہوئے اور وضع اور طرز تمدن کے لحاظ سے انگریز۔
ایک ظریف نے اُن کی شان میں بالکل ٹھیک کہا کہ اگر پارسی میں سے انگریزیت کو تفریق کریں تو
جو باقی بچے گا وہ ہندو ہو گا۔ بہر کیف پارسی کا ظاہر انگریزوں سے ملتا ہوا ہے اور باطن ہندوؤں سے۔
اُس کو مولویت سے جو مسلمانوں کا مذہبی خطاب ہے کیا مناسبت ہے لیکن جب میں نے سنا کہ انگریزی سرکار
پارسیوں کو ہمیشہ سے خان بہادر کا خطاب دیتی چلی آئی اور جب سے شمس العلماء کا خطاب ایجاد ہوا کئی
پارسی شمس العلما بنا دیے گئے تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ روبکار نویس کا مولوی انگریزوں کے
شمس العلما سے زیادہ بے جوڑ نہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں مولوی نہیں ہوں مگر لوگ مجھکو بھی مولوی
کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہیں نہیں بلکہ تمہاری دلّی میں بھی۔ مجھکو یہ بات کہنی زیبا نہیں مگر کیا کروں
میرا اصلی خیال یہ ہے کہ مولویوں کا اتنا اژدحام اندیشے کا محل ہے اور خطر کا مقام۔ نتیجۂ عاجل تو یہ ہے کہ انتظام
میں تعصب کا رنگ جھلکتا ہے۔ خدا کرے نواب صاحب نے مجھکو بلایا تو اسی غرض سے ہے کہ تصنیف

و تالیف میں اُن کی پیش دستی کروں۔ مگر کسی وقت وہ ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
کہ کچہری کی کسی خدمت پر مامور کردیں تو عجب نہیں۔ سر دست کوئی معزز نوکری تو خالی سُنی نہیں
گئی۔ لیکن اگر ان کو میری پرداخت منظور ہوگی تو میرے لیئے نئے عہدے کا تجویز کرلینا کتاب کے
تصنیف کرنے سے بہت زیادہ آسان ہے۔ لوگ ایسی بہت سی مثالیں بیان کرتے ہیں کہ اول تنخواہ
نامزد ہوگئی اور پھر معمولی خدمتوں میں گنجایش نہ ہوئی تو کوئی خاص کام تجویز کردیا گیا۔ یہاں
کام سے چنداں بحث نہیں ہے جس کی جو تنخواہ مقرر ہوجاتی ہے جاری رہتی ہے کام ہو یا نہ ہو۔ مگر میں
نکمّا بیٹھا ہوا گھبراتا ہوں۔ یا تو کہہ سُن کر کوئی کام لوں گا یا یہاں کے دستور کے مطابق تنخواہ سے
کام رکھوں گا لیکن جب تک ان میں سے کوئی ایک شق متعین ہو تمہارا بلانا مصلحت نہیں سمجھتا
بلکہ موقع پاکر نواب صاحب کے گوش گزار بھی کردوں گا۔ اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گزر گئے نہ تو
کتاب ہی شروع ہوئی اور نہ کچہری کا کوئی کام ملا۔ دونوں وقت مزے میں سرکار کے ساتھ کھوئیاں
کرو۔ علی الحساب تنخواہ لو۔ اور نکمے پڑے انڈا کرو۔ مستجاب کہتے کہتے ملول ہوگیا۔ آزادی انتظار
کھینچتے کھینچتے اُکتا گئی۔ پر نواب صاحب وعدہ کرتے کرتے نہ تھکے۔ جب عرض کیا ان شاء اللہ
کل۔ جب یاد دلایا خدا نے چاہا پرسوں * غریب مستجاب کیا جانے بیچاری آزادی کو کیا معلوم کہ
ہندوستانی سرکاروں میں فردائے قیامت کو کل۔ اور برسوں کو پرسوں کہتے ہیں۔ تنخواہ کی ترقی
اور مصاحبت اور آیندہ کی توقعات سے مستجاب اور آزادی اور دوسرے علاقہ داروں اور خواہی
نخواہی زبردستی کے امیدواروں کو مسرت پہنچی تھی روز کی ٹال مٹول آئے دن کی وعدہ خلافی سے
مبدل بناخوشی ہوگئی۔ توقع کی جگہ ناامیدی پیدا ہوئی اور شکرگزاری کے عوض شکایت۔ بات
یہ تھی کہ نواب صاحب بڑے عالم۔ بڑے لایق۔ بڑے تجربہ کار۔ بڑے مدبّر۔ بڑے منتظم سب کچھ تھے
اور اختیارات بھی اُن کے اس قدر وسیع کہ گویا خود رئیس مستقل بالذات ہیں لیکن ریاست کی افتاد
آج سے نہیں بلکہ شروع سے کچھ ایسی بگڑی ہوئی تھی کہ کسی تدبیر سے انتظام درست بیٹھتا ہی نہ تھا
سیکڑوں سازشیں ہزاروں گھاتیں۔ جتنے مُونہ اُتنی باتیں۔ خدا جانے ان صحبتوں کا اثر تھا
یا نواب صاحب کی طبیعت ہی اسی طرح کی واقع ہوئی تھی کہ چاہتے اور نہ کر سکتے؟ ارادہ کرتے اور
رُک جاتے مزاج پر اس قدر وہم غالب ہوگیا تھا کہ ہر چیز میں شک ہر بات میں شبہہ۔ شاک ثم انہ شاک

نی انہ شاک مستجاب یہ رنگ دیکھ کر بہت ہی شادی ہوا۔ مگر آ پھنسا تھا نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن
اس نے آزادی کو وہاں کے حالات لکھے تو سہی مگر دبی زبان سے کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ پوست
کندہ لکھوں گا تو سوائے اس کے کہ وہ وزارت کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھے اور کیا ہونا ہے۔ نوکری
اور تنخواہ اور تقرب کسی چیز کی وقعت تو دل میں باقی رہی نہ تھی مگر مشکل یہ آ کر پڑی تھی کہ جا بھی
نہیں سکتا۔ آمدن بارادت رفتن باجازت۔ اجازت لے تو کیا کہہ کر لے۔

نویں فصل مولوی مستجاب نے بھوپال میں انتقال کیا۔ آزادی کی ہو گئی

مستجاب کو آئے ہوئے دسواں مہینہ تھا کہ شروع شعبان سے ریاست میں رمضان کی طیاریاں
ہونے لگیں معلوم ہوا کہ رمضان بھر کل دفاتر بند رہیں گے۔ اور جتنے ملازم باہر کے ہیں سب کو
عام اجازت دی جائے گی جس کا جی چاہے رمضان اپنے گھر جا کر کرے۔ رہائی کے لیئے قیدیوں
کی فہرست مرتب ہوئی کہ بیس بیس پچیس پچیس پچپن ہر روز بوقت افطار چھوڑے جائیں اور جو باقی
بچیں اُدھر صدقۃ الفطر تقسیم ہو اور ادھر بندی آزاد۔ یہ سن کر مستجاب کی جان میں جان آئی کہ لو اب
خدا نے نجات دی۔ پھر اُس کو شک ہوا اور نواب صاحب کے مصاحب کو کیا اتنا بھی شک نہ ہوتا
کہ کہیں ملازم سے اہل خدمات مراد نہ ہوں۔ مجھ سے تو کوئی خدمت متعلق نہیں۔ چاہا کہ لفظ ملازم کی
تحقیق میں ایک رسالہ لکھ کر نواب صاحب کے ملاحظے میں گزرانے اور عقلی دلیلوں اور نقلی روایتوں سے
ثابت کرے کہ اطلاق ملازم کے لیئے اہل خدمت ہونا شرط نہیں مگر پھر کیا خیال آیا کہ کیوں اتنا درد سر کیا
غرض اصلی تو مخلصی ہے اور وہ قیدیوں کی فہرست میں نام لکھوا دینے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ قیدیوں کی
فہرست میں مولوی مستجاب کا نام دیکھ کر نواب صاحب چونکتے اور متنبہ تو ضرور ہوتے مگر اس سے فائدہ ہی
کیا تھا؟ اُن کا جو طریقہ تھا طبعی تھا اور مجبوری سے تھا تو بہر حال تھا اضطراری لیکن اس کی نوبت ہی
نہیں آئی۔ خود نواب صاحب نے ایک دن مستجاب سے پوچھا کہیئے مولوی صاحب رمضان کہاں کرنے کا
ارادہ ہے؟ مستجاب کے دل میں تو آئی کہ جس طرح ہر بات کا گول مول جواب دینے کی عادت نواب صاحب کی
ہے میں بھی ایسا ہی مبہم جواب دوں کہ کم سے کم غرۂ شوال تک میرا رہنا اور جانا متحقق نہ ہو۔ مگر اس کو تو
گھر کی لو لگی تھی بے ساختہ بول اُٹھا۔ اَلرَّمَضَانُ فِی الْاَوْطَانِ مَعَ الْاَہْلِ وَالْخُلَّانِ [لے] مستجاب نے فوراً گھر خط لکھا

[لے] رمضان بال بچوں اور دوستوں کے ساتھ وطن میں ۱۲

اور لوگوں نے مستجاب کا آنا سُن کر اظہار مسرت کیا بھی مگر آزادی بدستور افسردہ خاطر اور اُداس تھی بلکہ خدا جانے کس بی بی نے مبارک باد دے کر کہا کہ رمضان چلا آرہا ہے اور صاحب خانہ کے آنے کی بھی خبر ہے تم نے مکان میں قلعی تو پھروالی ہوتی؟ آزادی بولی ہاں خبر تو ہے کل شاموں شام تک خط آیا ہے لکھتے ہیں کہ چاند رات تک ضرور ضرور آؤں گا۔ اجازت مل گئی ہے۔ سامان سفر بھی درست کر لیا ہے۔ مگر نہیں معلوم کیا بات ہے میرے دل کو نہیں لگتا۔ گاؤ تکیوں کے غلاف اور چاند بنا لے کر بیٹھی تھی کہ کھول کر دیکھوں گی آپ ہی آپ دل بیٹھا سا جاتا ہے گٹھری کے کھولنے کی بھی نوبت نہ آئی وہ دیکھو ویسی کی ویسی بندھی رکھی ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈاک کے ہرکارے نے باہر ڈیوڑھی پر آواز دی تار آیا ہے۔ تار کا نام سنتے ہی آزادی کا رنگ فق ہو گیا۔ لگا دل دھڑکنے۔ ماما نے تار لاکر دیا تو ہاتھ قابو میں نہ تھا۔ پڑوس میں کوئی لڑکا انگریزی خواں رہتا تھا جلدی سے بلا کر اُسے پڑھنے کو دیا۔ جب تک وہ تار دیکھتا رہا آزادی عجیب گھبراہٹ کے ساتھ ٹکٹکی باندھے کھڑی اُس کا مُونہ تکتی رہی۔ زیادہ دیر ہوئی تو آزادی نے پوچھا بھئی خدا کے لیئے کچھ کہو تو ہے تو میرے ہی نام کا کس کا ہی کیا لکھا ہے۔ لڑکے نے کہا ہے تو تمہارے ہی نام کا اور بھوپال کے نواب صاحب نے بھیجا ہے۔ اندر مولوی صاحب کا نام بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھ میں نہیں آتا۔ کہو تو پڑھوا لاؤں۔ لڑکا تو تار پڑھوانے گیا اور یہاں وہ بی بی جو پہلے سے آئی ہوئی آزادی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی بولی تم اس قدر ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ نواب صاحب نے مولوی صاحب کی روانگی کی اطلاع دی ہوگی۔ آزادی کا دل بات کرنے کو تو چاہتا نہ تھا۔ لیکن ایک دم سے ایسے صدمے کی بات یہ اپنے مُونہ سے کیونکر نکال بیٹھتی۔ اور یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ میرے دل میں تو جس دن سے وہ سدھارے بُری ہی بُری باتیں چلی آرہی ہیں۔ خدا جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے؟ کہیں یہ بھی کسی طرح کا جنون نہ ہو؟ کیا معلوم جن بیبیوں کو میاؤں کی محبت ہوتی ہوگی میاں کی مفارقت میں ان کا ایسا ہی حال ہوتا ہوگا۔ مجکو تو خیر ایسی محبت ہی کیا تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ اُن کو کسی حالت میں میری آزردگی گوارا نہ تھی۔ اگر اسی کا نام محبت ہے تو اُن کی طرف سے تھی۔ میری طرف سے تو محبت کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ غرض آزادی نے بہ مجبوری اُس بی بی سے اتنا کہا کہ لے بی کیا تم نے مجکو نرا بچہ سمجھا ہے؟ روانگی کا تار اور نواب صاحب کی طرف سے؟ اس کے معنی کیا؟ خدا جانے ایسی کیا آگرہی کہ تار تک

نہیں دے سکے اتنے میں اُس لڑکے کی ماں تار لیئے ہوئے آئی۔ گھر سے تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ ان سے تو بیماری کا بہانہ کر دوں گی اور مرنے کی خبر ان کے میکے کہلا بھیجوں گی۔ لیکن جو آزادی پر نظر پڑی۔ تھی تو غیر مگر بے اختیار آزادی کو لپٹ کر رونے لگی۔ پھر تو کہنا تھا۔ آزادی تو دس دن مہینے سے گھٹی ہوئی بھری بیٹھی تھی ایک چیخ تو ماری پھر غش کھا کر ایسی کُوڈھب پلنگ پر سے گری کہ اگر اس کا دوپٹہ پائے میں اُلجھ نہ جائے تو زمین تھی پکی سر بے پاش پاش ہوئے نہ رہے۔ جوان کا مرنا۔ ناگہانی موت۔ اور پردیس۔ سارے شہر میں کہرام سا مچ گیا۔ اور پرسے کے لیئے ایک خلقت ٹوٹ پڑی کہ پاس پڑوس میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ آزادی کی تو ہی بات الگ اس کو مستجاب کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا ایسا کہ گویا ایک جان دو قالب تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے آزادی کے دل کو بہت پہلے سے اس حادثے کی کچھ خبر سی ہو گئی تھی جب مولوی مستجاب گھر سے رخصت ہونے لگے ہیں تو آزادی نے اسی وقت نا امیدی کی سی باتیں کی تھیں کہ کیا معلوم اب کے بچھڑے ہم پھر بھی اس دنیا میں ملیں گے یا نہیں۔ پھر جس دن سے مولوی مستجاب گئے آزادی کا ایک دن بلکہ ایک لمحہ خوشی سے نہ گزرا۔ سدا مغموم۔ ہمیشہ متردد۔ اور غم بھی اس قسم کا نہیں جو اپنے پیاروں کی مفارقت کا ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اس سے بہت زیادہ۔ کہیں بڑھا ہوا۔ پھر اب آخر کو تار آیا تو پڑھا تک نہیں گیا خود بخود اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ غرض آزادی کو تو پورا الیقین تھا کہ مولوی صاحب وطن آؤں آؤں کہہ رہے تھے وطن اصلی کو سدھار گئے لیکن اور جتنے آدمی تھے اپنے۔ غیر۔ ملاقاتی۔ جان پہچان۔ اجنبی سبھی نے تو تار پر طرح طرح کے اشتباہات کیئے۔ ایک نے کہا ضرور پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو کل شاموں شام تو خط آیا ہے۔ اس میں بیماری کا کچھ اشارہ تک نہیں۔ دوسرا بولا خیر دفعتاً بیمار ہو جانے کا بھی مضائقہ نہیں مگر علالت کی خبر آنی تو ضرور تھی۔ تیسرے کہنے میں بہتیرے مرد موجود ہیں مانا کہ گھر الگ تھا۔ تاہم کسی مرد کے نام تار آنا چاہیئے تھا۔ چوتھا۔ اجی حضرت میرے دل کو تو یہ بات لگتی نہیں ضرور کسی دشمن کی شرارت ہے اور اگرچہ مولوی صاحب اس قسم کے آدمی نہ تھے کہ کوئی اُن کا دشمن ہو مگر ہندوستانی ریاستوں میں دشمن ملتے کیا دیر لگتی ہے؟ سچ بولے۔ کام سے غرض رکھے۔ دیانت دار ہو جھوٹی خوشامد نہ کرے۔ ایسے کے ہزار دشمن۔ زمین و آسمان دشمن۔ در و دیوار دشمن اور پھر سب سے بڑی

عداوت کی وجہ نواب صاحب کا تقرب ۔ ان کو نواب صاحب کے ساتھ ہم پیالہ وہم نوالہ دیکھ کر خدا جانے کتنے زہر کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے ہوں گے ۔ غرض وہ تار کالج کے پرنسپل پاس گیا ۔ مدرسوں پاس گیا ۔ پادری پاس گیا سب نے وہی پڑھا جو اس میں تھا کہ مولوی مستجاب نے دل کی بیماری سے دفعتاً آج دن کے دو بجے انتقال کیا حال مفصل خط متعاقب سے معلوم ہوگا بعض نے یہ بھی صلاح دی تھی کہ جواب طلب تار دے کر خبر کی تصدیق کر لو مگر وہ بات بھر رہی گئی لیکن مولوی صاحب کے کسی دوست نے اُن کے بیمار ہوتے ہی ایک مختصر سا خط لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا تھا کہ نماز جمعہ میں مولوی صاحب کو رقت ہوئی اور اکثر ہوا کرتی تھی ۔ یکایک بے ہوش ہو کر گر پڑے اور روح مفارقت کر گئی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ تار کے تیسرے دن نواب صاحب نے اپنی قلم سے یہی حال لکھا اور بہت ہی ملال ظاہر کیا ۔ اور ہاں اُس خط میں یہ بھی تھا کہ مولوی صاحب کی بیوہ کو بتیس روپے مہینا ملا کرے گا جب تک دوسرا نکاح کرے ۔ آزادی کو جس وقت سے غش آیا اس کا تمام بدن ٹھنڈا برف ہو گیا تھا اور دانت اس قدر بچے ہوئے تھے کہ کوئی چیز حلق سے نہیں اُتر سکتی تھی جب غش کو بہت دیر ہو گئی حکیم نے نبض دیکھ کر کہا کہ مارے غم کے حرارت غریزی اشتغاف قلب میں مختفق ہو گئی ہے غشی مطلق ہے اور خوف ہی بھی اور نہیں بھی ۔ ہوش میں لانے کی تدبیریں کی جائیں ۔ دیر میں خطر ہے ۔ ہنڈول سنگھایا ۔ گلاب کے چھینٹے دیئے خس کے پنکھے جھلے ۔ پنڈلیاں باندھیں ۔ گھٹنوں ہتیلیوں اور تلوؤں کی مالش کی ۔ مگر آزادی جیسی لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی پڑی تھی ساری رات اُسی وضع سے پڑی رہی ۔ ذرا افاقہ نہیں مطلق ہوش نہیں ۔ اوپر والے اُس جوان مرگ کو کیا روئیں کہ یہاں آنکھوں کے سامنے اس جوان کے جینے کے لالے پڑ گئے ۔ بارے صبح کی خنکی پہنچی تو آزادی نے ایک چھینک لی اور آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے تئیں ماں کی گود میں پایا ۔ اب اس کے ڈر کے مارے کوئی آواز مونہ سے نہیں نکال سکتا سب کے سب دم بخود بیٹھے ہیں ۔ آزادی کو ہوش تو آیا مگر عجیب طرح کا ہوش تھا ۔ لیٹی تھی اُٹھ بیٹھی ۔ بولتی چالتی کچھ نہیں ۔ نہ آپ روتی ہے نہ دوسروں کو رونے دیتی ہے ۔ بت کی طرح گُم صُم ایک طرف کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہی ہے ۔ نہ پلک جھپکاتی اور نہ کسی کو اپنا حال بتاتی ۔ آخر ماں نے کہا بیٹا تم نے عشا کی نماز بھی نہیں پڑھی اب صبح کا وقت بھی تنگ ہونے کو ہے اُٹھو وضو کر و نماز پڑھو یہاں نیچے آدمی بہت ہیں کوٹھے پر جائے نماز بھی چھوڑ آئی

ہوں وہیں چلی جاؤ۔ آزادی نے اوپر جاکر وضو کیا سنتیں پڑھیں۔ فرضوں کی نیت باندھی اور پہلی رکعت میں الحمد کے بعد سورہ یوسف کا وہ مقام پڑھا جہاں حضرت یوسف کے بھائی باپ کو ملامت کرتے ہیں کہ یوسف کی اتنی یادگاری رکھوگے تو ایک نہ ایک دن ہلاک ہو جاؤگے اور حضرت یعقوب بیٹوں کو جواب دیتے ہیں اِنَّمَآ اَشْکُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ میں تو خدا کی درگاہ میں اپنی پریشانی کی فریاد کرتا ہوں اِن لفظوں کا مُونہ سے نکلنا تھا کہ گویا فوّارے کی ڈاٹ کھول دی۔ آنسوؤں کی نکلی[1] اس زور سے جاری ہوئی کہ گویا سارا جسم آنکھوں کی راہ پانی ہو کر بہ جائے گا اور نالوں کا یہ جوش کہ سانس پیٹ میں نہیں سماتا کلیجہ مُونہ کو نکلا چلا آتا ہے۔ کہنی کچھ ہے اور مونہ سے نکلتا ہے کچھ۔ مولویوں سے پوچھو تو صاف کہہ دیں گے کہ نماز نہیں ہوئی اور ہم کہتے ہیں کہ آزادی نے ساری عمر میں بس یہی ایک نماز پڑھی۔ اے خدا کبھی ہم کو بھی آدھی پاؤ رکعت اس خلوص اور اس استحضار کے ساتھ پڑھنی نصیب ہوگی۔ اوپر آزادی نماز پڑھ رہی تھی اور نیچے ریل کے ٹوابلر کی سی آواز چلی آتی تھی۔ ہادی بیگم نے اسی مصلحت سے اس کو نماز کے لیئے اوپر بھیج دیا تھا کہ تنہائی میں کچھ تو جی کھول کر روئے کہ اس کے اندر کی بھڑاس نکلے اور یوں تو گھٹتے گھٹتے اس کا دم رُک جائے گا۔ بلکہ اس اثناء میں ایک دو عورتوں نے اوپر جانے کا قصد بھی کیا تو ہادی بیگم نے روک روک دیا۔ جب اچھے خاصے دو گھنٹے کامل گزر گئے تو ہادی بیگم خود اوپر گئی بیٹی کو دیکھا کہ سجدے میں پڑی رو رہی ہے۔ اُٹھا کر چھاتی سے لگایا اور جلتی ہوئی آگ کو اور جا بھڑکایا۔ جوں ماں نے بیٹی کو آغوش میں لیا بیٹی کا تو یہ حال ہوا جیسے کبوتر کو ذبح کر کے نیم بسمل تڑپتا ہوا چھوڑ دیں۔ ماں یہ حال دیکھ کر سہم گئی بے شک بڑی مصیبت تو آزادی پر تھی لیکن ماں پر بھی کچھ کم صدمہ نہ تھا۔ وہ مردے کو روتی تھی اور یہ جیتے کو وہ مرحوم کی عزادار تھی اور یہ مجروح کی غمخوار۔ اُس کو ماتم شوہر تھا۔ اس کو غم لختِ جگر۔ بے قراری دیکھی نہیں جاتی اور تسکین کی کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ دُور رہے دل نہیں مانتا۔ پاس بیٹھے سے بیٹی کو اور ایذا ہوتی ہے۔ اس بھید کو کوئی نہیں جانتا۔ ناچار پتھر کا دل اور فولاد کی چھاتی کر کے بیٹی کو لگا لپٹی رہی۔ ورنہ وہ تو دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خدا جانے اپنا کیا حال کر لیتی۔ ہادی بیگم نے

---

[1] جس میں پانی کھولتا ہے ۱۲

یہ بڑی دانشمندی کی کہ تین یا چار شبانہ روز برابر ایک دم کے لیئے بیٹی سے جدا نہ ہوئی۔ نہ آپ پُرسہ لینے
مہمانوں کے پاس جاکر پھٹکی اور نہ اُن میں سے کسی کو اپنے پاس آنے دیا۔ کیا بُرا دستور ہی کہ نام تو کریں
تعزیت کا جس کے معنی ہیں تسلی دینا۔ اور تسلی کی جگہ مرنے والے کی خوبیاں یاد دلائیں یعنی مرہم
کے عوض گھاؤ میں نون مرچیں لگائیں مستجاب کو تو مارا تھا خدا نے اور آزادی کو ماریں یہ
احمق پُرسا دینے والیاں۔ کم بختوں کو موقع و محل کا بھی تو خیال نہیں۔ موئی میں آنا اور کپڑے
بدلنا اور اپنے تئیں بنانا۔ ہم تو سنتے تھے کہ عورتیں بڑی رقیق القلب ہوتی ہیں مگر آزادی کے
مہمانوں کو دیکھ کر تو ہمارا خیال بالکل بدل گیا۔ سوائے اس کے ڈومنیوں کا ناچ نہ تھا اور تو کوئی
فرق نظر نہ آیا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ شادی کی نہیں بلکہ غمی کی محفل ہی۔ وہی فرش وہی
زردہ پان وہی ساز و سامان۔ وہی مہمان۔ وہی شان۔ وہی آن بان۔ وہی قصے وہی
داستان۔ موئی کی خبر پہونچی اور اُنہوں نے کپڑوں کی گٹھریاں بھنڈ وڑنی شروع کیں
زیور کا صندوقچہ منگایا۔ اسباب کے صندوقوں میں سے ڈھونڈ کر ملیدار یا جگی کی جوتی نکالی
بن سنور کر ڈولی میں بیٹھ روانہ ہوئیں۔ رستے بھر دل میں حساب کرتی گئیں کہ اس وقت
کا کھانا تو میں پکوا چلی ہوں۔ شام کے لیئے اگر وہاں دیر ہوتی ہوئی دیکھوں گی تو پیسے بھیج دوں گی
یا کھانا بھیجوں گی بازار سے منگوا لیں۔ غرض وہاں پہنچے پر بات سوبات اور زیادہ وقت مل گیا
تو جلدی جلدی کر کے کپڑے بدلے تھے ڈولی میں بیٹھے بیٹھے ان کو ٹھیک کیا۔ گہنے کو سنبھالا
اتنے میں کہاروں نے آواز دی سواری اُترو الو۔ کہار مونہ پھیر کر کھڑے ہوئے بیوی بڑے تکلف
سے اُتریں اور ڈیوڑھی تک پہونچتے پہونچتے مُڑ مُڑ کر ڈولی کی طرف دیکھتی گئیں کہ کوئی چیز رہ تو
نہیں گئی۔ کہار باہر ہیں اور بیوی ڈیوڑھی کے اندر۔ کرائے پر حجت ہو رہی ہی۔ بہتیرا ڈرایا۔
دھمکایا۔ کوسنے دیئے۔ کہار کب ٹلتے تھے۔ آخر جو مانگا سو دیا مگر جھنا کر خیر ہوئی میں آئی ہوا اس
وقت تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر محلے سے تمہارا اڈّا اجاڑ دوں تو سہی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی
تاکنا شروع کیا کہ پُرسا لینے والی کدھر ہیں۔ دو سروں کو پھلانگتی ہوئی اُن تک پہونچیں۔ اس
وقت تک نہ رنج ہی نہ ملال ہی نہ کسی کے درد کی پروا اور نہ مصیبت کا خیال ہی۔ مگر خدا جانے
کس طرح کا کمال ہی کہ بیٹھتے دیر نہیں ہوئی اور سیر یوں پانی آنکھوں سے بہا مارا سو سو برس کے

بوڑھوں کو مرتے دیکھا جو بیچارے زندگی سے سیر اور مرنے پر سب سے زیادہ دلیر تھے اور اُنھوں نے
بیٹے پوتے پڑپوتے نواسے کنواسے کنبہ بھی ماشاء اللہ اتنا چھوڑا کہ بجائے خود دوسرے بابا آدم
تھے مگر عورتیں رونے پر آئیں تو ان کے مرنے کا بھی ایک ماتم بنا کھڑا کیا۔ اور یہاں تو روداد حادثہ
ہی ایسی غضب کی تھی کہ بیان کرتے ہوئے جی لرزتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو مکان شق ہو جائے۔ اگر
مستجاب کے مرنے کے بین ہوتے تو قسم کھانے کی بات ہے کہ آزادی نوجوان بر نہ ہوتی اور دو چار
کو اور اپنے ساتھ لے مرتی تو بھی عجب نہ تھا۔ لیکن بڑی خیر گزری کہ عین وقت پر ہادی بیگم کو
یہ انجام سوجھ پڑا اور اُس نے ایسی صورت ہی پیش نہ آنے دی۔ لیکن قریب کے رشتہ داروں
کو تو منع بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اُن کا رنج بھی بناوٹ اور دکھاوے کا نہ تھا۔ شرع میں
بین کی ممانعت ہے اور جس طرح کے بین کیئے جاتے ہیں بلاشبہہ قابل ممانعت ہیں بھی۔ شارع کا
مقصد یہ ہے کہ اگر ہم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو شایاں بندگی نہیں کہ ہم خدا سے ناراض ہوں۔
اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ ہم مصیبت میں بھی اُس کے شکرگزار ہوں لیکن اگر اتنا نہ ہو سکے کہ آدمی بے صبر اور
ضعیف الاعتقاد ہے تو مونہ سے لفظ شکایت کا نکالنا کیا معنی دل میں بوئے شکایت کا آنا بھی داخل
کفر ہے۔ اور حقیقت میں جب معاذ اللہ بندے نے خدا کو ظالم اور بے انصاف اور بے رحم سمجھا تو اس میں
اور کافر میں فرق بھی کیا باقی رہا؟ ہائے میں لٹ گئی۔ اے خدا تجکو اتنا بھی ترس نہ آیا۔ تیری خدائی میں
مجکو ایسے کون سے بھاگ لگ گئے تھے کہ آج مجھ پر یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ارے لوگو میری تو خدا بھی نہیں
سنتا۔ یہ اور اس طرح کے بین آدمی کو مرتد اور کافر بنا دیتے ہیں۔ یوں مطلق رونا اور نرا اظہار مصیبت نہ
شریعت میں منع ہے اور نہ آدمی سے اُس کا ضبط ہو سکتا ہے۔ آزادی کے یہاں یہ تو کیوں کر کہیں کہ
بین نہیں ہوئے۔ ہوئے مگر کم اور خلاف شرع نہیں۔ اور اس پر بھی مولویوں نے باہر آواز سنی اور
فوراً منع کرنے کے لیئے دروازے پر آموجود ہوئے۔ مولویوں کے بین یہ تھے۔ آزادی (چپکے چپکے)
یا اللہ میں کیا کروں۔ تم تو بھوپال جاتے ہوئے چلتے چلتے کہہ گئے تھے کہ تجکو بلاؤں گا۔ اب
بلاتے کیوں نہیں۔ تم نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ چاند رات سے پہلے آنے کا خیال رکھنا ایسا
ہم سے کیا قصور ہوا کہ پھر بھی آنے کا حکم نہیں۔ ہائے اگر میں یہ جانتی تو تمہاری خدمت میں
کوتاہی نہ کرتی۔ ہادی بیگم۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تم نے اُس دن کے لیئے اس (آزادی)

کا ہاتھ پکڑا تھا کہ منجھ دھار میں اس کو چھوڑ کر چل دو گے تم تو اس کی آنکھ بھی میلی نہیں دیکھ سکتے
تھے یا اب یہ یوں پڑی تڑپ رہی ہے اور تم کو پروا نہیں۔ ہائے کن کانوں سے سنوں گی
کہ لوگ آزادی کو بیوہ کہیں۔ ہائے کوئی بال بچہ بھی تو نہیں ہوا کہ اسی سے اس کا دل بہلے
مستجاب کی ماں دودھ بھی نہ بخشوا کے گئے۔ نوکری کی ایسی دھن لگی کہ بچے کی جان ہی گئی۔ تم تو
ایک بار حج کے جانے کے لیئے مجھ سے اجازت مانگتے تھے اب مجھ سے کیوں نہ اجازت لی۔ میری
آنکھوں کے آگے کوئی اپنا یادگار بھی نہ چھوڑا۔ تم تھے تو بہو پر ہر طرح میرا زور چلتا تھا اب میں کس
برتے پر بہو کو بٹھاؤں۔ باپ کی ضد پر وعظ کیا چھوڑا کہ دیس چھوڑا اور آخر کو دنیا بھی چھوڑی۔ اسی
طرح بقدر تعلق ہر شخص بین کرتا تھا۔ مستجاب کو کیا روتے تھے اپنے اپنے فائدوں کے پیچھے جان کھوتے
تھے لیکن ہائے دنیا کم بخت کی کسی چیز کو ثبات کسی حالت کو قیام۔ کسی کیفیت کو قرار نہیں۔ اور
ہو تو کیوں کر ہو رنج اور خوشی کی بھی دو حالتیں ہیں۔ جو انسان پر عارض ہوتی ہیں جب خود انسان
ہی معرض فنا میں ہے تو اس کی حالتیں بدرجہ اولیٰ۔ رنج ہو یا خوشی برسات کی ہوا کا سا جھونکا ہے آیا تو
ایک دو نفس ورنہ پھر وہی گھمس۔ مستجاب کی موت اس کے اور اس کے لواحقوں کے حق میں غیر متوقع چیز تھی۔ اور
سب موتیں اپنی اپنی جگہ تھوڑی یا بہت غیر متوقع ہوتی ہیں۔ روئے زمین پر ایک فرد بشر کا نشان دو جو
مرا اور لوگوں نے اس کو خوش دلی کے ساتھ دنیا سے رخصت کیا۔ یہ رونا پیٹنا ہی موت کے غیر متوقع
ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ سب ہماری غلط فہمیاں ہیں۔ ہم اپنا اور اپنے کسی عزیز کا مرنا پسند نہیں کرتے
اگرچہ موت کو ٹال نہیں سکتے مگر اپنی طرف سے اس کے ٹالنے میں کوتاہی بھی نہیں کرتے۔ پس موت
غیر متوقع نہیں ہے بلکہ ہم نے اس کو زبردستی اپنے نزدیک غیر متوقع ٹھیرا لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہمارے رنجیدہ
ہونے کی ہوتی ہے۔ کیوں کہ خلاف توقع کسی حالت کا پیش آنا اسی کا نام رنج ہے۔ لیکن یہ رنج بے محل
اور لاحاصل ہونے کے علاوہ بے اعتبار بھی ہے کیسے سے کیسا ہی سخت رنج کیوں نہ ہو جوں جوں دن
گزرتے جاتے ہیں اس کی تلخی گھٹتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ عجب نہیں ایک دن ایسا بھی آئے
کہ جو شخص اس رنج کے پیچھے شاید خودکشی پر آمادہ تھا۔ اس کی نظر میں بھی ایک افسانے سے زیادہ
اس رنج کی وقعت باقی نہ رہے۔ جیسے زخم کہ سوزش ہے۔ درد ہے۔ بے چینی ہے۔ کرب ہے۔ اچھا ہوا تو صرف
ایک نشان رہ گیا وہ بھی روز بروز مٹتا اور مضمحل ہوتا چلا جاتا ہے۔ مستجاب کا مرنا اس عموم سے مختص اور اس

کلیجے سے منتشیٰ نہ تھا۔ دُور کے مہمان تیجا کر کے رخصت ہوئے اور اسی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو کر کے کھسکتے گئے۔ اب رہ گئی آزادی اور اس کی ماہادی۔ کہ وہ اس کو سایہ کی طرح لازم اور مثل ہمزاد کے اُس کے ساتھ تھی۔ رنج کیا بُری چیز ہی۔ اتنے ہی دنوں میں آزادی کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے برسوں کا بیمار۔ بدن میں خون کا نام نہیں۔ رنگت دیکھو تو زرد جیسے ہلدی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے بیٹھنے میں مضائقہ۔ اُٹھنے میں تکلف۔ چہرا اُترا ہوا صورت اُداس۔ ہر وقت اونگھ سی چلی آتی ہی مگر نیند ایسی اُچاٹ ہوئی ہی کہ ساری رات بیٹھے اور کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہی۔ ما کے اصرار سے مُونہہ میں نوالہ لیا ہی چاہتی ہی کہ نگلے حلق سے اُلٹا چلا آتا ہی۔ کسی نے پان بنا کر دیا گلے میں تو رکھ لیا مُونہہ ہلانے کو جی نہیں چاہتا۔ خدا جانے کس خیال میں غرق ہی کہ لوگ پاس بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہیں اور اس کو خبر تک نہیں۔ ما اُٹھا اُٹھا کے بٹھاتی ہی اور یہ گری پڑتی ہی جب دیکھو چپ جس وقت نظر کرو خاموش۔ گھڑی گھڑی ٹھنڈے سانس۔ بار بار ہائے ہائے۔ ہادی بیگم بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جی چلی جاتی تھی الٰہی کیا کروں کیا نہ کروں۔ عدّت میں نہ ہوتی تو بلا سے اس کو باغوں میں لیے لیے پھرتی۔ قطب صاحب کی سیر کراتی۔ شاید اس کا جی بہلتا۔ اس کی طبیعت سنبھلتی۔ اور اگر چندے اس کی یہی حالت رہی تو اسی طرح گھل گھل کر ایک نہ ایک دن تمام ہو جائے گی۔ آخر اس کے خیال میں آیا کہ اس کو مولویوں کے وعظ سنواؤں۔ بس یہی ایک تدبیر ہی نہ لگا تو تُکّا اور لگ گیا تو تیر ہی۔ بادشاہ کو مولویوں کی کمی نہیں۔ آٹھ آنے اور نہیں تو ایک روپیے کو صبر کرو اور جیسا چاہو مولوی بلوا لو اور جیسا چاہو وعظ کہلوا لو۔ اور ہادی بیگم کے تو اپنے ہی کنبے میں بہتیرے مولوی بھرے پڑے تھے۔ قاعدہ تو ٹوٹتا تھا مگر پاس قرابت اور اُس کے علاوہ شہرت۔ مولویوں نے تو وعظوں کا مینہ برسا دیا۔ اور سچ یہ ہی کہ ان وعظوں نے آزادی کو فائدہ بھی بہت دیا۔ کیوں کہ بے معاوضہ اور بلا اُجرت تھے۔ دوا ٹھیک ہونی چاہیئے حکیم کوئی ہو اور کیسا ہی ہو۔ وعظ تو بہت سے ہوئے لیکن دو تین وعظ تو حقیقت میں بڑے ہی موثر تھے جیسے پہلا آزادی کے نانا مولوی مقتدی کا۔

دسویں فصل مولوی مقتدی العلم صبر میں وعظ فرما رہے ہیں

اُنھوں نے سورہ بقر کی یہ آیت لی۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ

وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ مولوی صاحب نے تحقیق لغوی اور ترکیب نحوی اور فصاحت و بلاغت اور شانِ نزول اور اختلافاتِ قراءت اور ربطِ سابق و لاحق کے بارے میں جو کچھ فرمایا جائے خود عمدہ تھا مگر عورتوں کے وعظ میں بے محل اُس قدر چھوڑ کر باقی کو نقل کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اس طرح پر شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اُن مسلمانوں کی طرف جو پیغمبر صاحب کے ہم عصر تھے خطاب کر کے فرماتا ہی وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ہم ضرور ضرور تم کو آزمائیں گے۔ لَنَبْلُوَنَّ ایک لفظ ہی جس میں لامِ تاکید اور نونِ تاکید ایک چھوڑ دوہری دوہری تاکید ہی جس سے مخاطبین کا متنبہ کرنا منظور ہی کہ ہماری بات کو سرسری اور چلتی ہوئی سی مت سمجھنا۔ یہ ہم فرماتے ہیں۔ ضرور ہو کر رہے گا پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ آفتاب اور ماہتاب اور ستارے اپنی رفتار بدل دیں۔ دریا پچھم سے پورب کو بہنے کے بجائے اُلٹے بہنے لگیں۔ غرض دنیا و مافیہا بدل جائے مگر خدا کا ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک نقطہ اور ایک شوشہ نہیں بدل سکتا۔ دوسری جگہ بھی فرمایا ہی۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ اللہ کی باتوں میں ردوبدل نہیں پھر اگرچہ لَنَبْلُوَنَّكُمْ کے مخاطب پیغمبر صاحب کے زمانے کے مسلمان تھے مگر یہ خطاب متوجہ ہی تمام مسلمانوں کی طرف الیٰ یوم القیامت یعنی روز قیامت تک جتنے مسلمان زمین کے پردے پر ہوں گے سب کو آزمایا اور سب کا امتحان لیا جائے گا۔ پس یہ ایسا امتحان عام ہی جس سے کوئی مسلمان بری نہیں جو ہے ضرور امتحان دے کر رہے۔ جواب موجود ہیں ہر وقت زیر امتحان ہیں اور جو آئندہ ہوں گے اُن کو بھی یہ امتحان دینا ہوگا جس طرح دنیا کے امتحانوں میں پہلے بتا دیا جاتا ہی کہ فلانے فن فلانے علم فلانی کتاب میں امتحان لیا جائے گا تاکہ امتحان دینے والا پڑھ سیکھ کر طیار ہو رہے۔ تم نے مدرسوں کے لڑکوں سے کورس کا لفظ سنا ہوگا۔ کورس سے خاص خاص کتابیں اور کتابوں کے خاص خاص مقامات مراد ہوتے ہیں جن میں امتحان لیا جاتا ہی اگر کورس مقرر نہ کیا جائے تو طالب العلم کو بڑی مشکل پیش آئے۔ ایک علم میں بہت سی کتابیں ہوتی ہیں سب کتابوں پر ایک شخص کی نظر ایک وقت محدود میں احاطہ نہیں کر سکتی۔ تو ضرور ہی کہ وہ بعض کو اختیار کرے لیکن اگر کورس نامزد نہ کیا جائے تو ممکن ہی کہ اس نے ایک کتاب اختیار کی اور ممتحن نے دوسری کتاب میں سے سوالات کیے تو یہ امتحان نہ ہوا بلکہ ہرانی جنانی ٹھیری جب کہ دنیا کے

ممتحن اس قباحت پر نظر کر کے پہلے سے کورس مقرر کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ تو بڑا منصف اور بڑا رحیم امتحان لینے والا ہی اور دوسری جگہ فرماتا ہی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظلِمُ مِثقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِن تَکُ حَسَنَۃً یُضَاعِفھَا وَیُؤتِ مِن لَّدُنہُ اَجراً عَظِیماً۔ اللہ تو ایک رتی برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نیکی ہوتی ہی تو اس کو چند در چند کرکے اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہی تو خدا نے بھی اپنے امتحان کا کورس مقرر کرکے سب ایمان والوں کو سنا دیا۔ بِشَیءٍ مِّنَ الخَوفِ وَالجُوعِ وَنَقصٍ مِّنَ الاَموَالِ وَالاَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ہم تمہارا امتحان کاہے میں لیں گے تھوڑا ڈر تھوڑی بھوک تھوڑا گھاٹا۔ کیا شفقت پروردگار عالم ہی کہ امتحان کا نام برا ہوتا ہی اور سُنتے کے ساتھ آدمی کے ہاتھ پاؤں بھول جاتے ہیں۔ عربی کی کہاوت ہی عِندَ الاِمتِحَانِ یُکرَمُ الرَّجُلُ اور یہاں امتحان کے وقت آدمی کی عزت گئی یا رہی۔ تو خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر ارشاد کیا کہ امتحان کا نام سن کر گھبراؤ نہیں ڈرو نہیں ہم کڑا امتحان نہیں لیتے۔ زیادہ نہیں صرف تین چیزوں سے تھوڑا تھوڑا بھیج کر دیکھیں گے۔ اول خوف تو اس وقت کے مسلمان کافروں کی طرف سے ہمیشہ خائف رہتے تھے۔ اُس ملک میں عمل داری کا یہ رنگ تو تھا ہی نہیں کہ ایک بادشاہ ہی اور وہ رعایا کے امن و آسایش کا بندوبست رکھتا ہی۔ سب اُس سے ڈرتے اور سب اُس کا حکم مانتے۔ سارا ملک خودسر اور ہر شخص آپ اپنا حاکم تھا وہ لوگ باپ دادوں اور پردادوں سے بتوں کو پوجتے چلے آتے تھے۔ گھروں اور قبیلوں میں جو بُت تھے سو تھے سیکڑوں بُت خانہ کعبہ میں لا کر بھر دیئے تھے۔ جب پیغمبر صاحب نے دعوتِ اسلام شروع کی یعنی لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بُلایا تو وہ لوگ بہت بھنائے۔ اور چونکہ اس جدید مذہب سے بت پرستی کی بیخ کنی اور بتوں کی توہین اور اُن کے بزرگوں کی تحقیر لازم آتی تھی سارا ملک متفق ہو گیا کہ اس نئے مذہب کو پھیلنے اور پنپنے نہ دیں۔ قاعدہ ہی کہ جب کسی بات میں آدمی لاجواب ہوتا ہی تو سخن پروری کے لیئے لڑائی پر اُتر آتا ہی اور وہ لوگ تھے بھی لڑاکو لگے پیغمبر صاحب اور ان کے ہمراہیوں سے جن کا مجموعہ اُس وقت تک بہت ہی کم تھا طرح طرح کی پرخاشیں کرنے۔ جو لوگ باعزت اور جتھے تھے وہ تو کسی قدر محفوظ بھی تھے باقی کوئی متنفس مسلمان نہ تھا جس کو کافروں کے ہاتھ سے قسم قسم کی ایذائیں نہ پہنچتی ہوں۔ کافروں نے ان کا کھانا پینا بند کیا۔ رشتہ ناطہ چھوڑ دیا۔ اکیلے دوکیلے کو پاتے تو مارتے اور بےحرمت کرتے مسلمانوں کی مجال نہ تھی کہ پکار کر اذان دیں یا خانہ کعبہ میں

جا کر خدا کی عبادت کریں۔ مجبور مسلمان گھر بار چھوڑ کر دین کے ڈر سے پردیس کو نکل گئے اور جو نہ جا سکے اُن کو ایسی ایسی مصیبتیں پیش آئیں کہ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو سُن کر تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ کافروں نے مسلمانوں کو پردیس میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان پر چڑھ چڑھ کر آتے اور ان کے پناہ دینے والوں کو مارتے اور ستاتے۔ یہ سب کوششیں اس غرض سے تھیں کہ دینِ اسلام شایع نہ ہو۔ لیکن جس کا خدا مددگار ہو اس سے کون برسر آ سکتا ہے۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ کافر تو اس فکر میں ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونک مار کر بجھا دیں اور اللہ کو منظور نہیں وہ تو اپنے نور کو چمکا کر اور پھیلا کر رہے گا کافروں کو بُرا لگے تو لگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مسلمان جو جان کے خوف سے بھاگے بھاگے اور چھپے چھپے پڑے پھرتے تھے خدا نے اُن کی مدد کی تو انہوں نے ملکوں فتح کئے اور وقت کے بادشاہ ہوئے۔ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ۔ میں مسلمانوں کی اُسی ابتدائی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ بڑے شکر کا مقام ہے کہ ایسے خوف کی حالت میں رکھ کر خدا نے ہم کو نہیں آزمایا لیکن ہم کو اپنی جگہ سوچنا اور اپنے نفوس کا احتساب کرنا چاہیئے کہ اگر ہماری ایسی حالت ہو تو ہم اپنے دین و ایمان پر کہاں تک ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ بھائیو میں تو مسلمانوں کا یہ رنگ دیکھتا ہوں کہ برادری کے خوف سے لوگوں کے طعنوں کے خوف سے دنیا کی بدنامی کے خوف سے بہتیری باتیں خلافِ مصلحت اور خلافِ شرع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ تو جن کے دل ایسے کمزور اور ایمان اس قدر ضعیف ہیں اُس خوف کی کب تاب لا سکتے ہیں جس سے خدا نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو آزمایا تھا۔ دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت دو چیزیں ہیں اور علمِ اخلاق میں ان ہی دو کو تمام انسانی خصائص کا ماخذ اور مرجع سمجھا گیا ہے لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں دونوں شے واحد ہیں اور فرق اگر ہے بھی تو اعتبار و عبارت کا ہے کیونکہ فقدانِ منفعت بھی ایک قسم کی مضرت ہے لیکن یہ بحث ذرا پیچیدہ ہے اور یہ موقع ایسے مباحثِ دقیق کے بیان کرنے کا نہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اخلاق والوں نے خوف اور حرص کو دو قرار دیا ہے میں ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دونوں ایک ہیں۔ اگر ہم ایک چیز سے ڈرتے ہیں تو وہ خوف ضرور کسی منفعت کے زائل ہونے کا ہے۔ پس اس کو حرص سے کیوں نہ تعبیر کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ میں لالچ کو بھی ایک قسم کا خوف ہی سمجھتا اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہمارا نقدِ ایمان آتشِ خوف میں تلائے جانے کے قابل نہیں اسی طرح طمع کی کسوٹی پر کسے جانے کی بھی لائق نہیں۔ اول تو

جب ایک آدمی دین میں خوف کو دخل دیتا ہی تو کیا اطمینان ہو سکتا ہی کہ وہ طمع کو دخل نہیں دے گا کیا فرق ہی اگر ایک شخص فرض کرو خوف سے اسلام لائے اور دوسرا طمع سے۔ دونوں یکساں دل کے بودے ہیں وہ خوف کی مقاومت نہ کر سکا یہ لالچ کی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ہم ایک چیز کو جانتے ہیں کہ مذہب کی رو سے اُس کا کرنا مناسب یا جائز ہی اور ہم لوگوں کے خوف سے اُس کو نہ کریں تو یہ اس بات کی شناخت ہی کہ اگر ہم کو اُس کے نہ کرنے کے لئے خوف کی عوض طمع دی جاتی تو جیسے ہم ڈر کر اس کے کرنے سے باز رہے اسی طرح لالچ میں بھی آ کر اس کے کرنے سے باز رہتے اب دیکھو کہ اُس ملک میں اسلام کے کتنے مخالف ہیں۔ اول سب سے زیادہ ہندو جن میں ہم کو چار و ناچار رہنا ہی۔ ان کی طرف سے تو ہم کو پورا اطمینان ہی کہ ڈرا کر یا لالچ دکھا کر کسی طرح ہم کو اپنے مذہب میں لے ہی نہیں سکتے ہم نہیں جانتے کہ ہندوؤں نے ہماری کون سی رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ ہم تو اُن کے ساتھ رہ کر آدھے ہندو ضرور ہو گئے ہیں۔ خوف نہیں لالچ نہیں اور ہم آدھے ہندو بن گئے تو خوف اور لالچ کی صورت میں کیا عجب تھا کہ کھلم کھلا بتوں کو پوجنے لگتے۔ اور خفی بُت پرستی تو مسلمانوں میں اب بھی بہت ہی۔ شاید تم کو یہ میرا کہنا مبالغہ معلوم ہو لیکن سلطان جی صاحب۔ قطب صاحب قدم شریف۔ آثار شریف۔ سید حسن رسول نما۔ خواجہ باقی باللہ۔ اور دوسری زیارت گاہوں میں میرے ساتھ چل کر دیکھو عوام تو کھلی پرستش کرتے ہیں اور خواص جنہوں نے ہم دیا ہیوں سے کچھ ہوش پایا ہی کرتے تو ہیں پرستش وہ بھی مگر تعظیم کی آڑ میں سے

عذرت از پیش مے رود با ما ✤ با خداوند غیب دال نہ رود

اسی طرح کی تاویلیں تو مشرکین بھی کرتے تھے ہٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللہِ۔ جن کو تم ہمارا معبود ٹھیراتے ہو معبود نہیں اللہ کی سرکار میں ہمارے وسیلے ہیں۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُونَا اِلَى اللہِ زُلْفٰى ہم تو اُن کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے نزدیک کر دیں۔ بھائیو جب خدا نے مشرکین کی طرف سے اس عذر کو نہ سُنا تو تم اُس پیغمبر کی امت ہو جو صرف توحید کو خالص اور مستحکم کرنے کے لئے بھیجا گیا ایسا عذر بدتر از گناہ تمہاری طرف سے کیوں سُنا جانے لگا۔ اور فرض کیا کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی سمجھتے اور دل میں یقین بھی رکھتے ہو لیکن سب تو تمہاری طرح عالم فاضل نہیں پیغمبر کی امت میں بہتیرے ناخواندہ ہیں جن کو سیدھی الحمد بھی پڑھنی نہیں آتی اُن سے تعظیم و عبادت میں فرق ہو نہیں سکتا۔ وہ سرشتہ دار

کو رشوت دیتے ہیں یہ سمجھ کر نہیں کہ حاکم سے کہہ سُن کر ہمارا کام بنا دے گا بلکہ یہ یقین کرکے کہ حاکم برائے نام
ہی اور سر رشتہ دار سیاہ و سفید کا مختار عام۔ ان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی خدا رسول کو نہ دیکھتے
نہ بھالتے بلکہ مردہ یا زندہ پیر جیبوں میں سے کسی کو ڈھونڈ نکالتے۔ پانی برسائیں تو پیر جی۔ اولاد دیں
تو پیر جی۔ بیمار کو چنگا کریں تو پیر جی۔ ان کے پندار میں پیر جی نہ دوسرے خدا ہیں بلکہ آپ ہی خدا۔
تو اے بھائیو جو سمجھتے ہو ان مسلمان بھائیوں کے حال پر رحم کرو۔ ایسا نہ ہو تم تو کرو تعظیم اور یہ کرنے لگیں
عبادت۔ تم تو پکڑو دامن اور یہ اُتار لیں ٹوپی۔ دوسرا مذہب مقابل نصاریٰ کا مذہب ہے جو حاکم وقت
بھی ہیں خیر یہ بات دوسری ہی کہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے اور تثلیث کے قائل ہیں کہ ہمارے مذہب میں
یہ بھی ایک طرح کا کفر ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہی۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ
ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ یہود کہتے ہیں
عزیر اللہ کا بیٹا ہی اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہی یہ اُن کے اپنے مونہ کی کہن ہی ان سے پہلے جن
لوگوں نے کفر کیا لگے یہ بھی اُنھی کی باتیں بنانے ان کو خدا کی مار کدھر بھٹکے جا رہے ہیں لیکن اور کہیں ہو
تو ہو جو نصاریٰ ہمارے ملک پر مسلط ہیں نہ تو دوسروں کے مذہب سے تعرض کریں اور نہ اپنے مذہب میں
ملانے کے لیے کسی طرح کا لالچ دکھائیں۔ پادریوں کو رہنے دو۔ ہیں تو یہ بھی نصاریٰ۔ مگر میں نے اچھی
طرح تحقیق کر لیا ہی حکومت میں ان کو بالکل دخل نہیں لیکن نہ تخویف ہی اور نہ تطمیع اس پر بھی ہزاروں
مسلمان ہیں کہ اپنا ظاہر انگریزوں کا سا بنانا چاہتے ہیں۔ تو کیا ان سے توقع کی جا سکتی ہی کہ اگر
خوف یا لالچ کا دباؤ ڈالا جائے تو ایسے لوگ اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ میں مسلمان بھائیوں
پر بدگمانی نہیں کرتا اور گمان بد کرنا ہی بھی بری بات۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (بعضے گمان گناہ ہیں)
اور نہ اس پیرائے میں اپنی بڑائی کرتا ہوں۔ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ (اپنے مونہ اپنی صفائی
بیان مت کرو اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہی) بلکہ میں ظاہر حال سے ایک نتیجہ نکالتا ہوں اور خیال
کرتا ہوں کہ جس طرح نوکریوں میں امتحان کی قید لگا دی ہی اگر خدا نخواستہ مذہب کی بھی شرط کر دی جائے
کہ مثلاً تحصیل داری اور اُس سے اونچے عہدے نصاریٰ کے سوائے کسی کو نہ دیے جائیں تو میں نہیں
کہہ سکتا کتنے مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہو جائیں۔ غرض افسوس ہی کہ اب تک ہم خوف کے امتحان
میں ناکامیاب رہے لیکن امتحان کا سلسلہ بند نہیں ہو گیا اے بھائیو ایسی کوشش کرو کہ

امتحان دوبارہ میں فیل نہ ہوں۔ امتحان کی دوسری چیز ہے۔ جوع یعنی بھوک۔ اس سے شاید مراد ہو قحط کہ پیغمبر صاحب نے کافروں کے ہاتھ سے عاجز آکر بد دعا فرمائی تھی کہ اے خدا یہ لوگ تیری نافرمانی سے باز نہیں آتے ان پر ایسا قحط نازل کر جیسا حضرت یوسفؑ کے وقت میں ہوا تھا۔ چنانچہ سات برس پیہم اس طرح کا قحط پڑا کہ آدمیوں نے آدمیوں کو کھا لیا۔ یا شاید غزوہ تبوک کی طرف اشارہ ہو کہ جب پیغمبر صاحب نے تبوک پر چڑھائی کی تو مسلمانوں کا لشکر اس قدر بے سروسامان تھا کہ مجاہدین درختوں کے پتے کھا کھا کر گزر کرتے تھے۔ اللہ اللہ کیا ایمان تھے کہ خدا کی راہ میں جان دینے کو جاتے ہیں بھوکے پیاسے نہ سواری نہ ہتھیار۔ بخدا ان لوگوں کے سامنے اپنے تئیں مسلمان کہتے اور ایمان کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم میں کوئی ہے جو ایمان کی خاطر ایسی مصیبتیں جھیلے اور ایسی آفتیں انگیز کرے لیکن زیادہ مناسب اور دل کو لگتی ہوئی وہ تفسیر ہے کہ جوع سے اصحاب صُفّہ مراد ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے تھے مگر ساٹھ۔ ستر۔ سو۔ گھٹتے بڑھتے رہے ہوں اصحاب صُفّہ وہ لوگ تھے جو کافروں کے ڈر سے ہجرت کر کے مکّے سے مدینے میں آ رہے تھے۔ اپنے گھروں میں کھاتے پیتے خوش حال تھے لیکن چھپ کر بھاگے تو بیک بینی دوگوش کوئی چیز ساتھ نہ لا سکے۔ یہاں مدینے میں مسلمان بھائی جہاں تک ہو سکتا تھا۔ روٹی ٹکڑے سے ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ مگر خبر گیری کی بھی کچھ حد و انتہا ہے ایک روٹی ہو تو آدھی بانٹ کھائیں۔ اور گھر میں ایک بھی نہ ہو یا آدھی میں حصہ لگانا چاہیں آدھی درجن۔ تو دینے والا اور لینے والا میزبان اور مہمان دونوں بھوکے کے بھوکے نتیجہ یہ تھا کہ اصحاب صُفّہ پیٹ پر پتھر باندھے رہتے تھے۔ نماز میں کھڑے ہوتے تو چکر آتے۔ بیٹھتے تو مارے ضعف کے کھڑے نہ ہو سکتے جن کے کھانے کی یہ کیفیت ہو ان کے لباس کا کیا پوچھنا۔ صرف ایک کمبلی وہی اوڑھنا وہی بچھونا۔ وہی کرتہ۔ وہی پاجامہ۔ اور اے کاش وہ بھی اتنی بڑی ہو کہ اس کو اچھی طرح لپیٹ تو لیں پرانی اور کثیف ہونے کے علاوہ اس قدر چھوٹی کہ ہاتھ سے پکڑے رہیں تو سجدے میں جائیں۔ کوئی اس طرح کا خستہ حال آدمی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے تم میں آ بیٹھے تو تم کو ضرور نفرت آئے لیکن جناب پیغمبر خدا جب فرصت پاتے تو پہروں بے تکلف ان میں آ کر بیٹھتے۔ ظاہر کے فقیر اور باطن کے امیر۔ دیکھنے میں گدا اور حقیقت میں مقربانِ خدا۔ ایسے لوگوں کے حق میں جناب پیغمبر صاحب نے فرمایا۔ رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ لَوْ حَلَفَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ۔ بہت سے لوگ ہیں جن کا ظاہر پریشان اور گرد آلود ہے مگر خدا کو یہاں تک

اُن کی خاطر عزیز ہی کہ اگر کسی بات پر اڑ بیٹھیں تو خدا کو اُن کی ضد پوری کرتے ہی بنے۔ یہ بھی ایک مصلحت الٰہی تھی کہ خدا نے ان کو فقر و فاقہ سے آزمایا۔ بات یہ ہی کہ جن کی نظر میں دنیا کی وقعت ہی وہ یہاں کی تکلیف کو تکلیف اور آسایش کو آسایش سمجھتے ہیں ورنہ خدا کے نزدیک تو جیسا حدیث شریف میں آیا ہی جناح بعوضہ ایک پرپشہ کی برابر بھی دنیا کی حقیقت نہیں۔ اور یہی وجہ ہی کہ دنیا کی آسودگی کے اعتبار سے مومن و کافر میں کوئی تفرقہ اور امتیاز نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِّن فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُونَ وَزُخْرُفًا وَإِن كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ۔ فرماتے ہیں کہ دنیا ہماری نظر میں اس قدر حقیر ہی کہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ ساری دنیا کافر ہو جاوے گی تو کافروں کو اتنی دولت دیتے کہ گھروں میں چاندی کی چھتیں پاٹتے چہنے اور چاندی کے زینے چڑھا تے اور چاندی کے دروازے لگاتے اور چاندی کے تخت بنواتے اور فرشوں پر گاؤ تکیے لگا لگا کر اُن پر بیٹھتے اور چاندی تو چاندی ہم چاہتے تو اتنا ہی سونا ان کو بخش دیتے مگر ہوتا کیا دنیا کے لوگ احمق تو ہیں ہی سمجھتے کہ خدا کفر کو پسند کرتا ہی اور شاید یہی سبب ہی کہ جتنے کافر ہیں سب کو آسودہ حال کر رکھا ہی تو لگتے سب کے کفر کرنے اسی سبب سے ہم نے دنیا میں کافروں کی تخصیص نہیں کی یہ سونا چاندی ان ہی کی نظروں میں کچھ قدر و قیمت کی چیز ہوگی خیال کر کے دیکھو تو یہ تمام تر دنیا کی چندروزہ زندگی کے عارضی فائدے ہیں اصلی اور ابدی فائدے تو عاقبت کے ہیں اور وہ مخصوص ہیں پرہیزگاروں کے ساتھ بھائیو دنیا کی آسودگی پر کبھی مغرور نہ ہونا اور ہرگز ہرگز اس کو خدا کی خوشنودی کی دلیل نہ گرداننا میں تم سے سچ کہتا ہوں دنیا کی خوش حالی بڑی ہی خطرناک چیز ہی کیا تم نے قرآن کی وہ آیت نہیں دیکھی۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَفْسُقُونَ۔ اُس دن کو یاد کرو کہ جن لوگوں نے کفر کیا آگ کے سامنے لائے جاویں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ تم کو جو کچھ فائدہ پہنچنا تھا زندگانی دنیا میں پہنچ چکا اور تم نے دنیا میں خوب خوب چین کیئے اب بھگتو ذلت کا عذاب بدلہ اُس کا کہ تم زمین میں ناحق کی بڑائی مارتے اور بدلہ اُس کا کہ تم بدکاریاں کرتے تھے۔ دنیا اور دین دو ہی چیزیں جن کی دنیا رنج و مصیبت میں کٹی

وہ اگر ایسی توقع رکھیں کہ خیر دنیا بُری طرح گزری تو عجب نہیں کہ خدا وہاں اچھی گزارے تو جائے مہر
بھی ہے وہ بڑا کریم و رحیم ہے یہاں نہ دیا تو وہاں دے گا۔ لیکن جنہوں نے دنیا میں مزے اڑائے
اچھے سے اچھا کھایا اچھے سے اچھا پہنا آرام سے زندگی بسر کی ان کو ایسی امید لگانے کا کیا حق
ہے۔ خدا کے ساتھ ایسا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہو تو پیش کریں جس سے معلوم ہو کہ دوسرے بندے
تو خدا نے کوڑی پر سے پڑے پا لیے ہیں اور ان کو اپنے دستِ خاص سے بنایا ہے اور ان کے
ساتھ ایک خاص رعایت ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کوئی بات چھوڑی نہیں اسی مضمون
کی ایک آیت قرآن میں موجود ہے۔ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ
کیا تم نے ہم سے روزِ قیامت تک کی قسم لے لی ہے کہ جو تم حکم کرتے جاؤ ہم بجا لاتے جائیں۔ یہ
انسانی طبیعت کا خاصّہ ہے کہ دنیا میں پیدا ہوئے آنکھ کھول کر دنیا ہی کو دیکھا سمجھے کہ بس جو
کچھ ہے یہی دنیا ہے اور بس اور یہیں انسان کے رنج و راحت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا ہی
کی خوشی اور ناخوشی پر خدا کی رضامندی اور نارضامندی کو قیاس کر لیتے۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا
مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ کہ
جب خدا کی طرف سے دنیاوی اکرام و انعام ہوا سمجھے کہ ہاں خدا نے ہماری عزت کی رزق کی تنگی
ہوئی تو سمجھا کہ خدا کی نظر ہماری طرف سے پھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ محض غلط خیال ہے۔ دنیا تو امتحان کا
گھر ہے اور نتیجہ جو اس امتحان کا مترتب ہونے والا ہے عاقبت میں مترتب ہوگا۔ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ (اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا
مِنْهُمْ) وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ) ایک فریق جنت میں اور ایک فریق دوزخ میں۔ خدا نے
بندوں کو اس غلطی پر تنبہ کرنے کے لیے فرمایا اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ
بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔ کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ جو مال اور اولاد سے ہم ان کی مدد کر رہے ہیں اُن کی حسنات
کا معاوضہ ہے جو سر دست ان کو دنیا میں مل رہا ہے۔ نہیں نہیں۔ تم اس کا مطلب ہی نہیں سمجھے
تو اے بھائیو ہر وقت خدا سے ڈرتے رہو اور اگر انجام بخیر ہے اور وہاں چل کر خدا کے ساتھ اچھی
بنی تو دنیا کی چند روزہ تکلیفات ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی پروا کی جائے اور اگر
خدانخواستہ وہاں بُری بنی تو دنیا کی فانی لذتیں کیا فائدہ دے سکتی ہیں۔ تو یہ تو ایسی مثال
ہوگی کہ جیسے تیمور کی اولاد اس سے بحث نہیں کہ صحیح النسب ہیں یا نہیں صاحبِ عالم اور شاہ زادے

کہلاتے ہیں تو در بھیک مانگتے پڑے پھرتے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔ ان کو اس تصور سے
کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ان کے باپ دادا واقع میں بادشاہ تھے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ان میں
کوئی سمجھ دار ہے اور سمجھ دار ہوتے تو اس درجہ کو کیوں پہنچتے بہرکیف اگر کسی کو ذری سی عقل
بھی چھو گئی ہے تو اس شاہزادگی کا خیال ایسا ہے جیسے کوڑھ میں کھاج۔ یہی دنیاوی آسایش
کا حال ہے عاقبت کی تکلیف کے مقابلے میں قرآن سے اس کی تصدیق بھی لو۔ اَفَرَءَیْتَ اِنْ
مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ مَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ۔ بھلا دیکھو تو اگر ہم نے ان کو چند
سال دنیاوی فائدوں سے متمتع ہونے بھی دیا اور پھر آخرکار عذاب موعود آ پہنچا تو وہ تمتع گزشتہ ان
کے حق میں کیا مفید ہوگا۔ ہاں تو خدا نے اپنے پیغمبر کے ساتھیوں کو جوع یعنی فقر و فاقے سے آزمایا اور
انھوں نے اس مصیبت کو صبر اور استقلال اور شکرگزاری اور خوش دلی کے ساتھ انگیز کیا اور خدا نے
دنیا اور دین دونوں میں ان کا اجر دیا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ خدا اُن سے راضی اور خوش اور وہ خدا
سے راضی اور خوش ہم میں بھی جس کو خدا چاہتا ہے (اور شاید ایسے بہت ہیں) بھوک کی تکلیف سے
آزماتا ہے۔ کتنے خدا کے بندے ہیں جن کے عیال بہت۔ آمد کم۔ مہنگا سما۔ کمائی خرچ کو مکتفی نہیں
ان پر اکثر ایسے دن گزر جاتے ہیں کہ امرود سنگھاڑے بھٹے۔ گاجریں۔ بونٹ۔ آم۔ خربوزے۔ موسم
کی جو چیز سستی دیکھی اُسی پر قناعت کر کے رہ گئے۔ چار پیسے کے چنے منگوا لیے۔ مٹھی مٹھی سب نے کھا لیے
اوپر سے ڈگڈگا کر پیا پانی۔ پیٹ میں ہوا بوجھ۔ پڑ کر سو رہے۔ باوجودے کہ مرد عورت اپنی اپنی جگہ سب
محنت کرتے ہیں مگر کیا کریں کسی طرح پوری نہیں پڑتی۔ یہ مت خیال کرو کہ جو فاقے کرتے ہیں اُن ہی
کی آزمایش منظور ہے خدا اُن کا صبر آزماتا ہے کہ دیکھیں تکلیف میں بھی ہم کو یاد کرتے ہیں ہماری شکرگزاری
اور ہمارے فضل و کرم کی امیدواری کرتے ہیں یا نہیں۔ اور مقدور والوں کے دلوں کا امتحان لینا
کہ کہاں تک غریبوں پر ترس کھاتے اور خدا کے دیے ہوئے میں سے بقدر توفیق مساکین کو
پہنچاتے اور محتاجوں کی ہمدردی کو اپنا فرض جانتے۔ جس جوع کا میں بیان کر رہا ہوں اگر روزے
کو بھی اس میں داخل سمجھا جائے تو کچھ نا مناسب نہیں۔ یہ بھی حقیقت میں بڑا امتحان ہے کہ ہوتے
سوتے آدمی صرف خدا کے لیے سارے دن مونہ بند رکھے نہ کچھ کھائے نہ پیئے۔ اس سے
انسان کو رزق کی قدر ہوتی۔ اور فاقہ کشوں کی مصیبت کو پہچانتا۔ اور یہی درماندگی اُس پر ظاہر

ہوتی۔ کہ ایک دن کی بھوک پیاس میں کیا حال ہو جاتا ہے۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفسانی
خواہشوں کے روکنے کے لیے روزے سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ اب دیکھو کہ ہم اس بھوک کی
کس طرح برداشت کرتے ہیں۔ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ کتنے لوگ بے عذر روزے نہیں رکھتے اور
جو رکھتے ہیں اُن کا روزہ اتباع رسم کے طور پر ہوتا ہے۔ لوگوں کے چھیڑنے کے ڈر سے کہ نہ رکھیں گے
تو لوگ روزہ خور کہیں گے۔ خدا کا چور بنائیں گے۔ گرمیوں کے دنوں میں دیکھا کہ پہر دن چڑھے
سے پانی کا فوارہ ہاتھ میں ہے اور پچھالوں پانی اپنے اوپر سے لڑھکائے چلے جا رہے ہیں۔ بے شک
کسی قدر ضعف بھی ہے مگر نہ ایسا کہ ہمت ہارے دیتے ہیں۔ اگر لوگ روزے کو حکم خدا سمجھ کر خوشی
دل کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کریں تو میں خیال کرتا ہوں رمضان کی اس قدر فریاد اور واویلا
نہ ہو جتنی کہ دیکھی اور سُنی جاتی ہے۔ اَلاَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ عمل کا مدار نیت پر ہے یہ ایک حدیث متواتر
ہے اور نیت کا حال سب سے بہتر تو خدا جانتا ہے اور خدا کے بعد خود صاحب نیت۔ ہم تو ظاہر پر حکم
لگانے والے ہیں آدمی اپنے اور خدا کے مقابلے میں دوسرے کو کیوں دخل دے۔ آپ ہی اپنے
نفس کا احتساب کیوں نہ کر لیا کرے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک قدرتی "مفتی" لگا ہے دوسرے مفتی
سے تو غلطی کے ہونے کا بھی احتمال ہے اور یہ مفتی کبھی خطا کرتا ہی نہیں۔ اِستَفتِ قَلبَکَ جب
کسی بات میں خلجان ہو اپنے دل سے پوچھ لیا کرو۔ اب الٰہی امتحان کی تیسری چیز باقی رہی اور
امتحان ختم۔ وہ کیا ہے؟ وَنَقصٍ مِّنَ الاَموَالِ وَالاَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ کمی مالوں میں اور جانوں میں
اور پھلوں میں۔ امام لغت صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ اہل عرب میں مال کا اطلاق صرف
چار پایوں پر ہوتا ہے جیسے اونٹ۔ گھوڑے۔ بھیڑ۔ بکری اس واسطے کہ ان لوگوں کے پاس
اور کسی قسم کا مال نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو شاذ۔ جیسے ہمارے ملک میں غالب غذا روٹی ہے
اور بولتے ہیں کہتے ہیں روٹی کا وقت آیا یا روٹی کھانے گئے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات روٹی
نہیں بھی ہوتی بلکہ اس کی جگہ صرف پلاؤ یا اور کوئی چیز۔ اہل لکھنؤ اس ٹم کو تو پوچھتے نہیں اور
ہمارے اس محاورے پر ہنسا کرتے ہیں۔ مالوں۔ جانوں۔ اور پھلوں کی کمی اس قسم کے
نقصانات ہیں کہ کسی زمانے میں کوئی صنف بشر بلکہ غالباً کوئی فرد بشر ان سے محفوظ نہیں
اور قرن اول کے مسلمانوں کی کیا پوچھتے ہو وہ بے چارے تو شروع شروع میں دنیا کے اعتبار سے

ہر طرح گھاٹے ہی گھاٹے میں تھے۔ سرے سے ان کو اپنی زندگی ہی کا بھروسہ نہ تھا۔ وہ ایمان
لائے تیچھے اور مرنا ٹھان لیا پہلے اُن کو یقیناً معلوم تھا کہ ہم نے ایک خدا کا نام لیا اور ہم مسلم
ہوا۔ خوب جانتے تھے کہ پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کی اور زن و فرزند اور بھائی بند۔ اور گھر بار
اور مال و متاع اور عزیز و قریب اور دوست آشنا اور اعوان و انصار سب کچھ چھوڑنا پڑا کسی
کا خون کیا ہو۔ ڈاکہ مارا ہو۔ چوری کی ہو کسی کے گھر میں کود پڑا ہو تو کچھ دے دلا کر منت
خوشامد کر کے سعی سفارش بہم پہنچا کر بھی بچ سکتے ہیں۔ ان لوگوں سے خدائے واحد پر ایمان
لانے کی جرم کی معافی کی امید رکھنی ہی فضول ہے۔ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ
الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ان پر قصور ثابت کیا تو یہ کہ خدا پر ایمان لائے جو سب پر غالب
اور جس کا سارا جہان ثناخواں اور جس کی ملک زمین و آسمان میں تم سے شروع سے کہتا آتا ہوں کہ
خدا نے اصحاب پیغمبر خدا صلعم کو ہر ہر طرح سے جانچا ہر ہر طرح سے آزمایا اور ان کو کامل العیار پایا
پھر اس کی سرکار میں کاہے کی کمی تھی۔ دنیا کی بادشاہت تو ان کی جوتیوں سے لگی لگی پھرتی تھی
ساٹھ برس کی بھی کچھ لمبا ہے۔ اتنے ہی قلیل عرصے میں تمام روئے زمین پر اسلام کا سکہ بٹھا دیا۔ اور
دین میں جو ان کے مراتب ہیں ان کی تو خدا ہی کو خبر ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً
بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے آنکھوں کی کیسی کیسی ٹھنڈک خدا نے
لگا رکھی ہے بدلہ اُن کے عملوں کا انہوں نے تو دین کے پیچھے یوں اپنی جانیں کھپا دیں اور امت
پیغمبر نے یہ اُن کا گن مانا کہ ان میں سے پیغمبر کے بڑے مشیر اور جلیس اور ایک اعتبار سے محسن تھے
لگے ان ہی کو گالیاں دینے اور تبرا کرنے۔ اس سے بڑھ کر بھی احسان فراموشی کی کوئی بات ہوگی
اب پھر امتحان کے مضمون کی طرف عود کرتے ہیں۔ مگر ایک بات اس آیت میں خیال کرنے کی
لائق ہے کہ اس آیت میں عطف کے دو سلسلے ہیں ایک مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ۔ اور دوسرا
مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ دونوں سلسلوں میں تین تین چیزیں ہیں پہلے سلسلے کی
ترتیب میں ترقی ہے ادنے سے اعلیٰ کی طرف۔ کیوں کہ خوف ایک ہلکی اور آسان چیز ہے بمقابلہ
جوع کے اور اسی طرح ہلکی اور آسان چیز ہے بمقابلہ نقص کے لیکن یہ ترتیب دوسرے سلسلے
میں بظاہر الٹ پلٹ سی ہو گئی ہے۔ کیوں کہ جان عزیز تر اشیا ہے وہ تو آپڑی ہے بیچ

میں اور ثمرات آیا ہے بعد لیکن اس میں ایک نکتہ ہے۔ میں نے تو کسی تفسیر میں دیکھا نہیں شاید کسی اور
کی نظر سے گزرا ہو۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ثمرات سے مراد ہے رزق اور وہ ہے مدار حیات۔ اس کی قدر کوئی
زمینداروں سے پوچھے جو غلہ پیدا کرتے ہیں۔ تم یعنی شہرے اہل شہر تم میں سے اکثروں کو شاید کھیت کے پیڑ
دیکھنے کا بھی اتفاق نہ ہوا ہوگا۔ زمیندار ایک ایک بالشت زمین کے لیئے لڑنے اور مرنے کو
طیار ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ زمین کو نہ صرف اپنی معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اولاد اور اولاد
کی معاش کا بھی تو ثمرات جان سے بھی زیادہ عزیز ہوئے۔ اور یہی سبب ہے ثمرات کے سب کے
آخر میں واقع ہونے کا۔ ہٰذا مَا اَلْہَمَنِی رَبِّی۔ خیر امتحان تو ہو چکا اب باقی رہیں دو باتیں۔ ایک تو
معیار کامیابی جس طرح مدرسوں کے امتحانوں میں ہوتا ہے کہ مثلاً سو نمبر کامل ہیں اور پاس ہونے
کے لیئے کم سے کم ایک ثلث نمبروں کا حاصل کرنا ضرور ہے۔ اسی طرح اس امتحان الٰہی کے لیئے بھی کوئی
معیار کامیابی مقرر ہونی چاہیئے دوسرے کامیابی کا صلہ کہ امتحان میں پورے نکلے تو سرکار سے
کیا انعام ملے گا وظیفہ یا تمغا یا لقب کتابیں یا نوکری یا خطاب۔ چاہیئے تھا کہ معیار کامیابی اور صلہ
کامیابی دو چیزیں تھیں دونوں کا بیان الگ الگ ہوتا لیکن یہی تو کلام الٰہی کی خوبی ہے جتنا
غور کرتے جاؤ وجوہ بلاغت نکلی چلی آتی ہیں۔ امتحان دے چکنے کے بعد طالب العلموں کو نتیجہ معلوم
کرنے کی جلدی ہوتی ہے اسی لیئے خدائے تعالیٰ نے نتیجہ اور صلہ دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا بلکہ صلے
کو پہلے ادا فرمایا۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْہُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِکَ
عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُہْتَدُوْنَ۔ اور اے پیغمبر خوشخبری دو صبر کرنے والوں
کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہو تو کہنے لگیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے
یہی ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی عنایتیں ہیں اور رحمۃ اور یہی ہیں ٹھیک راستے پر چلنے والے
صلۂ انعام کو خدا تعالیٰ نے اس عمدگی سے بیان فرمایا ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ہو نہیں
سکتا نہیں کہا کہ ان کو ابد الآباد تک رہنے کے لیئے باغ ملیں جن میں شہد اور دودھ اور شراب
طہور کی نہریں بہ رہی ہوں گی۔ جو سدا ہرے بھرے پھلے پھولے رہیں گے جن میں خزاں کا گزر نہیں
نہیں کہا کہ اُن کو دنیا میں بناؤ سنگار کی ممانعت کی گئی تھی کہ مرد ہو کر عورتوں کی طرح سونے چاندی
کے زیور اور ریشمی کپڑے نہ پہنو اب اُن سے یہ بندی اُٹھا دی جائے گی اور اجازت ہوگی کہ جو چاہو

بہنو نہیں کہا کہ ان کو خدمت کے لیے حوریں ملیں گی۔ نہیں کہا کہ وہ کامل آسودگی اور خوشی اور
رضامندی اور اطمینان اور پوری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ نہیں کہا کہ اُن کو خدا کا
دیدار ہوگا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اے پیغمبر ان کو خوش خبری دو۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بادشاہ
کسی ملازم سے کہے کہ تم فلاں خدمت بجا لاؤ گے تو ہم تم کو نہال کر دیں گے۔ بادشاہ کے
اس ابہام میں بہت بڑی گنجائش ہے بہ نسبت اس تصریح کے کہ تم کو خلعت ہفت پارچہ یا جاگیر
یا خطاب یا منصب دیں گے۔ وعدہ وفا کرنے کا وقت آئے گا تو ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔
بادشاہ اپنے حوصلے کے مطابق داد و دہش کرے گا۔ جب دنیا کے بادشاہوں کا یہ حال ہے تو یہ
وعدہ تو شاہنشاہِ دو جہاں کا وعدہ ہے جس کی سرکار میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ خوش نصیب اُن کے
جن کو پیغمبر خدا صلعم خدا کی طرف سے خوش خبری دیں۔ بس سمجھ لو کہ سدا کے در پار ہو گئے۔ پھر
خالی خوش خبری امیدوار بودہ بدانند۔ نہیں خوش خبری کے ساتھ اُن کو صابرین کا خطاب بھی
دیدیا۔ اس دنیا کو بھی نمونہ عاقبت سمجھو۔ یہی باتیں جو یہاں ہیں وہاں بھی ہیں مگر یہ نقل ہیں وہ
اصل یہ مجاز ہیں وہ حقیقت یہ ناقص ہیں وہ کامل۔ یہ فانی ہیں وہ باقی۔ دنیا کے بادشاہ بھی جس سے
خوش ہوتے ہیں۔ علی قدر مراتب خطاب دیتے ہیں تاکہ ہم چشموں میں صاحب خطاب کی عزت و آبرو
ہو لیکن چونکہ دنیا خود تمام تر بیہودہ ہے اس کی کوئی بات بیہودگی سے خالی نہیں وہی کہاوت ہے
کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ خطابات ہیں تو بیہودگی کی کوئی حد باقی نہیں رہی
مجھکو فرعون کے انا ربکم الاعلیٰ کہنے پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ بھی آخر ہماری ہی طرح کا آدمی تھا بھوک
کی سہار۔ پیاس کی برداشت نہ کر سکتا ہوگا۔ جیسے ہم نہیں کر سکتے۔ ذرا سی دکھ میں بے چین ہو جاتا
ہوگا جیسے ہم بے چین ہو جاتے ہیں بے سوئے اس کو بھی قرار نہ آتا ہوگا جیسے ہم کو نہیں آتا۔ پھر
کس منہ سے وہ اپنے تئیں انا ربکم الاعلیٰ کہا کرتا تھا۔ کم بخت اتنا تو سمجھا کہ پیدا اس نہیں کر سکتا
مرے ہوئے کو جلا نہیں سکتا۔ پانی میں نہیں پھر سکتا۔ زمین سے غلہ میں نہیں اُگا سکتا۔
رب اور رب بھی ربکم الاعلیٰ کیونکر ہو سکتا ہوں۔ لیکن جب سے میں نے فلک قدر اور کیوان جاہ اور
سلیمان شکوہ اور اسی قسم کے دوسرے خطابات سُنے سمجھ لیا کہ انسان کی ترقی کچھ انتہا نہیں بے شک
اس احمق نے انا ربکم الاعلیٰ کہا ہوگا۔ اور ابھی تک ایسے احمقوں کا پیدا ہونا بند نہیں ہوا جو ربکم الاعلیٰ

بننے کے لئے طیار ہیں۔ خیر تو غرض خدا وند تعالیٰ جل وعلا شانہ کی سرکار سے بھی نیکو کاروں کو خطاب ملتے ہیں وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ یہ سب الٰہی خطاب ہیں اسی طرح مومنین متقین محسنین وغیرہ۔ اور من جملہ ایسے خطابوں کے ایک خطاب صابرین بھی ہے جس طرح دنیاوی خطابوں کے مراتب متفاوت ہیں دینی خطابات کا بھی یہی حال ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ صابرین کا خطاب کس درجے کا ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ خطاب مقربان حضرت ربوبیت کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے معیت دلالت کرتی ہے تقرب اور مصاحبت پر۔ پس کمال بندگی یہ ہے کہ بندے کو خدا کا تقرب ہو اور غلمان اور باغ رضوان کسی کی تقرب الٰہی کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس خطاب معزز کے اہل اور مستحق وہ لوگ ہیں جو مصیبت پڑے پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ بے سمجھے بوجھے عادت کے طور پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ زبان سے کہہ لیا بعض لوگ قسم کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ اور بات بات میں بے ساختہ واللہ باللہ کہہ بیٹھتے ہیں اس کو اصطلاح شرع میں یمین لغو کہتے ہیں ایسی قسم پر کفارہ تو نہیں آتا لیکن ایسی بے پروائی کے ساتھ خدا کا نام لینا بڑی بے ادبی اور بے تمیزی کی بات ہے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ مونہ سے بولو کہ اب بھی باز رہو گے یا نہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کی بھی عادت سی پڑ گئی ہے۔ تو جیسے وہ واللہ باللہ یمین لغو ہے ویسا ہی یہ انا للہ استرجاع فضول۔ نہ اس پر کفارہ نہ اس پر ثواب۔ جو شخص صرف عادتاً مونہ سے انا للہ کہتا ہے وہ نہ بشارت کا مستحق ہے نہ خطاب صابرین کا اہل۔ نہ صلوات پروردگار کا منزاوار اور نہ اس کی رحمت کے قابل۔ قالوا انا للہ سے مراد ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا مفہوم اور مطلب اس طرح دل میں بیٹھا ہوا ہو جیسے پتھر میں نقش کہ مصیبت کے وقت بھی اسی کا یقین ہو اور فریاد اور واویلا بین کے عوض مونہ سے بھی وہی نکلے تب صبر کا اجر ملے۔ اب سمجھو تو کہ انا للہ و اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ ہم خدا کے ہیں اور ہم کو اُس پاس لوٹ کر جانا ہے۔ ظاہر میں تو بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے یعنی مصیبت کے ساتھ اس کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ بادی النظر میں ایسا

ہلہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے کہے پر چلتے ہیں ان کو پیغمبروں اور صدیقوں اور شہیدوں اور نیکیوں کی رفاقت نصیب ہو گی جن پر اللہ نے انعام اور فضل کیا ہے ۱۲

طرح کی کوئی دعا ہوتی تھی کہ اے خدا ہم کو صبر کی توفیق دے۔ یا ہمارے گناہ معاف فرما۔ یا ہم پر رحم کر
یا میت کو بخش۔ پس ماندوں کو صبر دے۔ یہ کیا کہ ہم تیرے ہیں اور تیری طرف ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔ وعظ
بہتیرے سنتے ہو مگر یہ نکتے جو فقیر کے وعظ میں ہوتے ہیں کہیں نہ سنے ہوں گے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ
مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ لیکن کلام الٰہی بے تکا نہیں ہو سکتا۔ بے تکے ہم اور بے تکی ہماری
سمجھ۔ خدا عقل سلیم دے تو معلوم ہو کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ میں رضا و تسلیم اور دعا دونوں باتیں ہیں۔
یہ کہنا کہ ہم اللہ کے ہیں اُس خصوصیت پر دلالت کرتا ہے جو ہم کو خدا کے اور خدا کو ہمارے ساتھ ہے
مگر افسوس ہم اس کو نہیں سمجھتے اور کسی قدر سمجھتے بھی ہیں تو اُس پر عمل نہیں کرتے۔ یعنی ہمارے
افعال سے ثابت نہیں ہوتا کہ ہم خدا کے ساتھ ایک خاص طرح کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اب دنیا
کی خصوصیتوں پر نظر کرو جن کے پیچھے ہم شبانہ روز حیران سرگرداں اور پریشان پڑے پھرتے ہیں۔
اول تو دنیا جب آنی جانی اور ایک سرائے فانی ہے دنیا کی کسی خصوصیت کو گو وہ کیسی ہی قریب
اور قوی کیوں نہ ہو خصوصیت سے تعبیر کرنا ہی غلطی ہے۔ سب سے پہلی اور شاید سب سے زیادہ قوی
سب سے زیادہ خالص وہ خصوصیت ہے جو بچے کو ماباپ سے اور ماباپ کو بچے سے ہوتی ہے لیکن ہم جتنے
اس جگہ موجود ہیں کیا مرد کیا عورت سب اپنی اپنی عمر میں بچے رہے ہیں۔ ہم میں اکثروں کے آگے اولاد
ہے۔ اور گھر گھر اس کی مثالیں موجود ہیں کیا ہم کو یا کسی کو بڑے ہوئے پیچھے اپنے ماباپ کے ساتھ یا ماباپ
کو ہمارے ساتھ وہی بچپنے کی سی خصوصیت باقی ہی نہیں جن ماباپ کی اولاد اُن کے آگے
مر جاتی ہے۔ کیا وہ بھی اولاد کے ساتھ مر جاتے ہیں نہیں جس کے ماباپ اُس کے سامنے مرتے
ہیں کیا وہ دنیا سے ناراض ہو کر ماباپ کے ساتھ مر جاتا ہے۔ نہیں۔ کوئی ماباپ اولاد کا۔ کوئی
اولاد ماباپ کا دُکھ میں۔ درد میں۔ بیماری میں۔ تن درستی میں ساتھ دیتا ہے۔ نہیں۔ ما ہو یا باپ
یا اولاد سب اشخاص جداگانہ ہیں۔ ہر ایک کی روزی جدا۔ بھوک جدا۔ پیاس جدا۔ خواہش جدا
عمر جدا۔ تقدیر جدا۔ یہ ایک انتظام الٰہی ہے کہ ایک سے ایک پیدا ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں تک
کہ تمام روئے زمین پر ایک ہی آدم کی نسل پھیلی ہوئی ہے اور اسی طرح جب تک خدا کو منظور ہے
ایک سے ایک پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ ماباپ اور اولاد میں تو ایک طرح کی جزئیت بھی ہے جب
ان ہی میں ایک کو ایک سے خصوصیت نہیں تو دوسرے رشتے ناطوں اور دوستیوں اور

مجنونوں کا کیا مذکور ہے۔ دنیا میں جتنے رابطے ہیں بس ان کو راہ چلنے کی صاحب سلامت سمجھو اور جب تم اُس صاحب سلامت کو خصوصیت بنانا چاہتے ہو تو قطع نظر اس سے کہ تمہارے بنائے خصوصیت بن نہیں سکتی اس کا صاف مطلب یہ ہو کہ تم درپردہ انتظام الٰہی میں دخل دیتے ہو۔ تو ایسے شخص کا وہی جواب ہو جو خدا نے قرآن میں دیا ہو۔ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ۔ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ دنیا اور آخرت میں خدا اس کی مدد نہیں کرے گا تو چاہیئے کہ آسمان میں ایک رسی لٹکائے اور پھانسی لے کر مر رہے اور دیکھے کہ جو بات اس کو ناپسند تھی اس تدبیر سے بھی دفع ہوئی یا نہیں۔ آدمی کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہو کہ دنیا میں اکیلا باسائش زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک دم کے لیئے اتنے لوازم درکار ہیں کہ ایک لشکر ہو تو سرکار کا کام چلے کاشتکار۔ معمار۔ لوہار۔ بڑھئی۔ سُنار۔ بنیئے بقال۔ ہر قسم کے تاجر ہر طرح کے کاری گر۔ درزی۔ موچی۔ حجام۔ دھوبی۔ خاکروب۔ سقے۔ قلعی گر ٹھٹیرے اور کون اور کون ایک دنیا اس کی ٹہل میں لگی ہو اور ذرا اس کے بھانویں نہیں۔ حاکم اپنے عملے لیئے ہوئے وقت پر کچہری میں حاضر ہوتا ہو کہ شاید کسی کو کوئی فریاد کرنی ہو۔ دن رات میں چار چار پانچ پانچ مرتبہ ریل طیار رہتی ہو کہ شاید کسی طرف جانا چاہیئے یا کوئی خط یا اسباب روانہ کرے تار کا بابو منتظر بیٹھا ہو کہ اشارہ پاؤں تو جہاں کی کہیں ابھی خبر منگاؤں۔ چھاپے والے کتابیں چھاپ رہے ہیں کہ خدا جانے کون سی کتاب مانگ بیٹھے۔ مدارس مدرسے میں موجود ہیں کہ صاحب زادہ بلند اقبال تشریف لائیں اور سبق پڑھیں ڈاکیں دوڑ رہی ہیں۔ سڑکیں بن رہی ہیں تفریح کے لیئے باغ لگے ہیں۔ غرض عجیب سلسلہ ہو کہ ہر متنفس خادم و مخدوم اور محتاج اور محتاج الیہ اور آمر و مامور اور حاکم و محکوم اور اجیر و مستاجر سب کچھ ہو۔ ایسی حالت میں وہ انسان نہیں جو کثیر العلائق نہیں۔ انسان کیسا ہی غیور اور تنک مزاج کیوں نہ ہو اُس کو چار و ناچار دوسروں سے مدد لینی ہی پڑتی ہو۔ اور یہ امداد و استمداد کا علاقہ تعلق کی اصل اور خصوصیت کا ماخذ ہو۔ ہم زیر بار احسان ہیں والدین کے رشتہ داروں کے عزیزوں کے۔ دستوں کے۔ اُستاد کے۔ حاکم وقت کے۔ اور خدا جانے کتنوں کے۔ جتنا جس کا احسان اُتنا اُس کی طرف دل کا کھنچاؤ اور خاطر کا میلان۔ غور کر کے دیکھا جائے تو اگرچہ ساری دنیا ہمارے ہی آرام و آسایش کی تدبیریں کر رہی ہیں مگر اس کی کنجی کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہو ورنہ چاہیے

توساری کل بے کار سارا ڈھوڈا اٹینڈ۔ اگر ہم کو کسی سے کچھ فائدہ پونہچتا ہی تو وہی نفع رسانی کا خیال
اُس کے دل میں ڈالتا اور اُس کو نفع رسانی کی قدرت دیتا۔ پس اگر سچ پوچھو تو اصل کارساز
اور محسن وہ ہی اور یہ ظاہر کے مددگار اُسی کے احسان کے ذرائع اور وسائل ہیں قطعہ

گر گزندت رسد ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست

پھر بعض چھوٹے چھوٹے اور ہلکے ہلکے احسان تو وہ ہم پر ان مددگاران ظاہر کے ذریعہ سے کرتا ہی اور
بڑی بڑی سترگ باتیں اس نے خاص اپنے ید قدرت میں رکھی ہیں جن میں کسی فرد بشر کو کچھ دخل
نہیں۔ اور بدون ان کے ہماری زیست محال۔ آؤ اسی کے لفظوں میں اس کے احسان گنوائیں
اَللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ
لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَ
لْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ اللہ ہی نے آسمانوں کو اور زمین
کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی برسایا پھر اُس کی وجہ سے تمہاری روزی کے لیئے غلے اور پھل
نکالے اور ناؤں پر تم کو اختیار دیا کہ اس کے حکم سے دریا میں چلیں اور سورج اور چاند کو تمہاری
خدمت کے لیئے مصروف کیا کہ دونوں رات دن اپنے اپنے کام میں لگے ہیں اور تمہاری خدمت
کے لیئے رات دن کو بنایا اور جو کچھ تم کو درکار تھا باندازہ مناسب تمہارے لیئے مہیا کیا اور
اللہ کی نعمتوں کو گنا چاہو تو اُن سب کو گھیر نہ سکو اس میں شک نہیں کہ انسان بڑا ہی جفاکار اور
کافر نعمت ہی۔ اگر اس آیت کی تفسیر کرنے پر آؤں تو کہیں مہینوں میں جا کر تمام ہو تو ہو اور مجھے بھی
وہی آیت پوری کرنی ہی جس کا بیان شروع کیا تھا تو اس مقام پر میں اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اس
آیت میں جو خدا نے اپنے چند احسان گنوائے اُن میں ایک ایک ہماری زندگی کا موقوف علیہ ہی اور
انسان کے اختیار سے خارج۔ سعدی نے اسی آیت سے اقتباس کیا ہی قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانی بکف آری و بغفلت نہ خوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

پس اگر تعلق اور خصوصیت کا مدار نفع رسانی اور احسان پر ہی اور یوں ہی ہی بھی تو ہم کو سب سے

زیادہ خصوصیت خدا کے ساتھ ہونی چاہیئے لیکن خدا آنکھ سے دکھائی دینے کی چیز نہیں۔ ہم کو سوچنے اور غور کرنے کی عادت نہیں۔ نتیجہ یہ ہی کہ ہم اپنے دل سے خدا کے ساتھ گویا کچھ تعلق نہیں رکھتے نہ اُس کے حقوق مانتے۔ اور نہ اُس کے حکموں پر چلتے۔ اُس سے محبت کرتے۔ اور نہ اس کی خفگی سے ڈرتے۔ مگر اس کا تعلق ہمارے ساتھ ایسا لازمی تعلق ہی کہ کسی طرح منفک اور جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہماری ہستی ہی اس کے تعلق کی دلیل ہی۔ ہم آپ سے آپ پیدا نہیں ہوگئے ماباپ نے ہم کو پالا پرورش کیا مگر اُس کے حکم سے کہ اُس نے ہماری محبت ماباپ کے دل میں ڈالی لیکن ماباپ پر بھی پالنے اور پرورش کرنے کا اطلاق مجازاً ہی۔ حقیقت میں پیدا کرتا اور پالتا اور پرورش کرتا ہی خدا۔ سیکڑوں ہزاروں آدمی اولاد کی تمنا کرتے ہیں اور نہیں ہوتی۔ اور ماں کا دودھ سوکھ جاتا ہی نہیں اُتار سکتی۔ بچہ بیمار پڑتا ہی کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ اور بن آتی بھی ہی تو اُسی کے حکم سے اُسی کی مرضی سے غرض نہ ہم اپنے ارادے سے پیدا ہوئے نہ کسی اور کے ارادے سے۔ اور نہ اپنے ارادے سے اتنے بڑے ہوئے اور نہ کسی اور کے ارادے سے۔ جو کچھ کیا خدا نے کیا۔ اور جو کچھ ہو رہا ہی اُسی کے کرنے سے ہو رہا ہی۔ اور جو کچھ ہوگا اُسی کے کرنے سے ہوگا۔ بے شک دنیا میں بڑی سے بڑی محبت ماباپ کی ہی وہ بھی میں خیال کرتا ہوں ایک خاص حالت اور ایک وقت خاص تک۔ لیکن ماباپ کی محبتوں میں سے ایک اعلیٰ درجے کی محبت کو مثلاً اکلوتے بیٹے کی اور اس کو خدا کی محبت کے ساتھ مقابلہ کرکے دیکھو تو دونوں محبتوں میں کچھ بھی مناسبت نہیں پاؤگے۔ وہ شاید اضطراری ہی اور یہ اختیاری۔ اُس میں شاید کوئی غرض بھی ہی۔ اور اس میں غرض کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ بہ تو ہی اور یہ اصل۔ وہ برائے نام ہی اور یہ لاکلام۔ ماباپ غایت مافی الباب یہ کہ تدبیر کرنے والے ہیں اور خدائے تعالیٰ سامان بہم پہنچانے والا۔ ماباپ کی محبت جتنی اور جیسی کچھ ہی اُسی پر اُن کی کس قدر اطاعت آئی ہی کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہی وَقَضیٰ رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَا اَوْ کِلَاھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا۔ ای پیغمبر تمہارا پروردگار حکم دیتا ہی کہ اللہ کے سوائے کسی کو مت پوجو اور ماباپ کے ساتھ احسان کرتے رہو۔ اگر ان میں ایک یا دونوں تیری زندگی میں بوڑھاپے کو

پہونچ جائیں تو خبردار اُن کے آگے ہُوں بھی مت کرنا نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے بات کرنا تو تعظیم اور تکریم کے ساتھ اور مارے ادب کے ان کے آگے جُھکے رہنا اور اُن کے حق میں دعا کرنا کہ ای پروردگار جس طرح اُنہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا ہے اُن پر رحم فرما باپ کے درجے کو ذری خیال کرنا کہ خدا نے اپنی عبادت کے ساتھ ماباپ پر احسان کرنے کا حکم دیا۔ ماباپ کے اتنے سے حق پر اُن کا یہ ادب ہی تو خدا کے حقوق کا تو کچھ شمار نہیں اُس کا کیسا کچھ ادب نہ ہوگا۔ مگر آدمی ایسا ناحق شناس ہی کہ ماباپ کا تو بعض سعادت مند سو بھی شاذ و نادر کچھ حق مانتے بھی ہیں خدا کو تو اکثر خدا کے بندے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہی کہ اس کی عبادت اور شکر گزاری کریں۔ تو جب مصیبت کے وقت بندے نے اِنَّا لِلّٰہ کہا تو اس کے یہ معنی کہ اُس نے خدا کے حقوق تسلیم کیئے اور وہ تعلق اور خصوصیت جو خدا کو اس کے ساتھ ہی اور وہ شفقت اور رحمت جو ہمہ وقت اُس کے حال پر مبذول ہی اور وہ ربوبیت اور مربوبیت اور ملکیت اور مملوکیت کی نسبت جو خدا میں اور اُس میں قایم ہی یہ سب باتیں اُس کو یاد آگئیں بس پھر کیا تھا انسان نے اس طرف توجہ کی نہیں اور غم غلط ہوا نہیں۔ اس کے بعد اس کو ضرور دوسرے دوسرے خیالات آئیں گے۔ اس کو ندامت ہوگی اپنی تقصیر پر تنبہ ہوگا اپنی غلطی پر کہ فانی ہو کر ایک فانی چیز کے ساتھ میں نے کیوں ایسا تعلق پیدا کیا اور کس لیئے اُس کو اپنے دل میں اس قدر جگہ دی۔ مجھ کو ادنےٰ درجے کے حق کا تو پاس ہوا اور اعلےٰ درجے کے حقوق کو ضائع کیا۔ میں نے سانپ تو نکل جانے دیا اور لکیر کو پڑا پیٹتا رہا میں نے باورچی کا تو احسان مانا اور میزبان کی شکر گزاری نہ کی۔ دریا کو چھوڑا اور سیراب کی طرف دوڑا پھر وہ اپنے تئیں ملامت کرے گا کہ مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی احسان فراموش ہوگا کہ ساری عمر نعمتیں کھائیں مزے کیئے چین اُڑائے جن میں سے مجھ کو ایک رتی برابر بھی کسی کا استحقاق نہ تھا اور اب جو ذرا سی بات خلاف مزاج پیش آئی جس کی لِم مجھے معلوم نہیں جس کی مصلحت سے میں آگاہ نہیں تو لگا مُونہ بنانے اور بڑبڑانے پچھلا دیا دلایا اکارت کھایا پلایا ضائع۔ میں اس کارخانۂ دنیا کا مالک نہیں مختار نہیں۔ مالک کا مشیر نہیں صلاح کار نہیں۔ میں دخل درمعقولات دینے والا کون مجکو چون وچرا کرنے کا کیا حق۔ مجکو دیکھو اور خدا کی خدائی پر اعتراض کرنے کو دیکھو۔ کیا میں اور کیا

میری حقیقت۔ کیا میری عقل اور اُس کی اصلیت۔ یہ سمجھ میں آنے کی بات ہی کہ ایسے خیالات کے آگے رنج اور غم کھڑا رہ نہیں سکتا اور تجربے میں بھی آیا ہی کہ اگر کسی طرح کا نقصان ہو جائے یا کوئی آفت آئے اور صدق دل سے اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہ راجعون پڑھے تو اگر خدا کو منظور ہوتا ہی تو نقصان کی تلافی ہو جاتی ہی۔ گم شدہ چیز پا جاتی ہی ورنہ رنج و افسوس کا اثر تو دل سے یقیناً کم ہو جاتا ہی اِنّا اِلیہ راجعون کیسے پیارے الفاظ ہیں دو لفظوں میں دو مطلب۔ دعا کی دعا اور تسکین کی تسکین۔ دعا کیا ہی خدا سے آرزو کرنا سو اِنّا اِلیہ راجعون میں بھی آرزو ہی مگر مقدر یعنی لفظوں میں مذکور نہیں۔ یہ اس قسم کا جملہ ہی کہ جیسے دو مسافر راہ چلے جاتے ہوں اور ایک شکایت کرے کہ بھائی میں تو تھک گیا اور اُس کا رفیق اُس کو تسلی دے کر گھبراتے کیوں ہو جلد منزل پر پہنچنے والے ہیں یعنی منزل پر پہنچ کر آرام ملے گا۔ اسی طرح یہاں ہی کہ کیوں رنجیدہ ہوتے ہو ہم خدا کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں یعنی وہ ہماری تکلیف کی راحت دے گا۔ یہی دعا ہی بلکہ اذعان قبولیت کے ساتھ اور اشارہ ہی اس آیت شریف کی طرف۔ یَا اَیُّہَا الْاِنسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلیٰ رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلَاقِیہِ۔ اے انسان تو اس دنیا کی زندگی کو بھی سمجھا ہی کہ کیا ہی۔ ایک سفر شاق ہی اور جانا کہاں ہی پروردگار کی طرف پھر اُس سے ملاقات ہونی ہی۔ اِنّا اِلیہ راجعون سے یہ بات بھی نکلے کہ ہم سب کو یہی سفر درپیش ہی اگر ایک پہلے منزل پر پہنچ گیا تو زحمت سفر سے اُس نے سویرے نجات پائی اور چوں کہ ہم بھی اُسی کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ اِنّا اِن شَاءَ اللّٰہُ بِکُم لَاحِقُون خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن اُس سے جا ہی ملیں گے۔ اور وہ ملنا ایسا ہوگا کہ اس کے پیچھے بچھڑنا نہیں اس کے بعد مفارقت نہیں۔ اُولٰئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ اب یہ ہی امتحان صبر کا پورا انعام خدا کی عظمت اُس کی قدرت۔ اُس کی شان۔ اُس کا جلال اُس کا کمال ذہن نشین ہو تو معلوم ہو کہ یہ الفاظ کیسی نوازش اور کس درجے کی سرفرازی پر دلالت کر رہے ہیں۔ آج ایک دنیا کا بادشاہ کسی کو مورد مراحم لکھ دیتا ہی تو وہ مارے فخر کے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ اور یہ مورد مراحم تو مالک کون و مکان خلاق زمین و آسمان روزی دہندۂ انس و جان فرمان فرمائے کن فکان کا لکھا ہوا ہی سبحان اللہ خدا کی درگاہ میں صابرین کی کیسی عزت و توقیر ہی۔ تو اے بھائیو جو سامنے بیٹھے ہو اور اے بہنو جو قنات کی آڑ میں ہو اتنی بات سن رکھو کہ دنیا کا انتظام ہزاروں برس سے

جس طرح پر چلا آرہا ہے جب تک خدا کو منظور ہے اُسی طرح پر چلا جائے گا۔ ما و شما کی تو کیا حقیقت ہے بڑے بڑے الوالعزم پیغمبر۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہ بڑے بڑے حاذق طبیب موت کے آگے کوئی دم نہیں مار سکے تو ایسی مجبوری کے مقام میں بے فائدہ جزع و فزع کرکے اپنا ثواب بھی کیوں کھوؤ۔ اس سے کہ ہار کر جھک مار کر آخر کار چار و ناچار صبر کرو کہ وہ صبر اکارت ہے عین مصیبت کے وقت صبر کرکے اُن رضا برین میں کیوں نہ داخل ہو جن کے مدایح میں اپنے تم کو سنائے خدا ہر مصیبت زدہ کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ (شرعی چیز)

گیارہویں فصل۔ آزادی کا سوگ اور اس کے ابتدا ہونے کے خیالات

جن دنوں مستجاب مرحوم نے بے دل ہو کر وعظ میں کمی شروع کی تو اُن کے والد نے نصیحت کے طور پر اُن سے کہا تھا کہ تمہارا وعظ ایسا ہے جیسا لڑکوں کا پالا چھوٹا ایک وعظ ہمارا تھا کہ ایک ایک سیپارے کو سارے سارے برس گھسیٹا اور سوا سوا ڈیڑھ ڈیڑھ پہر وعظ کہا۔ تو ہم نے اُس کو خودستائی اور مبالغہ سمجھا تھا کہ ایک سیپارہ برس روز تک کیوں کر گھسیٹا جا سکتا ہے اب جو مولوی نقشبندی کا وعظ سنا تو یقین آیا کہ بعض مولویوں کو خدا نے ایسی ہی گویائی اور آمد عطا فرمائی ہے کہ سیپارہ کیسا۔ وہ چاہیں تو ایک رکوع کو برس روز تک گھسیٹ لے جائیں مولوی نقشبندی نے اچھا خاصہ ایک پہر ایک آیت میں لگایا اور پھر تنگی وقت کے خیال سے بہت سی مُنہ پر آئی ہوئی باتیں چھوڑ چھوڑ دیں مرد عورت ملا کر پانچ چھ سو آدمیوں کا مجمع تھا۔ اپنی اپنی جگہ سبھی متاثر ہوئے اور آزادی پر بھی ضرور خاص اثر ہوا ہوگا کیوں کہ تمام تر وعظ میں مولوی صاحب کا روئے سخن اُسی کی طرف تھا لیکن ایسے بڑے رنج اتنے بھاری صدمے بھولتے نہیں بشاشت تو کہاں دھری تھی۔ عدت بھر وہ کچھ چپ ہی چپ رہی۔ اتنا فرق ضرور ہوا کہ خدا جانے قضائے عمری تھی یا نفلیں نماز بہت پڑھنے لگی۔ اور یوں سیپارے سوا سیپارے کی تلاوت کا معمول تھا اب نمی تشنوی کا دردباندھ لیا وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ غذا ابھی شکم سیر تو نہ تھی مگر وہ بات بھی نہ رہی کہ تین تین چار چار وقت کا صفایا۔ غرض رہج رہج کچھ پیتی سی چلی تھی کہ اتنے میں عدت پوری ہوئی۔ اس موقع پر

بچاری کو پھر ایک جھکولا لگا جیسے آلے زخم کو ٹھیس۔ مگر وہ کچھ ایسا دیرپا نہ تھا غم غلط کرنے کی دو ہی تدبیریں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ خارج میں کوئی چیز طبیعت کی پہچان دلانے والی نہ ہو۔ دوسرے دل سے رنج کے خیالات کو پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ ہادی بیگم نے بیٹی کے لیئے دونوں ہی طرح کی تدبیریں کیں۔ حتی الوسع پُرسے والوں کو آزادی تک نہ آنے دیا کہ آکر اُس کے غم کو تازہ کریں گی مولویوں کے وعظ سنوائے کہ اس کو خدا کی لو لگے اور دل سے رنج دور ہو۔ اس کے علاوہ آپ وہ اس طرح سنتو باندھ کر بیٹی کے پیچھے لپٹی کہ ایک دم کے لیئے جدا نہ ہوتی تھی۔ شوہر تو مرا ایک کا اور عدت میں بیٹھیں ما بیٹیاں دو۔ پہلے تو ہم سب کو یہی خیال ہوا تھا کہ بیٹی کی عدت پوری کر کے گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے لگے گی۔ لیکن عدت ہو ہوا بھی چکی اور ماں ہے کہ بیٹی کو نہیں چھوڑتی۔ اور نہیں چھوڑتی تو پڑے چولھے میں اپنا گھر تو سنبھالے نہیں۔ بیٹی تو بیوہ ہوئی اس لیئے کہ اس کا شوہر مرا۔ اور یہ شوہر کے جیتے جی بیوہ بن بیٹھی جس وقت سے داماد کے مرنے کا تار آیا وہ دن اور آج کا دن اس اللہ کی بندی نے خواجہ آزاد کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھا کہ کون ہے اور اس سے بھی پھر کسی طرح کا واسطہ اور سروکار ہے یا نہیں۔ خدا جانے ہادی کے جی میں کیا تھا مگر ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ سے آپ جھینپتی سی تھی کہ جوان بیٹی بیوہ کے ہوتے لوگ کیا کہیں گے۔ یا بیٹی کے ساتھ اپنا عشق جتانا منظور تھا۔ بیوی کا یہ برتاؤ دیکھ کر آزاد پہلے تو کچھ منقبض سا رہا اور پھر لگا بگاڑ کی سی باتیں کرنے ادھر آزادی ماں کے ہر وقت چھاتی پر سوار رہنے سے بیزار ہو گئی تھی۔ اُس کی طبیعت ڈھونڈتی تھی تخلیہ کہ گھڑی دو گھڑی کو ماں سے الگ ہو تو سوچے سمجھے کہ آگے کو کیا کرنا ہو گا لیکن مشکل یہ تھی کہ مُونہ پھوڑ کر ماں سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم کیوں ہر دم میری گود میں گھسی رہتی ہو۔ بارے اتنے میں آزادی کی سسرال سے بلاوا آیا کہ بہو کا گھر تو یہ تھا سو خیر خدا کو منظور نہ ہوا اور ہم بھی جانتے ہیں کہ علاقہ تو علاقے والے کے ساتھ گیا ہمارا کچھ زور تو رہا نہیں جان پہچان سمجھ کر پاؤں پھیرنے کے لیئے ہفتہ عشرہ یہیں آکر رہ جائیں جی تو کیا بہلے گا پر مرنے والے کی روح خوش ہو جائے گی۔ آگے آنے والوں اور بھیجنے والوں کو اختیار ہے ہم تو اپنی طرف سے اخیر دم تک لپٹے ہی چلے جائیں گے ہندوستانیوں کا طرز معاشرت کچھ ایسا پیٹ بھر کر بگڑا ہے کہ ساس بہوؤں۔ نند بھاوجوں یعنی دو سمدھیانوں میں رشتہ ہوئے پیچھے بہت ہی کم صفائی باقی رہتی ہے۔ اور جس کو ہم صفائی سمجھتے ہیں اسکی بھی یہ معنے ہیں

کہ ظاہر میں تھکا فضیحت نہیں ورنہ دلوں میں گلوں کے انبار شکووں کے ڈھیر۔ قاعدے کے مطابق آزادی اور اس کی سسرال والوں میں بھی لڑائی جھگڑا تو کبھی ہوا نہیں مگر دوستی اور محبت بھی نہ تھی اور اس میں قصور آزادی ہی کا تھا۔ اُس نے جاتے کے ساتھ میاں کو ایسا اپنے بس میں کر لیا کہ وہ مرحوم بے اس کی مرضی کے تنکا نہ توڑتے۔ اس پر وعظ کا چھوڑنا۔ مولویت سے مُونہ موڑنا۔ نوکری کا ٹھیکا کرنا بھوپال میں جا کر رہنا۔ گو آزادی کو ان باتوں میں کسی طرح کا دخل نہ تھا نہ اس نے میاں کو بہکایا۔ نہ سکھایا۔ مگر بدگمانی کا کیا علاج سسرال والوں نے یہ سارے گناہ اُسی کے نامۂ اعمال میں لکھ رکھے تھے۔ آزادی کی ساس نے جو بیٹے کے مرنے کے بین کئے اُن میں بھی تو اُسی کا رونا تھا اب بلایا تو بلاوے میں بھی ہمدردی کی بُو نہ تھی۔ لیکن آزادی کو ماں کی گرفت سے نکل بھاگنے کا موقع ملا۔ وہ کتنے کتنے دنوں سے اس خیال میں تھی اور اکثر سوچا کرتی تھی کہ اماجان جو ایک لمحے کے لیئے میرے پاس سے نہیں کھسکتیں ہیں یہ تو نہیں کہتی کہ انہوں نے میرے اوپر پہرا بٹھایا ہی بلکہ وہ اپنے پندار میں میرا دھیان بٹوانا چاہتی ہیں کہ اکیلی بیٹھے گی تو اس کو اپنے گھر کا خیال آئے گا اس کا دل کڑھے گا اس سے بہتر ہی کہ اس کو ایسا موقع ہی نہ دو۔ ان کو اپنی ماننا کے آگے نہیں سوجھتا کہ ان کے ہر وقت کے چمٹے رہنے سے مجکو ترہیب ترہیب ویسی ہی ایذا ہوتی ہی جیسی اپنی حالت کے تصور سے۔ اور یہ حالت تو میری خدا نے کر ہی دی نہ سوچنے سے میں کوئی سہاگن نہیں ہوئی جاتی۔ اور آخر کب تک نہ سوچ کروں گی سسرال والے اُن کے جیتے جی ہی آپ ہی مجھ سے بگڑے رہتے تھے اور اب تو میں نے ہی اُن کو زبردستی دھکیل کر پردیس بھیجا نہ پردیس جاتے نہ مفت میں اپنی جان گنواتے مجھے دیکھ دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھ میں خون اُتر آتا ہی اور وہ مجھ کو بیٹھنے والی ہی کب سمجھتے ہیں۔ آپس میں شرطیں لگاتے اور شرطیں کھاتے ہیں کہ یہ دوسرا نکاح کرے اور کرے۔ رہا میرا میکا تو اُس پر خدا میری اماں کو جیتا رکھے ا بہرا ہر طرح کا دعویٰ چل سکتا ہی۔ بھاوجیں کبھی گڑگڑاتی ہیں تو اُن کا میرا رشتہ ہی ایسا ٹھیرا۔ اور اماں کے ہوتے میں بھائی بھاوجوں کی پروا بھی کیا رکھتی ہوں۔ لیکن یہ کیسا پیچ آ کر پڑا ہی کہ میرے سبب سے اماں اور ابا میں بگاڑ پڑ گیا اور بڑھتا چلا جاتا ہی۔ کیا غضب ہی کہ اماں بالکل نہیں سمجھتیں اور میرے کارن اپنا عمر بھر کا گھر غارت کیئے ڈالتی ہیں۔ اور نواب نے جیتے جی

میری تیس روپیئے کی تنخواہ بھی کر دی ہے۔ ہے ہے رانڈ سمجھ کر۔ حاشا میں تو نہیں لینے کی جس کی بیوہ بن کر تنخواہ لوں اُس کو تو ایسی آمدنی کی چڑھ تھی۔ بلا سے سلائی کا سیوں گی۔ دونوں وقت نہیں ایک ہی وقت کھاؤں گی میرے اکیلے دم کے لیئے بہت ہے اور اب مجکو چاہیئے بھی کیا۔ موٹا جھوٹا پہن لیا روکھی سوکھی کھالی۔ اللہ اللہ خیر صلاح لیکن نواب نے خط میں تو نہیں لکھا کہ بیوہ سمجھ کر تمہاری تنخواہ کرتا ہوں۔ ایسا گھر کا بھولا۔ اُس کے اپنے ملک میں رانڈوں کی کمی پڑی ہے کہ یہاں دلّی میں میری تنخواہ مقرر کرنے آیا اور دلّی میں بھی میری خصوصیت ہی کیا تھی۔ یہ تنخواہ تو جان کا معاوضہ ہے۔ نواب کے اچھے سے لوں۔ اور نہ دے تو رزیڈنٹ کے آگے جا کھڑی ہوں ماباپ پر تو میں اپنا بوجھ ڈالنے سے رہی۔ اُنھوں نے ایک دفعہ مجکو بیاہ دیا جو کچھ میری تقدیر کا تھا دے دلا کر رخصت کر دیا میری ساری عمر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا کہ پھر اُن کے سر پہ آ کر پڑوں کچھ ہی کہو میں ویسی عزت سے تو اس گھر میں نہیں رہ سکتی جو اُن کے جیتے جی تھی۔ اور پھر ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ مجھے بیننگ کیا کر چھروں میں ماننا پڑے گا وہ ایک طرح کی خود مختاری جو بیاہے جانے سے مجکو حاصل ہوئی تھی رفتہ رفتہ بالکل جاتی رہے گی۔ وہ انجام مجکو نظر آ رہا ہے کہ اس گھر میں میرا وہی درجہ ہوگا جو ایک ماما یا لونڈی کا ہوتا ہے۔ بلا سے افیم کھا کر سو رہوں گی اور بھائی بھاوجوں کے طعنے نہ سُنے ہیں نہ آیندہ سنوں گی۔ بات یہ ہے کہ رنج کی وجہ سے آزادی تنک مزاج بھی ہو گئی تھی اور بدگمانی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ لفظوں کے ایسے پہلو سوچتی جن کی طرف سوائے اُس کے کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ چیزوں کے سبب تراشتی بے اصل باتوں کے نتیجے نکالتی غلط۔ پر بلاشبہہ اس نے یہ خوب سوچا تھا کہ میکا یا سُسرال میرا کہیں بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ آزادی ان خیالات سے بھری بیٹھی تھی کہ سُسرال کی ماما بلاوا لے کر آئی۔ ہادی بیگم کے تو ماما کو دالان میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا کہ آزادی کے روبرو اس سے بات چیت کرنا کیا ضرور ہے الگ لے جا کر کچھ عذر معذرت کر دوں گی مگر آزادی تو میکے سے جانے کے لیئے حیلہ اور نکلنے کے لیئے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی اُس نے ذرا ترشی کے ساتھ ماں سے کہا اے بی آنے دو نا۔ ماما نے بلاوا دیا۔ ہادی بیگم تو لگی عذر کرنے۔ آزادی بول پڑی کہ ہاں ہاں میں چلوں گی۔ ماں نے بیٹی کے ساتھ ردوکد کرنا مناسب نہ سمجھا اور اچھا کیا۔ آزادی

سُسرال گئی اور چند روز رہ کر وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھا۔ جیسا سمجھے ہوئی تھی اپنی طرف سے
لوگوں کو زیادہ رُکا ہوا پایا۔ وہ لوگ دنیا سازی کے طور پر کہتے رہے یہ چار دن رہ کر رخصت ہوئی
لوگوں نے جانا میکے جارہی ہے اور یہ آکر اُتری اپنے الگ مکان میں جس میں میاں کے جیتے جی رہا کرتی
تھی۔ میکے والوں کو بھی جب اگلے دن ماما معمول کے مطابق خیر صلاح کی خبر کو گئی تب معلوم ہوا۔
ہادی بیگم نے سنتے کے ساتھ ڈولی منگوائی۔ اتنے میں آنکلا آزاد۔ بی بی کو جانے کی طیاری کرتے
دیکھ پوچھا کہ اس وقت کہاں جارہی ہو۔ ہادی۔ آزادی کل کی سُسرال سے آکر اپنے الگ
گھر میں اتر پڑی۔ خواجہ آزاد۔ پھر؟ ہادی۔ جاتی ہوں اور ابھی اُلٹی اُس کو سوار کرا کے لے آتی ہوں۔
خواجہ آزاد۔ اور اگر وہ نہ آئی۔ ہادی۔ تو میں وہاں رہ پڑوں گی اُس کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ آزاد
بس اسی دن کے لیئے کہتے ہیں کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ تم نے جو جو تدبیریں کی ہیں میں
شروع سے دیکھ رہا ہوں اور مجھکو تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ مگر معاملہ تھا نازک میں کچھ بول نہ سکا
ہادی۔ تم اپنی وہیا تدبیر بیٹھے جاؤ تقدیر کے آگے کوئی تدبیر کام نہیں کرتی۔ میں بیچاری کیا تدبیر
کروں گی۔ مرنے والا مر گیا سب صبر شکر کرکے بیٹھ رہے۔ اُس کو تو مرنا ہی تھا یہاں رہتا تو بھی مرتا
مگر چار و ناچار دو اور من میں دخل دینا پڑتا تم تو ہم کو جینا بھی نہ چھوڑتے اور یہی اُلاہنا دیتے
کہ تمہاری بے تدبیریوں نے مارا۔ آزاد۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ تمہاری بے تدبیریوں نے مارا
مجھکو اب معلوم ہوا کہ اُس کو اختلاج قلب کی بیماری تھی اور گرمیوں میں اُس کا دورہ ہوا کرتا تھا
اور بعض مرتبہ گرم غذا کھا لینے سے جاڑے میں بھی دھڑکن ہونے لگتی تھی۔ اگر مجھکو خبر ہو تو میں
ہرگز اُس کو جانے نہ دوں۔ گرمیوں کے دن ریل کا سفر۔ دکن کی لو۔ گھر کی مفارقت کا صدمہ
ان پر مزید وہ انقباض جو ہندوستانی ریاست کے معاملات کی وجہ سے خواہی نخواہی پیدا ہوا ہوگا
بس تو ایسی حالت میں اُس کی زندگی کا بیمہ ایک پیسے کو بھی نہ لیتا۔ مگر خیر اس کا ندکور کیا ہے جو ہونا تھا
سو ہوا۔ میں تو تمہاری ان بے تدبیریوں کو کہتا ہوں جو تم آزادی کے حق میں کر رہی ہو۔ شروع سے
تم کو اس کا اہتمام ہے کہ یہ رنج نہ کرے روئے نہیں اور اسی غرض سے تم ہمہ وقت اس کو لازم رہتی ہو۔ اسی
غرض سے تم نے اس کو مولویوں کے وعظ سنوائے ہیں لیکن تم اتنا تو سمجھو کہ رنج اور رونا تقاضائے
طبیعت ہے کسی کے روکے رُک نہیں سکتا جس طرح چوٹ کو دکھ لازم ہے اسی طرح صدمۂ روحی کو رنج

اور جس طرح جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے چوٹ کے درد کا احساس خود بخود کم ہو جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے رنج بھی خود بخود گھٹتا اور کم ہوتا چلا جاتا ہے مصیبت میں سب سے بہتر طریقہ ہمدردی کا یہ ہے کہ مصیبت زدہ کو ایک وقت خاص تک اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طریقے سے جو تسکین آخر کار حاصل ہو گی وہ از بسکہ قاعدہ طبیعت کے مطابق ہو گی زیادہ سود مند ہو گی۔ تم نے قبل الوقت اس کو تسکین دینی چاہی اور سمجھیں کہ میری تدبیر کارگر ہوئی مگر یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے گھبرا کر اُلٹا تمہارا علاج چھوڑ دیا اب بھی مصلحت یہی ہے کہ اُس کے حال سے بالکل تعرض نہ کرو اور اُس کو اُسی کی رائے پر رہنے دو۔ انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے اور ہر ایک انسان آزاد رہنا چاہتا ہے۔ اگر آزادی[1] کو سختی کے ساتھ روکا جائے تو وہ دوسرے بُرے پیرایوں میں پھوٹ کر نکلتی ہے۔ اس کی مثال ہے کہ زمین میں ایک بیج موجود ہے اور یقیناً معلوم ہے کہ اپنے وقت پر وہ بیج زمین کے اندر ہی اندر پھوٹے گا پھٹے گا۔ اس میں کونپل پیدا ہو گی۔ وہ بڑھے گی پھیلے گی۔ یہاں تک کہ اچھا خاصا ایک درخت بن جائے گا۔ اب اگر ہم کونپل کے نکلنے سے پہلے اس پر ایک بڑا بھاری پتھر رکھ دیں اور اُس کو اُبھرنے نہ دیں تو ریشے دوسرا رستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس درخت کی شاخیں کج ہوں تو ہوں مضمحل ہوں تو ہوں مگر نہیں ہو سکتا کہ نہ ہوں۔ غلاموں اور ادنیٰ درجے کے آدمیوں میں اکثر بُرے اخلاق کے ہونے کا یہی سبب ہوتا ہے کہ اُن کو پوری آزادی نہیں پس اگر تم بیٹی کی عافیت اور سلامتی چاہتی ہو تو میری رائے یہ ہے کہ اُس کو باختیار خود رہنے دو۔ اب تم کو اس پر اپنی حکومت بٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ وہ بھی تم جیسی عورت ہے۔ اپنا نفع نقصان خوب سمجھتی۔ اور مناسب نامناسب میں امتیاز کرنے کی عقل رکھتی۔ مجکو بڑا خوف یہ ہے کہ تمہارے بے جا دباؤ ڈالنے سے کہیں کوئی بُرا نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اُس کا سسرال سے اپنے گھر جانا اور تم سے اجازت نہ لینا اور تم کو خبر نہ کرنا ہی سے سمجھو کہ اُس کو تمہاری نگرانی میں رہنا منظور نہیں اَلْعَاقِلُ تَکْفِیْہِ الْاِشَارَۃ۔ خواجہ آزاد نے جو ایسی باتیں کہیں کہ حق گو اور بھی اور معقول تھیں ہادی بیگم نے ڈولی اُلٹی پھروا دی اور بیٹی کو اس کی شکایت بھی تو کہلا کر نہ بھیجی کہ تم نے یہ کیا کیا؟

بارہویں فصل - آزادی اپنے دل کے بہلنے کی تدبیریں سوچتی ہے اور آخر کار خودکشی

وہاں آزادی نے اپنے گھر میں کھل پائی تو اس کے دل کو بھی ایک طرح کی راحت پہنچی سوچتے

[1] یہاں آزادی سے رائے آزادی کی مراد ہے ۱۲

خیال کرنے کی تو ماکے گھر میں بھی مناہی نہ تھی مگر نہیں اُس کو کچھ اسی کی خوشی تھی کہ کسی کی صورت نظر نہ پڑے۔ گھر میں اترنے کے ساتھ اُس نے ماماؤں سے کہہ دیا کہ خبردار ہر وقت اندر کی کنڈی لگائے رکھو اور کسی کو نہ آنے دو۔ یہ وہی گھر تھا جس میں دو پونے دو برس مولوی مستجاب رہ سہ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ آزادی کو دیکھ کر یاد آیا کہ یہاں سوتے تھے۔ اس جگہ بیٹھتے تھے۔ اور آج وہ کوٹھری میں بند ہو کر اس طرح کا رونا روئی جس طرح اُس کا جی چاہتا تھا۔ نہ کوئی چھڑانے والا۔ نہ کوئی سمجھانے والا جب اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال لی تو آنسو پونچھ باہر آ گئی۔ اور اپنی دوا اور گھر کی دو ایک ماماؤں کو بات چیت کرنے کے لیے بلا کر پاس بٹھا لیا۔ روتے روتے سر میں درد تو بڑے زور کا ہونے لگا مگر طبیعت بہ نسبت اور دنوں کے بہت ہلکی تھی۔ معمول یہ تھا کہ وقت پر نماز پڑھی جتنی دیر طبیعت حاضر رہی قرآن کی تلاوت کی۔ ماماؤں کا ہاتھ بٹوا لیا۔ باورچی خانے میں جا کھڑی ہوئی۔ اکیلی پڑی کچھ سوچا کی۔ سینا لے بیٹھی۔ میاں کے خط سب جمع کر رکھے تھے اُن کو پڑھا کی۔ دوا کو کہانیاں بہت یاد تھیں اُس نے رات کے کھانے پینے سے فراغت پا کر مناسب وقت کوئی کہانی چھیڑ دی وہ سنتی رہی۔ مولوی مستجاب کے سامنے کی تو بھلا اور بات تھی۔ اُن کے پیچھے اسی گھر میں اکیلی نے دس مہینے گزارے نہ کبھی وحشت ہوئی اور نہ تنہائی سے گھبرائی اس واسطے کہ پھر بھی اُن کے آنے کی آس تھی یا کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اب صبح شام طلبی کا خط آنے والا ہے۔ اب باوجود سے کہ وہتے ہی آدمی تھے اور وہی گھر۔ مکان ہے کہ بڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ رات کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیواریں چھاتی پر چڑھی چلی آتی ہیں۔ دن کٹتا ہے بے مزہ۔ رات گزرتی ہے بے لطف۔ یادگاری کسی کسی وقت نہیں بھی ہوتی مگر ایک کو وقت ہے کہ دم بدم لحظہ بلحظہ دل کو نچوڑے چلی جاتی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ آزادی بیاہ ہی سے متنفر تھی اور جن دنوں اُس کی منگنی کی بات چیت ہو رہی تھی یہ چاہتی تھی کہ کنواری بیٹھی رہوں تو بہتر کیوں کہ وہ بیاہ کی حقیقت سے واقف نہ تھی اور کپڑے اور زیور اور مہمان داری اور سامان ظاہر یہ چیزیں اس کی نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ بیاہ ہوا تو اُس نے جانا کہ اب میں نے دوسرا جنم لیا۔ اور جس کو زندگی کہنا چاہیے وہ یہ ہے جو بیاہ کے بعد سے شروع ہوئی۔ ہر ایک بات میں غور کرنے کی عادت تو اس کی سدا سے تھی ہی بیاہ سے پہلے بھی یہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگرچہ لوگ آپس میں رشتے قرابت دوستی ملاقات کے تعلقات رکھتے اور ان تعلقات کا لحاظ و

پاس بھی کرنے لیکن خیال کر کے دیکھا تو بچہ جب تک ما کا دودھ پیتا ہی بس وہ ایک تعلق تو تعلق ہی کہ بدوں ما کے بچے کی گزر ہی نہیں سکتی اور باقی تعلقات تو من سمجھوتی اور برائے نام ہیں سب سے بڑا تعلق ماباپ کا اس سے اُتر کر بھائی بہن کا سو بچہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا ماباپ کا تعلق گھٹتا اور کم ہوتا گیا یہاں تک کہ اولاد الگ الگ گھر کر کے بیٹھی ماباپ غیر داخل بلکہ بعض صورتوں میں تو ماباپ اور اولاد میں ایسے بگاڑ پڑ جاتے ہیں کہ ملنا جلنا موقوف صاحب سلامت ترک۔ رہے بھائی بہن شاید ایسا کوئی زمانہ گزرا ہو جس میں بھائی بہن آپس میں پیار اخلاص رکھتے ہوں ورنہ رشتہ تو ہو لیں اور حسد کا ہی کون سا دن ہی کہ چھوٹوں چھوٹوں میں سودے سلف کی بانٹ چونٹ پر مار کٹائی نہیں ہوتی یہ مادہ حسد نہیں تو کیا ہی۔ یہی چھینا جھپٹی کی جھنک بڑے ہوئے پیچھے لڑائیاں ڈلواتی جھگڑے کراتی خون کا پہلا دھبّہ جو روئے زمین پر لگا وہی تھا کہ آدم کے بیٹے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو مارے حسد کے مار ڈالا غرض بیاہ سے پہلے تک آزادی کسی تعلق کی قائل نہ تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ انسان کو اپنے ابنائے جنس میں سے کسی کے ساتھ دلبستگی نہیں ہوتی۔ بیاہ کا ہونا تھا کہ اُس کی رائے بالکل بدل گئی۔ وہ پہلے حیران ہوا کرتی تھی کہ آدمی آدمی یکساں پھر مرد اور عورت کا اتحاد اس میں کیا مصلحت ہی۔ بیاہ ہوا تو اس کی آنکھیں کھلیں اور سمجھی کہ انسان میں محبت کا ایک مادّہ بھی ودیعت رکھا گیا ہی۔ جو اُس کی روح کی غذا اُس کے دل کو تسکین اور باغ زندگانی کی بہار ہی وہ اپنے جدید تعلق کو بہت عزیز رکھتی۔ اور اُس کی روح کی غذا اُس کی بڑی قدر کرتی اور اپنی حالت پر نظر کر کے خوش ہوتی ہر شخص سمجھ سکتا ہی کہ ایسی عورت پر بیوگی کس قدر شاق ہونی چاہئیے اور واقع میں جس دن سے میاں مرا آزادی نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں باؤلی نہیں کہ ننگے چلتی پھرے ایسے ہوش نہیں کہ آپ کو سنبھالے سب جتن کر کے دیکھے کہ کسی طرح دل کو قرار ہو طبیعت ہی کہ کسی طرح کام پر نہیں جمتی کسی شخص سے نہیں بہلتی۔ وعظ بیٹھی سن رہی ہی اور ذرا دھیان ہٹا تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ نماز کی نیت باندھتی ہی اور ہر چند چاہتی ہی کہ دل رجوع ہو بھول بھول جاتی ہی کہ کے رکعتیں پڑھیں نہیں معلوم نری الحمد پڑھ کر رکوع میں گئی اور سورت نہیں ملائی یا خدا جانے ملائی۔ یاد نہیں کہ ایک سجدہ کیا یا دو۔ قرآن لیکر بیٹھی نہ زبانی یاد آتا ہی نہ حرف سوجھ پڑتے ہیں میکے میں رہی ایک دن جی نہ لگا سسرال گئی وہاں سے وحشت ہوئی۔ الگ گھر میں

آکر رہی یہاں بھی وہی آتش درکاسہ۔ مولوی صاحب کے سارے کپڑے اور تمام کتابیں کل چیزیں مساکین کو تقسیم کر دیں کہ آنکھوں کے آگے رہیں گی تو یادگاری کو تازہ کریں گی مگر یہ اُس کی سمجھ کی غلطی تھی باہر کی چیزوں سے نہیں بلکہ یادگاری اُس کے اپنے دل سے پیدا ہوتی تھی۔ اور وہ آپ ہی یاد کرنے والی۔ آپ ہی یاد دلانے والی۔ آپ ہی رونے والی۔ آپ ہی رُلانے والی۔ عدت کے کتنے دنوں بعد تک تو اُس کا یہ حال رہا کہ کہیں اُس نے لوگوں کو اپنی ماں سے کہتے ہوئے سنا تھا کہ اس کو کسی شغل میں لگاؤ تو گو رنج کے خیالات اس کو تکلیف دیتے تھے مگر اس تکلیف میں بھی اس کو ایک طرح کا مزا ملتا تھا اور دوسرے شغل کے نام سے چڑتی تھی۔ آخر اس کو آپ ہی آپ اتنی سمجھ آئی کہ یہ میری حالت نہایت خراب حالت ہے دنیا تو خیر جیسی غارت ہوئی سو ہوئی اس رنج کے پیچھے میرا دین بھی برباد ہوا چلا جاتا ہے اور میں نے اتنا رنج کر کے کیا کر لیا اور آیندہ ساری عمر اس طرح رنج کیے جاؤں گی تو کیا کر لوں گی میں اپنی طبیعت کا اندازہ کرتی ہوں تو یہ رنج میری جان کے ساتھ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ طبیعت کو کسی شغل میں لگاؤ۔ تو اُن کو میری طبیعت کی خبر نہیں میں کب چاہتی ہوں کہ یوں اپنے تئیں مٹی میں ملائے رہوں مگر دل ہی اپنے اختیار میں نہ ہو تو اس کا کیا علاج میں نہیں جانتی کہ لوگ میرے لیے کونسا شغل تجویز کرتے ہیں۔ جانور پالوں تو چھٹپن میں میں بہتیرے جانور پال چکی ہوں ایک دفعہ بٹن بیبی لالوں سے کھچا کھچ دو پنجرے بھرے ایسے بلا کے بولنے والے کہ بس سارے دن یہ معلوم ہوتا تھا کہ ارگن باجا پڑا بج رہا ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس ایک ساتھ ملکر بولیں تو دالان گونج اُٹھے جاڑا آیا خود بخود مرنے شروع ہوئے بہتیری تدبیریں کیں جب صبح کو پنجرہ کھولوں ہر روز دو تین کو مردہ پاؤں۔ وہ دن اور آج کا دن پھر لوں میں نے لالوں کے پالنے کا نام نہیں لیا۔ پہاڑی طوطے کا بچہ ڈیرہ دون سے منگوایا ڈیڑھ دو برس اس کے پیچھے سر کھپایا بیٹا مٹھو نبی جی بھیجو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ سچی تو خدا خدا کا رسول غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول۔ قطب قطب ربانی بھوکے کو کھانا پیاسے کو پانی یہ سب باتیں ایسی عمدہ طرح سے ادا کرے کہ خود ہم گھر والوں کو اکثر شبہ ہو جاتا تھا کہ طوطا بول رہا ہے یا کوئی بچہ۔ گھر میں جتنے آدمی تھے سب کے نام اُس کو معلوم ہر ایک کے ساتھ اُس کی لیاقت کے مطابق گفتگو محلے محلے اُس کے بولنے کا شہرہ کہ ہر روز دو چار نئے آدمی اُس کی باتیں سننے کو آتے ہر چند میں چھپاتی تھی کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے مگر لوگ بہت منتیں کرتے تو ناچار پنجرہ لا کر سامنے لٹکا دیتی اور طوطا

گھنٹوں باتیں کرتا ایک دن دیکھتی کیا ہوں کہ باتیں کرتے کرتے طوطے نے خلاف عادت جنگلی طوطے
کی طرح دو تین بار ٹائیں ٹائیں کی اور اڈے پر سے گر کر ٹیں ہو گیا۔ جلدی سے کھڑکی کھول کر نکالا
تو پڑا ہی پڑا ٹھنڈا ہو گیا۔ مجھ کو اس طوطے کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ مارے رنج کے کئی دن تک میں نے کھانا
نہیں کھایا اور میری طبیعت بھی کچھ اس طرح کی بودی ہے کہ رنج کی مطلق سہار نہیں۔ غرض طوطے
کے پالنے سے بھی کان اینٹھا۔ بنگالہ کی طرف سے کوئی بڑا آدمی آیا تھا اور اُس نے نانا ابا کو ایک مینا نذر
دی تھی اُن کو معلوم تھا کہ مجھ کو جانوروں کا شوق ہے۔ نانا ابا نے وہ مینا مجھ کو دی۔ بس میں کچھ نہیں کہہ سکتی
کہ وہ مینا کس کمال کی تھی۔ عربی۔ فارسی اُردو۔ بنگالی۔ انگریزی پانچ زبانیں بولتی تھی۔ بنگالی
انگریزی تو میں سمجھتی نہ تھی لیکن عربی فارسی اردو صاف سمجھ میں آتی تھی۔ اور ایسے لکان اُس کے کسی وقت
بند نہیں آدھی رات کو بیکار بیٹھو تو باتیں کرنے کو موجود معلوم تھا کہ مینا کے کانٹا نکلا کرتا ہے اور اکثر
اس سے جاں بر نہیں ہوتی اس کے لیئے میں نے خدا جھوٹ نہ بلوائے بیسیوں علاج ہم پونچائے
اور دوائیں جمع کر کے رکھیں کہ ذرا کانٹے کا خلل ظاہر ہو اور تدبیر کروں۔ کانٹا نکلا اور تدبیریں بھی ہوئیں
مینا کی تو قضا آ چکی تھی آخر کار چراغ حیات گل ہونا تھا سو ہوا۔ مینا کے مرنے کا مجھ کو اس قدر قلق ہوا کہ اب
بھی ایک گھنٹے میاں کو روتی ہوں تو ایک منٹ مینا کو۔ بات یہ ہے کہ انسان کو جانوروں کے مزاج اور اُن
کی خصلت سے پوری پوری آگہی تو ہے نہیں آدمی اپنے نزدیک کرتا ہے بھلی اور وہ ہو جاتی ہے بُری خدا
جانے پنجرے میں بند رکھنے کی ایذا ہوتی ہے۔ یا اپنے ہم جنسوں سے نہیں ملنے پاتے یہ تکلیف اُن کو
پونہچتی ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوتا ہے کہ پلے ہوئے جانور اکثر کُڑھ کُڑھ کر اور گُھل گُھل کر
وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ جانوروں کا ناحق میں خون ہوتا ہے تو خدا کا کتنا بڑا گناہ ہوتا ہوگا
اور پلے ہوئے جانور کا مرنا بس اس کے صدمہ کی اُسی کے دل کو خبر ہے جس نے کبھی جانور پالے ہوں
بس جانوروں کا پالنا مفت میں اپنے جی کو جنجال میں ڈالنا ہے۔ کون بیٹھے بٹھائے یہ درد سر مول لے
ایک تدبیر یہ ہے کہ گھر کا صحن بہتیرا بڑا ہے اسی میں ایک خوش قطع سا چمن آراستہ کروں۔ بکھیڑے سے
تو یہ بھی خالی نہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ہے تفریح کی چیز۔ لیکن کتنی دیر کی تفریح۔ گھنٹے
دو گھنٹے صبح گھنٹے دو گھنٹے شام۔ سو بھی سارے برس نہیں۔ جن دنوں گرمیوں میں لُو چلتی ہے
یا جب خزاں کا موسم آتا ہے درختوں کو مرجھایا ہوا اور لُٹا کھسوٹا دیکھ کر بڑی ہی کوفت ہوتی ہے۔ ناصاحب

یہ بھی میری وحشت کا علاج نہیں۔ میل ملاپ والیاں اور رشتے ناطے کی جتنی عورتیں ہیں اُن میں
سے اکثر کی یہ رائے ہے کہ میں کسی کا بچہ گود لے لوں۔ اول تو ایسا کوئی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا بچہ میرے حوالے
کردے۔ جن کے خدا رکھے چار چار پانچ پانچ موجود ہیں اُن سے بھی پوچھو تو وہ کہیں گے کہ اتنے
ہی اور ہوں۔ وہی کہاوت ہے کہ روٹی اور اولاد سے کسی کا پیٹ بھرا ہے۔ اور پھر میری حالت
ایسی ہے کہ وہم نہ آتا ہو تو آئے۔ اور جو کسی نے مجھ پر ترس کھا کر یا اس لالچ میں آکر کہ میرا اکیلا دم
ہے بیس روپیے مہینے کی بندھی ہوئی آمدنی ہے اپنا بچہ دے بھی دیا تو میرے پلے میں اتنی گنجایش نہیں پائی
ہندوستانی سرکار اور رعایت کا دینا خدا جانے کیا اتفاق پیش آئے تنخواہ آگے کو ملے یا نہ ملے تو میں
جس کو گود لوں اُس کا خرچ کہاں سے چلاؤں۔ لڑکی ہو تو میری اس گئی گزری حالت پر کچھ نہ ہو
تو دو ہزار روپئے اُس کے بیاہ بارات کو چاہئیں۔ اور لڑکا ہو تو بیاہ برات کے علاوہ کم سے کم
اسی قدر لکھانے پڑھانے کو سو دو ہزار روپئے تو یہاں دو ہزار برس میں بھی اکٹھے ہوتے ہوئے
نظر نہیں آتے۔ میکے یا سسرال کے بھتیے پر جو میں پرائی اولاد کا بیڑا اُٹھا بیٹھوں تو مجھ سے
بڑھ کر کوئی احمق ہے؟ اور وقت پر نہ ہو سکا تو جس کو گود لوں وہ کیا کہے گا اور جو سنے گا وہ کیا کہے گا
وہ تو مجھے کوسے گا اور یہ میرے منہ میں تھوکیں گے۔ اور میں نے کسی کو گود لیا بھی تو ماں باپ سے لاکھ
فارخطی لکھوا لوں۔ پنچوں میں دست برداری کرا لوں مگر قدرتی تعلق کو تو میں نہیں توڑ سکتی تو اس
کے یہ معنی کہ اُس کے ماں باپ یا جو کوئی اُس کا ولی اور سرپرست ہو اس کی نظر میں بچے کی تندرستی اور
زندگانی کا بیمہ لینے والی ٹھہری۔ اور خدا پر میرا ایسا ہی زور چلتا تو اپنے ہی میاں کو جوان کیوں مرنے
دیتی پھر متبنےٰ لینا تو نرا ڈھکوسلا ہے۔ پالو پرورش کرو مصیبت اُٹھاؤ۔ آپ تکلیف میں رہو۔ اُس کو
آرام پہنچاؤ صرف امید پر کہ ہمارا کہلائے۔ اور وہ آخر کار کہلائے گا اُن ہی کا جن کا ہے۔ ہاتھی پھرے
گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں۔ ہماری اماں کو رہ رہ کر اسی کا بڑا ارمان آتا ہے کہ ہائے اسما
کے اولاد نہ ہوئی۔ اور میں کہتی ہوں بھلا ہوا نہ ہوئی۔ آج کو آگے اولاد ہوتی تو دوہری مصیبت
تھی میں اپنی بیوگی کو روتی یا اُن کی یتیمی کو۔ اور پھر لڑکا ہو یا لڑکی جس کے سر پر باپ نہیں اُس کا
کیا ٹھکانا ہے کہ کیسا اُٹھے۔ اور اگر اولاد ہوتی اور بُری نکلتی اور رو داد تو بُری نکلنے کی تھی ہی
تو پھر میری زندگانی جیسی برباد ہوئی سو ہوئی خاندان کی عزت اور آبرو کا خطرہ تھا۔ خدا کا

کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا میں تو اُس کی بڑی ہی شکر گزار ہوں کہ اس آفت سے بچی رہی
تو میں سبھی افسوس کے قابل ہوتی ہیں خاص کر یہ موت کیا عمر اور کیا ٹریس۔ اور کیا یکا یک اور کیا
بینک بختی اور کیا لیاقت ہر ہر پہلو سے اس طرح کی مصیبت تھی کہ کسی غیر نے بھی سُنا تو ٹھنڈیں
سانسیں بھر رہا۔ مگر اس بات کا عام قلق تھا کہ کچھ نام و نشان نہ چھوڑا یعنی اولاد۔ لیکن جب
اپنی ہی جان جاتی رہی تو نام و نشان رہ کر بھی کیا کرتا۔ یہ بھی ایک دنیا کا خیال ہے ورنہ جب
اولاد کے پیچھے لوگ دین کی بنا ہی کی بھی پرواہ نہیں کرتے وہی اولاد اپنے وقت پر پوہنچ کر یہ
ماں باپ کا اتنا بھی تو احسان نہیں مانتے جتنا ایک پڑوسی کا۔ جواب دیں۔ گستاخیاں اور نافرمانیاں
کریں ایذائیں پوہنچائیں اور نام و نشان سمجھے جائیں۔ زمانہ کا رنگ دیکھ دیکھ کر اولاد کی طرف
سے میرا دل تو ایسا کھٹا رہا کہ میں نے کبھی اولاد کی تمنا نہیں کی اور اب بھی اولاد کے نہ ہونے کا
ملال یا کسی کو گود لینے کا خیال مطلق نہیں۔ میرے دل کے بہلنے کی شاید اگر کوئی صورت تھی تو یہ تھی
کہ میں لڑکیوں کا مکتب کھول لیتی شغل بھی اچھا تھا اور ثواب کی بھی بات تھی۔ مگر میں اتنا ہو تا کس
کے گھر سے لاؤں خدا جانے دماغ پر کیا بنی ہے کہ ذرا کوئی زور سے بولتا ہے تو اندر سے بھیجا ہلنے
لگتا ہے۔ ممکن نہیں کہ مکتب کے غل کی بھی مجھ سے سہار ہو سکے۔ اور دماغ ہی اس قابل ہوتا تو میں قرآن ہی
حفظ کرنے لگتی۔ کہ اس کی برکت سے میرا دل بھی ٹھیر جاتا۔ غرض جی کے بہلانے کی بھی تدبیریں ہیں
بعض میرے قابل نہیں۔ اور بعض کے میں قابل نہیں پس خدا کی مرضی نہیں معلوم ہوتی کہ میں جیوں
اور اس طرح کا جینا درست بھی کب ہے۔ ہر وقت میں رنجیدہ رہتی ہوں۔ اس کے یہ معنی کہ خدا سے
روٹھی ہوئی اور ناراض کہ کیوں میرے آدمی کو اپنے پاس بُلایا اور مجھ کو رانڈ بیوہ کر کے بٹھایا پس دین یا
ایمان بھی کہاں باقی رہا۔ لاکھ مونھ سے نہ کہوں پر خدا تو دلوں کی چوریوں کو جانتا ہے کہ اُس کے
نزدیک میں گنہگار ٹھیر چکی کہ میں اب کسی سُہاگن کو نہیں دیکھ سکتی۔ مجھ کو ارمان آتا ہے کہ اس کا میاں تو
موجود ہے میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا اور میرے ہی میاں کو مرنا تھا۔ میں سمجھتی سب ہوں کہ حسد
ایسی بُری چیز ہے کہ جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اسی طرح حسد ساری نیکیوں کو برباد
کر دیتا ہے لیکن میں کیا کروں میرے دل میں تو آپ سے آپ اس طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اُن کو
روک نہیں سکتی میں آپ سے انکار نہیں کر سکتی پس ایسی نالائق اور بیہودہ اور خراب اور مصیبت مند

زندگی سے تو مر رہنا بہتر۔ بلا سے ہمیشہ ہمیشہ کو نپڑ تو چھوٹ جائے گا لیکن اتنا ہی خیال آتا ہے کہ حرام موت مرنا بھی تو بڑا گناہ ہے۔ پھر میں سوچتی ہوں کہ جیسی وہ حرام موت ویسی یہ حرام زندگی بلکہ مرنا تو ایک دفعہ کا مرنا ہے اگر آدمی حرام موت مرا تو اس نے ایک گناہ کیا اور اس طرح کے جینے میں تو گناہوں کے علاوہ کفر کا خوف ہے یہ خاص صورت میں نے تو کسی کتاب میں دیکھی نہیں کسی مولوی سے مسئلہ پوچھوں تو فوراً تاڑ جائے گا اور پھر اگر مرنے ہی کی صلاح ٹھیری تو جینا خدا نے دشوار کر رکھا ہے مرنا لوگ مشکل کر دیں گے۔ کسی سے پوچھنے گچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں وعظ میں سن چکی ہوں کہ آدمی کا دل بڑا سچا فتویٰ دینے والا ہے اپنا راز کسی پر کیوں ظاہر کروں۔ یہ بات تو آج پہلے پہل میرے خیال میں آئی ہے۔ اس کو اچھی طرح سوچوں گی۔ اور پھر جیسا کچھ سمجھ میں آئے گا کر گزروں گی لیکن فرض کرو کہ میں نے مرنا ہی بچارا اور اس وقت تک تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ بے مرے اس مصیبت سے چھٹکارہ ممکن نہیں تو مرنے کی کیا شکل کروں گی۔ لوگوں کو کئی طرح پر مرتے سنا ہے۔ تو ان میں سے بعض طریقے تو مردوں ہی سے ہو سکتے ہیں اور مردوں میں بھی سب مرد نہیں بلکہ وہ جن کے دل بڑے ہی سخت ہیں۔ جیسے اپنے ہاتھ سے گلا کاٹ لینا۔ ذلیل قسم کی مہترانیاں کنوؤں میں گر کر ڈوب مرتی ہیں سو ان کو بے پردگی کی وجہ سے اس کا موقع ملتا ہے۔ ان کو اس کا خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ ہماری لاش کو بھی لوگ نکالیں گے۔ اور یہ تو سارے شہر میں غل مچ جانے کی بات ہے۔ اور میں چاہتی ہوں چپ چپاتے کی موت۔ بہتیرے لوگ کسی قسم کا زہر کھا لیتے ہیں جیسے کچلا سنکھیا۔ یا اور کوئی چیز سوسنا ہے کہ کچلوں میں تو آدمی دست اور قے سے مرتا ہے۔ مرنا تو بڑا کٹھن کا مرنا ہے اور اس کو تو میرا جی نہیں چاہتا۔ اور ہاں اگر سویرے سے معلوم ہو جائے تو تدبیر کرنے سے مریض بچ بھی جاتا ہے۔ سنکھیا بڑا قوی زہر ہے اور اس سے کلیجہ کٹ کٹ کر منہ کی راہ باہر آتا ہے۔ اور بڑی ہی تکلیف سے جان نکلتی ہے۔ ایک دفعہ محلے میں دھوم مچی تھی کہ خدا جانے کس دھوکے میں سنکھیا کھا لی۔ جلدی سے خبر ہو گئی۔ کیوڑے بھر بھر کر گھی پلانا شروع کیا۔ بارے وہ آدمی بچ تو گیا مگر اس کا سارا بدن پھوٹ نکلا تھا۔ خودکشی کا سب سے عمدہ اور آسان طریقہ جو اکثر سننے میں آتا ہے افیم کا کھا لینا ہے۔ دوسرے زہر تو ذرا ملتے بھی مشکل سے ہیں سرکار سے ان کے بیچنے کی بندی ہے اور افیم تو ایسی چیز ہے کہ جو چاہے اور جس وقت چاہے لے آ سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آنے ڈیڑھ آنے کی افیم میں اچھے جوان آدمی کا کام تمام ہے

تو مجھکو کچھ اس کا تردد بھی کرنا نہیں ہیں جانتی ہوں کہ دادا کی لٹچپہ میں چار پانچ آنے کی افیم ہر وقت موجود رہتی ہی۔ وہ تو اپنی طرف سے ہزاروں نستیں کھاتی ہی۔ اُس نے افیم کو مسور سے کبھی بڑھنے ہی نہیں دیا۔ سو بھی ایک وقت مگر کوئی اُس کے کہنے کا یقین تھوڑا ہی کرتا ہے مہینے کے مہینے بیٹا دروازے پر آ کر لڑ جاتا ہو۔ کہ جتنی افیم تم دو دن میں کھاتی ہو ایک دفعہ مجکو کھلا کر سلا دو تو میرا پاپ کٹے۔ یہ تو منہ ڈا پڑ رہا ہی اور تم کو اپنے عمل کے آگے کسی کی پرواہ نہیں۔ جب کبھی آ کر تم سے مانگا تم نے ٹکا سا جواب دیا۔ غرض افیم تو گویا میرے بٹوے میں ہی جس وقت چاہوں کھا سکتی ہوں اور چونکہ نشے کی چیز ہی زیادہ کھانے سے آدمی ضرور بے ہوش ہو جاتا ہوگا۔ اور بے ہوشی میں اس کو جانکنی کی کچھ تکلیف بھی نہ ہوتی ہوگی رات کو کھا کر سو رہا اور سوئے کا سویا رہ گیا لیکن یہ قباحت اس میں بھی ہی کہ ہضم نہ ہونے پائے اور خبر ہو جائے تو ڈاکٹر لوگ تو سموچی افیم پیٹ سے نکال لیتے ہیں اور ہم لوگوں میں بھی قے کراتے ہیں اور افیم کو ٹھیرنے نہیں دیتے اور شبہے کے محل پر اگر کوئی سرکار میں جا لگائے تو مردے کا پیٹ بھی چیرتے ہیں۔ یہ تو بڑا فضیحتا ہی جان کی جان گئی اور لاکھوں روپے کی آبرو خاک میں ملی سو الگ مگر پھر بھی افیم کا کھا لینا اور طریقوں سے بہتر ہی جلدی کیا ہی پھر کسی وقت اس معاملے میں غور کروں گی۔

جب جب آزادی نے خیال کیا اس کی سمجھ میں بھی آیا کہ خودکشی کے بدوں بن نہیں پڑتی وہ اپنے تئیں دیکھتی تھی تو اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکان ہی مکین نہیں۔ انگشتری ہی اور نگین نہیں۔ چمن ہی اور گلچیں نہیں۔ مسند ہی اور مسند نشین نہیں پس آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی اور بیوگی اور خوش دلی اور دینداری۔ میں کسی طرح ان چیزوں کو اچھی نہیں رکھ سکتی وہ اپنی حالت سے اس قدر آزردہ تھی کہ ڈرنا اور ہچکچانا کیسا ہزار جان مرنے کی آرزومند تھی۔ اُس کو تامل تھا تو اسی بات کا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں میری عاقبت خراب ہو دانشمندی کی بڑی پہچان یہ ہی کہ جو دانشمند ہوتے ہیں وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دوسروں سے صلاح لیئے بغیر نہیں کیا کرتے اور یہ تو جان پر کھیل جانے کی بات تھی۔ آزادی بے قرار تھی کس سے پوچھوں کس کی صلاح لوں۔ اسی پریشانی میں ایک رات اس کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہی کہ میں نے وضو کر کے دو رکعت نماز استخارہ پڑھی۔ دعا مانگی

جوں فال دیکھنے کو قرآن کھولا تو اُس کی پہلی سطر کے شروع میں تھا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو) اور حاشیے پر کسی حدیث کے حوالے سے لکھا تھا کہ جو شخص جس طور سے خود کشی کرتا ہے ابد الآباد تک اُسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ اس خواب کے دیکھتے ہی چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سمجھی کہ خدا کا حکم نہیں۔ اس سے اُس کو کسی قدر ملال تو ضرور ہوا کہ اس مصیبت سے بچنے کی ایک تدبیر سمجھ میں آئی تھی وہ بھی پیش رفت نہ ہوئی۔ مگر اس نے خدا کا بڑا ہی شکر کیا کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے اُسکو عذاب آخرت سے بچا یا۔ اور آیندہ کو توبہ کی کہ چاہے گھٹ گھٹ کر مرہی کیوں نہ جاؤں پر ان شاء اللہ خود کشی کا تو کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کروں گی آزادی نے مہینوں لوگوں کے آنے کی بندی رکھی۔ لوگ تو اس کی بیوگی کے خیال سے بھی اس کے یہاں آنے میں مضائقہ کرتے تھے کہ کیا جائیں اور کیوں بے چاری غریب کو ستائیں جاتی نہ جاتی خود آزادی۔ سو اس کو ایسی وحشت اُچھلی کہ لوگوں کی صورت تک دیکھنی بھی اس کو گوارا نہ تھی۔ اور واقع میں جو شخص اپنی ہی زندگی سے ملول ہو اُس کو لوگوں کے ملنے سے کیا حصول ہو۔ اب جو اُس کا ایک بڑا منصوبہ خدا نے غلط کیا تو اُس نے چاہا کہ لوگوں سے ملوں جلوں۔ اپنا کہوں دوسرے کی سنوں۔ شاید گفتگو کے سلسلے میں کوئی کام کی بات نکلے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ بندی اُٹھا دی گئی تو پاس پڑوس والے مدتوں سے اس کی تاک میں تھے دروازہ کھلا دیکھتے ہی آن بھرے۔ اور اب آزادی کی بیوگی کی زندگی کا بنا ڈھنگ پڑا۔

تیرہویں فصل۔ ایک شخص خواجہ مشتاق نام آزادی کے پیچھے پڑا اور اُس نے ایک کٹنی کو بیچ میں ڈالا

اُس کے باپ کے ملاقاتیوں میں اور عجب نہیں دور کے رشتہ داروں میں بھی ایک صاحب تھے خواجہ مشتاق۔ ہم خیال ہونے کی وجہ سے دونوں میں بڑی راہ و رسم تھی۔ اگرچہ مناسبت عمری نہ تھی مگر چونکہ طبیعت ایک طرح کی واقع ہوئی تھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے بے تکلف تھے جیسے ہم جولی۔ اور انگریزی خیال کے لوگ پاس مراتب کی پروا بھی ذرا کم کرتے

ہیں اور اُن کے نزدیک ہندوستانیوں کا ادب اور لحاظ داخل بزدلی اور نفاق ہی۔ ہم تو اس کو بدتہذیبی ہی سمجھتے ہیں مگر آزاد کو مشتاق کی کچھ یہی ادا بہت بھاتی تھی کہ وہ آزاد کے بیٹوں کی برابر ہو کر اس کے سامنے بے تامل حقہ بلکہ چرٹ پیتا۔ آتے جاتے اس کی تعظیم کو نہ کھڑا ہوتا۔ اس کا خیال نہ رکھتا کہ مجھ سے بڑے ہیں۔ ان کی طرف پیٹھ نہ ہو یا اُن سے اونچا نہ بیٹھوں زبان پر آنا شرط ہی پھر اس کو شعر کے پڑھ دینے میں بھی باک نہ تھا سیٹی تو اُس کی عادت تھی بارہا دیکھا کہ لوگ جمع ہیں بعض اس سے بڑے اور بعض اجنبی ہیں۔ اس کے جی میں آگئی تو لگا تال سُر کے ساتھ اس طرح بے وقت کی الاپنے کہ گویا تنہائی ہی۔ بڑوں کی بات کاٹ دینا۔ اُن پر اعتراض کر بیٹھنا یہ تو اس کے اور اُس کے قدردان خواجہ آزاد کے نزدیک تقاضائے آزادی رائے تھا۔ ہم نے موقع پا کر دو چار بار اس کو ٹوکا بھی مگر جب ٹوکا خواجہ آزاد نے اُس کو اُلٹی ہی شہ دی۔ بہرکیف مشتاق ہی ایک نوجوان آدمی تھا خواجہ آزاد کی مرضی کے مطابق جس کا نمونہ دکھا دکھا کر خواجہ آزاد اپنے بیٹوں کو بھی ایسا ہی بے وحدت بنانا چاہتا تھا۔ نہیں معلوم مشتاق کے اپنے گھر جگہ نہ تھی اور اس کو دنیا کا بھی کوئی کام تھا یا نہیں۔ ہم نے تو اس کو جب دیکھا خواجہ آزاد ہی کے گھر دیکھا۔ اس کثرت سے آنا جانا ہو تو پردہ کیا باقی رہ سکتا ہی ساری عورتوں کے نام اُس کو معلوم۔ ہر ایک کی آواز وہ پہچانے۔ گھر کے رگڑوں جھگڑوں کی اُس کو خبر۔ ایسے آدمی کی نسبت گنتی کیا پوچھنی ہی کہ کی بار اس نے آزادی کو اور کتنی دفعہ آزادی نے اس کو دیکھا۔ آزادی کی جھلکی تو اس کے بیاہ کے بعد بھی مشتاق نے دیکھی ہو تو عجب نہیں۔ غرض دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ مگر دونوں کے جاننے پہچاننے میں بڑا فرق تھا۔ آزادی تو مشتاق کو اتنی قدر جانتی تھی کہ ابّا جان کے ملنے والوں میں ہیں اور اکثر ابّا جان ہی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن مشتاق کا جاننا دوسری طرح کا تھا وہ شروع سے اس کی خوب صورتی اور ذہانت یعنی کُل اداؤں کا فریفتہ تھا۔ اور ابتدا سے اس کو خیال تھا کہ کسی طرح اس کے ساتھ بیاہ ہو اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ بکثرت آنے جانے کی وجہ سے مشتاق کو یہ خیال پیدا ہوا یا اس خیال کی وجہ سے وہ بکثرت آیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جن خیالات کی وجہ سے آزاد اس کو عزیز رکھتا تھا وہ اُس کے اصلی خیالات تھے یا آزادی پر

دست رس حاصل کرنے کے لیے وہ خواجہ آزاد کا ہم خیال بنا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر
خواجہ آزاد کا اختیار چلتا تو وہ آنکھ بند کر کے اس کے ہاتھ میں آزادی کا ہاتھ پکڑا دیتا۔ آزادی اور
مشتاق میں اگر رُو در رُو اُس کا تذکرہ ہوا ہو اور آزادی نے مشتاق کو امید دلائی ہو تو اس کا بھی کچھ
تعجب نہیں جو شخص یہ چاہتا ہو کہ بیٹی دیکھ بھال کر اپنی پسند سے آپ اپنا بیاہ کرے اُس کو
دوسرے احمق بابوں کی طرح سُسرا کہلانے کی کیا پڑی۔ خود اُس سے بیٹی کی خواستگاری کیے
جانے کی کیا عار۔ مشتاق کو یہی تو بڑا دھوکا ہوا۔ اس نے خواجہ آزاد کی مدارات اور اُس کے
خاص التفات سے جانا کہ آزادی میری ہو چکی اس کو یہ خبر نہ تھی کہ آزاد مُونہہ ہی سے کہنے کے
آزاد ہیں۔ آزادی کے باپ ضرور ہیں مگر بی بی اور دوسرے کنبہ داراں سے مجبور ہیں۔ اس کی
طرف سے نہ رقعہ نہ پیام اور وہاں تڑسے آزادی کی منگنی ہو گئی۔ مشتاق منگنی کی سُنکر بہت سٹ پٹایا
اور تلے کی زمین اوپر کر ماری کہ کسی طرح منگنی چھوٹ جائے مگر منگنی کا نام تھا اور حقیقت میں نکاح کا
استحکام ہاں ذرا پہلے سے بھی اس کو معلوم ہو کہ منگنی کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے تو یہ ایسا چلتا ہوا
تھا کہ کسی کی ٹٹی نہ جمنے دے مجبور صبر کر کے بیٹھ رہا اور سمجھا کہ یہ شعر اسی کے حسب حال ہے ؎

خیال زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

مگر مشتاق نے آزادی کا خیال نہیں چھوڑا۔ آزادی نے شوہر کے مرنے کا کیا غم کیا ہو گا جو
اُس نے آزادی کے دوسری جگہ بیاہے جانے کا کیا۔ مشتاق کی شوریدگی اور وحشت دیکھ کر
ہر چند اُس کے والدین اور رشتہ داروں نے چاہا کہ اس کو کسی اور جگہ پابند کر دیں مگر اُس
نے بالکل ہامی نہ بھری۔ اس کے یار دوستوں کو بیچ میں ڈالا اُنہوں نے سمجھایا کہ ایک آزادی
پر کیا موقوف ہے شہر میں ایک سے ایک بہتر خوب صورتیں بھری پڑی ہیں کہ آدمی بیٹھا اُن
کا مُونہہ دیکھا کرے۔ اور اگر خوشحالی دیکھ کر کرتے ہو تو خواجہ آزاد بے چارے کس گنتی میں ہیں
جس امیر کے گھر کہو تمہارا پیام لیجائیں۔ اور بیاہ نہ کرا دیں تو پھر ہمارا نام نہیں۔ جسے نسب
کا خیال ہے تو ہیں خواجہ آزاد بھی شریف بھلے مانس مگر اصل سید نجیب الطرفین کی بیٹی مل سکتی
ہے۔ تم نے اپنے تئیں سمجھا ہی کیا ہے تم تو آج شہر میں کسی کو ایسا نہیں دیکھتے کہ تمہارا
رقعہ جائے اور اُس کے مُونہہ میں پانی نہ بھر آئے بھائی جان زمانہ ایسا نازک آ گیا ہے کہ بیٹیوں

کو بر نصیب نہیں ہونے اپنے اچھے جتھے اور برادری والوں کو دیکھ لیا گھروں میں جوان جوان بیبیاں بیٹھی ہیں۔ صورت شکل پاکیزہ۔ ذات صفات عمدہ دان جہیز کی کمی نہیں۔ اور بیسیوں مشاطہ چھوٹی ہوئی ہیں جھوٹوں بھی کوئی نہیں کہتا کہ ہم کو لڑکی کی تلاش ہے۔ ہم کو اندرونی حالات تو بہت معلوم نہیں مگر لڑکی کی ننھیال تو کھلے ملانے ہیں۔ نانا ماموں سب کی یہی معاش ہے۔ اور ان لوگوں میں چاہے ہزار خوبیاں ہوں مگر جس نے مولویت کی روٹی کھائی اُس کی طبیعت میں ایک طرح کی دنائت تو ضرور آجاتی ہے۔ کہاں تک ننھیال کی خو بو نے اثر نہ کیا ہوگا۔ تو ایسی عورت کے ساتھ کیا تمہاری مرضی ملتی۔ اسی میں کچھ مصلحت تھی کہ وہ عورت تمہارے پلے نہ پڑی تم نے اس کا بھلا خیال کیا جانے دو دور کرو گوشت خر دندانِ سگ۔ دیکھو تو تمہارے واسطے کیسی کیسی جگہیں تجویز کی ہیں کہ سنو گے تو پھڑک اُٹھو گے۔ اشتاق یہ ساری باتیں چپ بیٹھا ہوا سنا کیا اور وہ جو کہتے ہیں اپنی مرغے کی ایک ٹانگ بولا تو یہ بولا میں بیاہ کرتا تو اسی کے ساتھ کرتا اب تو وہ ہاتھ سے نکل گئی اور افسوس ہے کہ میری غلطی اور چوک سے چھٹا ہوا شکار چھوٹ گیا میں جب تک جیوں گا اس صدمہ کو نہیں بھولوں گا۔ اور تم کیا مجھے شادی کی ترغیب دیتے ہو مجھے ہندوستانیوں کی سوسائٹی کا حال اچھی طرح سے معلوم ہے کیوں کہ میں بھی اسی سوسائٹی میں پیدا ہوا اور اسی سوسائٹی میں بڑا ہوا ہوں میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہندوستانی عورت مجھ کو وہ راحت پہنچا سکتی ہے جس کی میں شوہر ہونے کی حیثیت سے توقع رکھ سکتا ہوں۔ میں اس ملک کی عورتوں میں اور جانوروں میں کچھ فرق نہیں پاتا۔ مگر بہت ہی کم ان میں نہ بی بی ہونے کی صلاحیت ہے نہ ماں ہونے کی۔ اور صلاحیت ہو تو کہاں سے ہو تعلیم نہیں تربیت نہیں۔ بیبیاں نہ کہو۔ معزز لونڈیاں۔ مقرب مامائیں۔ کیوں کہ گھر کی ٹہل اور خدمت کے سوائے (اور ٹہل اور خدمت بھی متبذل) ان کو کچھ اور بھی آتا ہے۔ لیاقت کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی بدنصیب خانہ دار کو سفر درپیش آگیا تو جتنے دن سفر میں گزرے بیوی رانڈ اور میاں رنڈوے۔ دل کی بات نہ یہ لکھ سکتا ہے اور نہ وہ لکھ سکتی ہے۔ بڑی سیانے محلے میں بوجھ بجھکڑ کہلاتی ہیں کوئی سودا ہو جب تک دروازے پر آپ نہ چکا لیں اعتبار نہیں آتا مگر خیر سے اتنا نہیں بتا سکتیں کہ ساڑھے سترہ آنے سیر تا بنا تو تین پاؤ ڈیڑھ چھٹانک دو

پیسے اوپر کے کیا دام ہوئے۔ دو مہینے کی مہلت بیٹھی حساب کیا کرو۔ مگر تم کو قسم ہے جو کسی مرد سے
پوچھا۔ بنیا اور قصائی اور گوٹے والا اور ٹھیٹرا اور بزاز اور سُنار۔ غرض جس سے معاملہ پڑا
اُسی نے دھوکا دیا اور ان بھولی بیگم کو کچھ خبر نہیں۔ باوجودے کہ آپ اور ما اور نانی اور شاید
پرنانی بھی انگریزی عمل داری میں پیدا ہوئیں اور غرہ یہ کہ گھر کے جتنے مرد سب نوکری پیشہ کوئی سررشتہ دار
کوئی منشی کوئی تحصیلدار غرض کوئی سرکاری محکمہ نہیں جس میں اُن کے گھر کے ایک دو ملازم نہ ہوں
ویسرائے اور لفٹنٹ گورنر اور ہائیکورٹ کے جج اور کورٹ کو تو یہ کیا جانیں گی اتنا معلوم نہیں کہ کلکٹر اور مجسٹریٹ
میں کیا فرق ہے قسمیں کھائیں اور یقین نہ آیا کہ تار میں نہ جادو ہے اور نہ اس میں کوئی پتلی دوڑتی ہے۔ کتنا
کتنا سمجھایا کہ ریل بھاپ کے زور سے چلتی ہے مگر یہ جھٹلائے ہی گئیں۔ غالباً محلے کی حلال خوری سے سُن لیا ہوگا
کہ ولی عہد روس آنے والا ہے اتفاقاً خدا جانے کس تقریب سے میرے سامنے اُن کے مُونہ سے نکل گیا تو میں نے کہا آہا آپ تو
دنیا کی بڑی خبریں رکھنے لگی ہو۔ بھلا تو کہو روس ہے کدھر تو کیا جواب دیتی ہیں جانے بلا کدھر
ہے پڑے چولھے میں کہیں کچہال بھی بکتی ہوئی دیکھی ہے۔ کئی سال سے سرکار موت اور پیدائش
کے رجسٹر بنوانے لگی ہے تو ان رجسٹروں سے ثابت ہوا کہ ہر چھ بچوں میں پانچ مر جاتے ہیں۔
ایک اس وجہ سے کہ ہم لوگ قواعدِ حفظ صحت کی تعمیل نہیں کرتے۔ ایک اطبائے یونانی کے
اٹکل پچّو علاج سے اور تین نادان دوستوں کی دوستی یعنی ماؤں کی بے تدبیریوں سے۔ کہ اُن کے
نزدیک نظر اور تصرف ارواح خبیثہ کے سوائے بچوں کو اور کوئی روگ ہی نہیں ہوتا۔ اور
جو ایک گراں جاں بچتا ہے چوں کہ جاہل ماں کی نگرانی میں تربیت پاتا ہے بڑا ہو کر کودن کندۂ
ناتراش ہوتا ہے اور اس کے سوائے وہ اور ہوتا بھی کیا۔ پس اگر سچ پوچھو تو ان عورتوں نے
بنی آدم کی نسل کو ایسا بگاڑ دیا کہ اب اُس کی درستی کی امید موہوم ہے جس کے ایسے
خیالات ہوں وہ کیا کسی عورت کی طرف رغبت کرے گا۔ وہ بھی نہیں معلوم کیا
بات تھی کہ میں ایک کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ تم کہتے ہو کہ اُس سے
بہتر بہتیری حسین عورتیں شہر میں بھری پڑی ہیں۔ میں خود حسین نہیں تو
ہمارا خاندان شہر کے حسین خاندانوں میں گناہ جاتا ہے۔ میں نے بہت حسین
دیکھے ہیں۔ مگر جس کو میں نے پسند کیا تھا وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ میں نے اُس کو

اُس عمر سے دیکھا جب اُس کو حسن کے معنی بھی سمجھنے کی تمیز نہ تھی۔ اُس وقت بھی اُس پر وہ خداداد جوبن تھا کہ بنانے سنوارنے سے بھی وہ بات نصیب نہیں ہوتی۔ تم لوگ شاید گوری رنگت اور سڈول نقشے ہی کو خوب صورتی سمجھتے ہو اور میرے نزدیک اصلی خوب صورتی یہ ہے کہ ہر ایک ادا دل فریب ہو۔ یہ بات زوہیں نے اُس کے سوائے کسی میں نہیں دیکھی میں نے اُس کو روتے دیکھا۔ مچلتے دیکھا۔ لڑتے دیکھا۔ بگڑتے دیکھا۔ ہنستے دیکھا۔ منتے دیکھا۔ مناتے دیکھا۔ شرماتے دیکھا۔ عجیب طرح کا حسن خدا نے دیا ہے کہ کسی حالت میں بے زیب نہیں میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ خدا نے اُس کو کمالِ حسن کا ایک اعلیٰ درجے کا نمونہ پیدا کیا ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ لفافہ عمدہ ہوتا ہے تو ملفوف کہیں عمدہ ہوتا ہے۔ پس جیسا اُس کا جسم لطیف ہے ویسا ہی اُس کا دل یقیناً پاکیزہ ہوگا۔ غرض اس کا تو خیال بھی نہ کرنا کہ میں اُس کے سوائے کسی دوسری کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھوں گا۔ بے شک وہ اس وقت میرے دسترس سے باہر ہو گئی ہے مگر اُس کی محبت میری جان کے ساتھ ہے۔

آزادی کی طرف سے ناامید ہو کر مشتاق جھینپوں قبرستانوں میں مارا مارا پڑا پھرا۔ پھر مدت تک غائب رہا تھا کہ کہیں باہر نکل گیا۔ ایک عرصہ کے بعد پتہ لگا تو لوگ جا کر لے آئے یہاں آیا تو ایسا بیمار پڑا کہ آخر حکیموں نے جواب دیدیا۔ مستجاب کے مرنے کی خبر سُنی تو اس توقع سے پھر جی اُٹھا کہ آزادی بیٹھنے والی تو ہی نہیں۔ جوان عمر۔ آگے کوئی اولاد نہیں۔ سسرال والوں سے بگاڑ۔ ننھیال مولوی۔ کہ اُن کی طرف سے نکاحِ ثانی کا تقاضا نہ ہوگا تو مزاحمت بھی نہیں کر سکتے باپ کی رائے معلوم ہے کہ وہ عادت کو بھی ضروری نہ سمجھتے ہوں گے پس آزادی دوسرا نکاح کرے پر کرے۔ من جانب اللہ ایسا موقع پیش آیا ہے۔ اس کو تو ہاتھ سے جانے نہ دوں اب یہ لگا منصوبے سوچنے کہ کیا تدبیر کروں۔ خواجہ آزاد کے ساتھ اگرچہ راہ و رسم چھوٹ گئی ہے۔ مگر میں ان سے خدانخواستہ کچھ لڑا نہیں۔ جھگڑا نہیں۔ رُو در رواں سے کسی طرح کی شکایت کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اور وہ آدمی اپنے دم سے ہیں بھی ایسے بے تکلف کہ شاید اُن کو میری غیر حاضری کا خیال بھی نہ ہو۔ اور اگر خیال کرتے ہوں گے تو اپنے جی میں شرماتے بھی ضرور ہوں گے کیونکہ یقیناً اُن کی مرضی مُلّا نے کو بیٹی دینے کی نہ تھی۔ یہ جو کچھ ہوا اُن

کی رائے کے خلاف ہوا اور اس معاملے نے امورِ خانہ داری میں اُن کی بے اختیاری کا پردہ فاش کر دیا۔ اور اب اگر ایسا موقع آیا تو تلافی مافات کے لیئے ضرور میری حمایت کریں گے غرض اول تو وہ مجھ سے نارضامند نہیں اور نارضامند ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر ہوں تو اُن کو رضامند کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ نارضامند ہوں گے بھی تو اسی خیال سے کہ میں اُن سے روٹھ کر بیٹھ رہا تو یہ خیال میرے حق میں مفید ہے اور میں کہتا ہوں کہیں خدا کرے اُنہوں نے ایسا خیال کیا ہو اور نہ کیا ہو تو اب کریں۔ میرے روٹھنے کا خیال کریں گے تو اس کے ساتھ اس کی وجہ بھی ضرور خیال میں آئے گی اور یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اُن پر یہ تو ظاہر ہو جائے گا کہ میری خواستگاری عام طور کی خواستگاری نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ اصرار و ابرام بھی لیکن خیر وہ تو موقع اُن کے دخل دینے کا تھا بھی اب غالب یہ ہے کہ خواجہ صاحب بالکل بیٹی کی رائے پر رکھیں وہ تو اُس وقت بھی چاہتے تھے کہ بیٹی ہی کی پسند پر ہو مگر ہندوستانی سوسائٹی ابھی ایسی باتوں کے لیئے طیار نہیں میں خیال کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ نکاح ہو جانے سے عورت پر لحاظ کی اس قدر قید باقی نہیں رہتی۔ تو اب جو کچھ ہے آزادی ہے اُسی کو راضی کرنا چاہیئے۔ ہادی بیگم اپنی طرف سے بہتیرا زور ماریں گی کہ بیٹی اُن کے قابو میں رہے مگر آزادی کا مزاج بڑا ہی غیور واقع ہوا ہے میں نہیں خیال کرتا کہ اُس کو بھوپال سے تیس ۳۰ روپے مہینا ملے اور وہ باپ کے ٹکڑوں پر پڑی رہے دوسرے بھائی بھاوجوں سے بھی کچھ ایسا میل جول نہیں۔ بہرکیف عدت تک تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں بالفعل مجکو اتنا ہی کرنا چاہیئے کہ میرا کوئی آدمی آزادی کے پاس لگا رہے کہ یوماً فیوماً اور وقتاً فوقتاً مجکو وہاں کے حالات سے مطلع رکھے اور وہ آدمی ایسے سلیقے کا ہو کہ اُن سب کے دلوں کو ٹٹولتا رہے اور جب معلوم ہو کہ نکاحِ ثانی کی تحریک ہونے کو ہے تو سوائے میرے کسی کی بات کو پیش رفت نہونے دے مشتاق کہیں کا بہتا بہاتا تو دلی میں آ کر بسا نہ تھا پڑیاں اسی شہر میں گل گئی تھیں دور و نزدیک کے اتنے رشتہ دار تھے کہ چاہتا تو کوڑیوں عورتیں آزادی کے پیچھے لگا دیتا کہ کراماً کاتبین کی طرح ہمہ وقت اس پر مسلط رہتیں۔ مگر اس نے سوچا کہ یہ اخبار وار ہے ایسا نہ ہو کہ خالی جائے ایسا آدمی تجویز کرو کہ جی کھول کر مجھ سے پوست کندہ حالات بیان کرے مجکو صلاح بتلائے آزادی کے دل میں اپنا اعتبار جمائے۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ اس کام کے لیئے تو کوئی مشاطہ

ہونی چاہیئے۔ بڑی عیار بڑی تجربہ کار۔ اُن دنوں چھلاوا چھلاوا کر کے ایک کٹنی بڑی نامی تھی۔
مشتاق کو کبھی ایسی عورتوں کی ضرورت تو پڑی نہیں۔ نہیں معلوم اُس نے چھلاوا کا نام کہاں سے
سُن لیا تھا۔ بلایا۔ خاطرداری سے بٹھایا۔ سب حال سُنایا۔ لالچ دکھایا۔ مشتاق زیادہ منت و
سماجت کرنے لگا تو چھلاوا بولی اے میاں یہ بھی کوئی کاموں میں کام ہی۔ آزادی کو تو اپنی خدمت
میں حاضر سمجھو مجھ سے کہو تو میں عدت کے اندر ہی اندر اُس کو تمھارے پاس لا بٹھاؤں۔ مگر تم تو
نکاحتا بی بی بنانا چاہتے ہو تو جلدی کیا ضرور ہی بس اس بات سے خاطر جمع رکھو اور خانہ داری کا
سامان درست کر چلو۔ تمہاری لونڈی نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہی تو اطمینان رکھنا کہ آزادی دوسرا
نکاح کرے اور کرے اور تمہارے ہی ساتھ کرے۔ اس کے بعد چھلاوا آپ تو ظاہر نہ ہوئی مگر اپنے طور پہ
ذرا ذرا سی بات کی ٹوہ لگائی اور مشتاق کو پوہنچاتی رہی۔ وعظوں کا ہونا۔ ماکا ہر وقت بیٹی کے
پاس رہنا آزادی کی بےقراری۔ ہر وقت مستجاب کی یادگاری یہ سُن سن کر مشتاق تو نا امید ہوا جاتا
تھا کہ آزادی کا دوسرا نکاح کچھ ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اتنے وعظ ہوئے جو مولوی آیا تلقین
صبر ہی کرتا ہوا آیا کسی کے پھوٹے مُونہ سے اتنا نہ نکلا کہ بیوہ عورت کو دوسرے نکاح کا بھی حکم ہی
آج کل مولویوں کا تقاضائے دین داری معلوم ہی۔ ٹھیرائے ہوئے فتوے۔ چکائے ہوئے مسئلے
فرمایشی وعظ یہ تو مولویت رہ گئی ہی۔ تو جیسے مولوی ویسے معتقد۔ جیسے وعظ ویسے اثر۔ جیسے
فتوے ویسے معاملات۔ ماکا ہمزاد کی طرح بیٹی کو لپٹا رہنا ہی میرے لئے کونسی خوش خبری کی بات
ہی۔ وہ تو ایک سے لاکھ تک بھی میرے حق میں کلمۃ الخیر کہنے والی نہیں۔ وہ اچھی طرح مجھکو جانتی ہی
اور وہ ایک اعتبار سے اُس کو میرے نام کی چڑ ہی۔ اور یہی حضرت تو تھیں جنھوں نے مستجاب کو پسند
کیا تھا۔ اور چونکہ مولون ہی اُس کے فراج میں بڑا ہی تعصّب ہی۔ رات دن میاں کے ساتھ
بحثنی رہتی ہی۔ میں نے تو اس طرح کی ضدّی عورت دیکھی نہیں کہ لاجواب ہو ہو جائے اور قائل
نہ ہو۔ اس نغلی گھوسے سے خدا پناہ میں رکھے۔ اور جب اصل الاصول آزادی ہی کا یہ حال ہی کہ
کسی وقت اپنے پہلے میاں کو نہیں بھولتی تو کنکنواہتے سے اُکھڑا ہوا ہی۔ پیچ لڑیں گے کیا خاک
غرض روداد تو کچھ بگڑی ہوئی سی دکھائی دیتی ہی۔ آزادی ہی قسمت کی ہوتی تو پہلا ہی کھیل کیوں
بگڑتا۔ مشتاق کا یہ مایوسانہ کلام چھلاوا نے اسی طرح سنا جیسے کبھی ہم نادان بچوں کی باتیں سُنا

کرتے ہیں۔ اور مسکرا کر کہنے لگی کہ حقیقت میں مرد وے بڑے ہی بھولے ہوتے ہیں اور تم کو تو دنیا
کی ہوا تک بھی نہیں لگی۔ میاں میرے اور رُوداد وں کی تو میں کہتی نہیں آزادی کا کسی وقت
میاں کو نہ بھولنا یہی تو اس بات کی بڑی شناخت ہی کہ وہ بیٹھنے والی نہیں۔ اس سے معلوم
ہوتا ہی کہ اُس کی طبیعت اُنس پذیر واقع ہوئی ہی۔ اس مزاج کے آدمی بے اس کے کہ اُن
کو کسی نہ کسی کے ساتھ اُنس ہو رہ نہیں سکتے۔ تم اپنے ملاقاتیوں میں خیال کرو جن کی بیبیاں مر جاتی
ہیں اور بد اکر دیکھا ہی کہ جس کو بی بی کے ساتھ زیادہ اُنس ہوتا ہی وہی جلد دوسرا نکاح بھی کرتا ہی
سبب کیا کہ عورت کا ہونا اس کے لیئے شرطِ زندگی ہی۔ اس وقت تک تو روداد کچھ بگڑی
بگڑائی نہیں اور تم بے موقع جلدی مچا کر بگاڑ دو تو خبر نہیں۔ صبر کیئے بیٹھے رہو دیکھو تو کیا
ہوتا ہی۔ اتنا تو میں کہتی ہوں کہ اگر آزادی کو تمھارے گھر نہ لا بٹھاؤں تو چھلاوا اپنا نام
نہ رکھواؤں۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ آزادی کی تو کچھ بات ہی نہیں کوئی مشکل سے مشکل کام
بتا کر مجھ ناچیز کا کمال دیکھا ہوتا۔ بُرائی کرنے پر آوں تو شاموں شام آزادی کو یہاں لا کھڑا
کر دوں۔ مگر وہ بات تم کو منظور نہیں میں بھی کہتی ہوں خیر کچھ ضرور نہیں۔

چودھویں فصل کٹنی آزادی کے مزاج میں دخل پیدا کرتی اور آزادی کی رائے بدلنی شروع ہوتی ہی

غرض اُس وقت تک کہ آزادی نے اپنے گھر جا کر لوگوں کے آنے کی بندی رکھی چھلاوا کی کوئی کار
گزاری ظاہر نہ ہوئی۔ اندر اندر اور چپکے چپکے جو تدبیریں کرتی رہی ہو نہ ہم نے پوچھا نہ اُس نے
کہا۔ جب آزادی نے بندی اُٹھا دی اور لوگ اُس کے پاس آنے جانے لگے تو دو چار
دن کا غوطہ دے کر چھلاوا بھی ایک خاص وضع بنا کر جا موجود ہوئی آزادی نے اُس کو
دیکھا اجنبی صورت اور بری وضع پوچھا تو اُس نے کہا کہ مجکو آزمودہ خانم کہتے ہیں اور ہیں
ہوں تو لکھنؤ کی رہنے والی مگر مدت سے بھوپال میں رہنے کا اتفاق ہوتا ہی تمھارے میاں
مولوی مستجاب مرحوم کو اللہ اُن کو جنت نصیب کرے ہم لوگوں سے بڑی راہ و رسم تھی
میرے سامنے اُن کا انتقال ہوا۔ وہ اکثر ہم لوگوں سے تمھارا تذکرہ کیا کرتے تھے میں یہاں

آنے لگی تو دل میں کہہ کر چلی تھی کہ تم سے ضرور ملوں گی۔ تو آج خدا نے یہ آرزو پوری کی۔ مگر جیسا
حال تمہارا مولوی صاحب نے بیان کیا تھا اُس میں اور تمہاری اب کی حالت میں آسمان اور
زمین کا فرق ہے۔ اب میں نے تم کو اٹکل سے پہچانا ورنہ تم کو اصلی حالت میں دیکھتی تو شاید ہزار
بیبیوں میں بھی غلطی نہ کرتی۔ جتنا تم نے میاں کا غم کیا شاید دنیا میں اور کوئی نہ کرتا ہوگا چھلاوا
نے جس کو اب آزمودہ خانم کہنا چاہیئے جو تقریب ملاقات کی نکالی اس سے بہتر کوئی اور
تقریب ہو نہیں سکتی تھی۔ مستجاب کا نام سُن کر آزادی روئی اور اُس کا رونا حق بجانب تھا
مگر تعجب تو یہ ہے کہ آزمودہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ جب غم کی سوزش فرو ہوئی تو آزادی
نے مولوی صاحب کے تفصیلی حالات پوچھنے شروع کیئے کہ کیونکر بیمار پڑے اور کیا بیمار پڑے
کس کا علاج ہوا کون اُن کی خبر گیری کرتا تھا۔ اور مرتے وقت وصیت کے طور پر کچھ کہا یا نہیں۔
آزمودہ۔ مولوی صاحب کا مرنا تو عجیب طور کا مرنا ہوا جمعے کا دن تھا معمول کے مطابق اصلاح
بنوائی غسل کیا کپڑے بدلے۔ کھانا کھایا اور جیسی اُن کی عادت تھی ذرا کی ذرا لیٹے پھر اُٹھ کر وضو کیا
نماز کو گئے۔ نماز میں کھڑے کھڑے چکر سا آیا بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے جانا غش ہے بہت دیر
ہوئی تو کسی نے سمجھا سکتہ ہے۔ کوئی کہنے لگا مرگی ہے۔ سلطان الحکما اور جرنیل ڈاکٹر بلائے گئے
دونوں نے یہی کہا کہ کچھ ہی نہیں۔ قضا مہلت دیتی تو وہاں دوا اور خدمت کی کیا کمی تھی۔ آزادی
آخر حکیموں نے کچھ بیماری بھی بتائی۔ آزمودہ۔ کیا جانے بُوا ضعف قلب بتاتے تھے۔ میں نے نواب
سلطان الحکما سے پوچھا اور بڑی حجت کی تو اُنہوں نے کہا کہ یہ ایک خاص طرح کی بیماری ہے۔
ریاح پیدا ہو کر دل کو گھیر لیتی ہے اور جس طرح ملک میں ایک رئیس ہوتا ہے اسی طرح انسان کے بدن
میں دل سب کا سردار اور زندگی کا مدار ہے اور دل کو خدا نے ایسا نازک مزاج کیا ہے کہ ذرا سی تکلیف
کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا اور دل کی جتنی بیماریاں ہیں سب میں اسی طرح فوراً آدمی کا کام تمام
ہو جاتا ہے تدبیر کی نوبت نہیں آنے پاتی۔ آزادی۔ کیا اس بیماری کی پہلے سے کچھ خبر نہیں
ہوتی۔ آزمودہ۔ اب تم اس کو تحقیق کر کے کیا کر لوگی۔ آزادی۔ سچ تو ہے پھر تم یہاں دلی میں کیونکر
آئی ہو۔ آزمودہ۔ میری یہاں کچھ قرابت بھی ہے مگر میں ایک ایسی ضرورت سے آئی ہوں کہ ہے تو وہ
سرکاری کام مگر ایک اعتبار سے میرا اپنا کام بھی ہے۔ آزادی۔ اگر کوئی کام میرے کرنے کا ہو

یا جس کو تم جانو کہ میں کہہ سُن کر کرا دوں گی تو شوق سے کہنا۔ کیوں کہ اول تو میں یہاں کی رہنے والی ٹھیری۔ دوسرے اُسی سرکار کی نمک خوار۔ تیسرے جان پہچان کا حق ہوتا ہی اور تم سے اور مولوی صاحب سے تو عزیزوں کی طرح راہ و رسم تھی اور آج کو مولوی صاحب زندہ ہوتے تو نہ تم دوسری جگہ اُترنے کا ارادہ کرتیں اور نہ وہ تم کو دوسری جگہ اُترنے دیتے۔ آزمودہ۔ خدا گواہ ہی میں تو تم کو اپنوں سے بڑھ کر سمجھتی ہوں اور دوسری جگہ اُترنے کا تم ذرا بھی خیال نہ کرنا جس کام کے لیئے میں آئی ہوں اُس کام کا سر انجام وہیں سے خوب ہو سکتا ہی جہاں میں ٹھیری ہوں۔ اور تمہارے کہنے کی کیا ضرورت ہی مجکو پہلے سے یقین ہی کہ تم میرے کام میں دریغ نہیں کرو گی۔ مگر میں اچھی طرح سے تحقیق کر لوں تو پھر تم سے کہوں۔ اور شاید یوں ہی میرا مطلب ہو جائے تو تم کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہی۔ اور اب تو میں جاتی ہوں پھر خدا نے چاہا کسی دن ذرا سویرے سے آؤں گی کہ تم سے جی کھول کر باتیں کروں۔ آزادی۔ مناسب تو یہ تھا کہ تم یہیں رہتیں۔ مگر شاید تم کو میری غریبی کا خیال ہو تو خدا نے تمھاری سرکار کی بدولت بہتیرا کچھ دے رکھا ہی میں ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ تم کو مہمان نہ رکھ سکوں۔ یہی نہ کہ تم کو ویسا مزہ دار کھانا نہیں ملے گا لیکن ایک غریب کا جی خوش ہو جائے گا۔ آزمودہ۔ میں بھی ایسی کہاں کی امیر ہوں اور امیر بھی ہوتے ہیں تو چپاتیوں کی جگہ سونے چاندی کے ورق نہیں کھلاتے۔ خدا کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ چاہے تو پل کے پل میں فقیر کو امیر کبیر کر دے۔ کسی کے دن سدا یکساں نہیں رہتے خدا پر شاکر رہو اُس نے یہ مصیبت ڈالی ہی تو وہی اس کا عوض بھی دے گا ضرور دے گا۔ اور مجکو تمہارے یہاں کھانے میں کیا عذر تھا مگر دعوتوں سے چھٹکارہ نہیں جس کی ضیافت قبول نہ کرو وہی بُرا مانتا ہی اب میری بھانجی میری راہ دیکھ رہی ہو گی لو اللہ بیلی۔ آزادی۔ اپنا پتہ ٹھکانا بتا جاؤ تو میں ہی تم سے ملنے کو آؤں۔ آزمودہ نہیں نہیں۔ تم گھر سے پاؤں نکالنے کا کبھی خیال بھی نہ کرنا میں ہی کل نہیں تو پرسوں ضرور ضرور آؤں گی دوسری ملاقات میں آزمودہ نے جہاں اور بہت جھوٹ جھوٹ باتیں بنائیں کم بخت ایک تہمت بیچارے معصوم مولوی مستجاب مرحوم پر بھی لے مری تا کہ آزادی کا دل اِن کی طرف سے پھر جائے اور آخر کار پھر ہی گیا۔ اُس نے بیان کیا کہ تم نے نازک اندام بیگم کا نام تو سنا ہو گا یہ اصل میں لکھنو کے مرشد زادے عالی جناب کی خواص

تھیں۔ غدر میں جب لکھنؤ تباہ ہوا تو کسی طرح جو ایک قصہ طلب بات ہو بھوپال میں آکر سکندر بیگم
مصاحب ہوئیں۔ لکھنؤ کی سی ثروت تو کہاں نصیب ہوتی تھی مگر خیر بھوپال میں ان
کی پچیس ہزار روپئے سال کی جاگیر ہو گئی یوں کہو کہ آنسو پچھ گئے۔ چوں کہ آدمی منتظم ہیں وہاں
کی معتبر سرکاروں میں گنی جاتی ہیں۔ ان کے اپنے بطن سے تو کوئی اولاد ہوئی نہیں۔ ایک لڑکی کو
گود لے رکھا ہو۔ اب وہ لڑکی خدا کے فضل سے جوان ہوئی اس کے لیئے شوہر کی تلاش تھی اور
ہو۔ نازک اندام بیگم صاحب کا آنا جانا محلات شاہی میں تو لگا ہی رہتا ہو۔ خدا جانے کس طرح انھوں
نے تمہارے میاں کو دیکھا اور دیکھنے کے ساتھ لٹو ہو گئیں۔ سواری سے اترتے ہی مجھ سے
بولیں کہ لو بوا آزمودہ آج میں اپنی مرضی کا داماد دیکھ آئی۔ حال دریافت کرنا کیا مشکل تھا
اگلے ہی دن نواب صاحب سے کہلا بھیجا کہ ان مولوی صاحب کو تو ہمیں دو۔ یوں مولوی صاحب
سے اور ہماری سرکار سے راہ و رسم شروع ہوئی۔ مولوی صاحب آتے اور بیگم صاحب جاگیر کے
حکم احکام سے ان سے لکھوائیں اور کچھ لکھوانا پڑھوانا نہ ہوا۔ تو ادھر اودھر کی باتیں کرتیں۔ حاشا
مولوی صاحب مر گئے اور مجکو مرنا ہو میں مرے ہوئے آدمی پر جھوٹ نہیں بولوں گی میرے سامنے
تو کبھی شادی بیاہ کا مذکور آیا نہیں لیکن بیگم صاحب تو مولوی صاحب کے سامنے ہونے لگی تھیں اور
بیٹی کو بھی زیادہ نہیں بس ایک بار یا دو بار نہیں معلوم قصداً یا دھوکے سے ذرا کی ذرا مولوی
صاحب کے آگے ضرور کیا ہو لیکن اندر باہر سب تاڑ گئے تھے۔ اتنے میں مولوی صاحب کا واقعہ ہو گیا
بیگم صاحب نے بڑا ہی رنج کیا مگر کیا ہوتا تھا۔ ایک مدت سے داماد کی تلاش تھی اب ایک آدمی
اپنی مرضی کا ملا تھا تو ذرا مطمئن ہو گئی تھیں اب پھر بدستور پریشان ہیں کچھ ایسے پیچ آکر پڑے ہیں
کہ وہاں ان کو بیٹی دینی منظور نہیں۔ اور ماشاء اللہ لڑکی ہو کہ بادل کی طرح امڈی ہوئی چلی
آتی ہو میں نے بھی اپنی قرابت میں لکھا تھا کہ اگر کوئی لڑکا تمہاری نظر میں ہو تو لکھنا۔ انھوں
نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے پھر تقاضا لکھا کہ ایسی عمدہ جگہ کے تو ہزاروں خواہاں ہوں گے
تم کو دلی میں کوئی آدمی نہیں ملتا حقیقت میں دلی والوں کی کچھ تقدیر ہی پھوٹی ہوئی ہو
اب ان لوگوں نے ایک شخص کا نام لیا اور لکھا کہ سرکار دربار کی باتیں ہیں ابھی بیگم صاحب پر تو
اس کو ظاہر کرو نہیں تم آپ آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤ۔ یہ میرے آنے کی تقریب ہو ورنہ کہاں

ہیں اور کہاں دلّی۔ آزادی۔ پھر تم نے اُس لڑکے کو دیکھا اور کیسا پایا؟ آزمودہ۔ دیکھا اور
خوب اچھی طرح سے دیکھا جو دیکھنے کا حق ہی۔ میں نے خود اس سے پہروں باتیں کیں اور ہر طرح سے
اُس کو ٹٹولا۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کو اس سے بہتر شوہر۔ ساس سُسرے کو اس سے
بہتر داماد۔ ماباپ کو اس سے بہتر بیٹا۔ غرض اُس سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہی۔ مگر اس سے زیادہ
مشکل ہی اُس کا راضی ہونا۔ آزادی۔ دلّی میں ایسا کونسا بشر ہی۔ آزمودہ پرکھنے والا ہو تو پتھروں
میں سے ہیرے کو ڈھونڈ نکالے مگر ابھی میں اس کا نام نہیں بتانا چاہتی اس میں کچھ مصلحت ہی
خدا نے چاہا پھر آؤں گی تو اس کی ساری حقیقت تم کو کہہ سناؤں گی۔ آزمودہ تو اتنی باتیں
کر کے رخصت ہوئی اور آزادی لگی دل ہی دل میں سوچنے کہ یہ عورت ظاہرا مجھ سے کوئی غرض
اور مطلب نہیں رکھتی۔ میں نے چاہا کہ میرے پاس ٹھہرے تو اُس نے ٹھہرنے سے انکار کیا۔ میں نے
کہا کہ میرے کرنے کا کوئی کام ہو تو میں تمہاری مدد کو حاضر ہوں۔ اس وقت تک مجھ سے کسی طرح
کی مدد کی درخواست نہیں کی جتنی باتیں کیں سب پتے اور ٹھکانے کی۔ بے شک مولوی صاحب
امیروں کی صحبت میں بیٹھ کر بہک گئے ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ دولت ہی بھی ایسی ہی بُری
بلا کہ اس کا نشہ ایک بار فرشتے کو بھی بھوت بنائے بغیر نہ رہے ہمارے ہی شہر کے امیروں کا
کیا حال ہی مردانے پلید ناپاک۔ زنان خانے گندے نجس۔ خراب۔ نالائق طریقے۔ لغو بیہودہ
مشغلے۔ ایک لونڈی کا جنا ہی تو دوسرا رنڈی کے پیٹ کا۔ شرافت چھو نہیں گئی بھلمنساہت کے
پاس ہو کر نہیں نکلے قلعے کے جو جو حالات سننے میں آئے اور لکھنؤ کی جیسی جیسی باتیں مشہور ہیں
ہم لوگ تو کانپ کانپ اُٹھتے ہیں۔ بیچارے مولوی صاحب کا تو وہی حضرت یوسف کا سا حال
ہوا ہو گا۔ بھلا وہ تو پیغمبر تھے اُن کو خدا نے زلیخا کے پھندوں سے بچایا مولوی صاحب بن بیاہا
نازک اندام کے دام سے کیا محفوظ رہے ہوں گے۔ خیر اب مرے ہوئے آدمی کو میں کیا کہوں مگر بے وفائی
تو ضرور کی۔ دنیا دیکھ رہی ہی کہ میں نے اُن کے حقوق میں سے رتی برابر بھی کوئی حق فروگزاشت
نہیں کیا جب تک یہاں رہے اُن کی فرماں برداری سے کسی حالت میں باہر نہ ہوئی۔ پیٹھ
پیچھے کسی سے اُن کا گلہ شکوہ نہ کیا۔ جو اُنہوں نے لا کر دیا تھوڑا یا بہت خوش دلی سے سر آنکھوں
پر رکھا۔ میری تو کیا حقیقت تھی مگر اُس پاک پروردگار کا شکر ہی اُن کی امانت میں کسی طرح کی

خیانت نہ کی۔ یہاں تک کہ اُس بے نیاز نے شریعت کے قاعدے کے مطابق عدت بھی پوری کرادی اور میں اُن کی زوجیت سے ادا ہوئی۔ میں نے اُن کے مرنے کا تاریخ کیا کہ بس خدا ہی پر خوب روشن ہی یہاں تک کہ میں نے اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاک کر ناچاہا اور سب طرح کے منصوبے سوچے مگر کبھی بھول کر بھی دوسرے نکاح کا خیال نہ کیا۔ صرف اس لیئے کہ وہ جیتے جی میرے ہو کر رہے شرط مروت یہ ہی کہ میں بھی جب تک دم میں دم ہی اُن ہی کی ہو کر رہوں لیکن آزمودہ کی زبانی جو حالات سُنے اگر سچ ہیں اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ سچ کیوں نہ ہوں تو وہ شرط مروت بھی باقی نہیں رہی۔ اور اب میں غور کرتی ہوں تو میرا یہ خیال بھی غلط تھا کیونکہ اگر دوسرا نکاح داخل بے مروتی ہوتا تو خدا ہرگز اُس کا حکم نہ دیتا بے مروتی تو بُری بات ہی تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ توبہ توبہ خدا اپنے بندوں کو حکم دیتا ہی کہ بُرائی کرو۔ ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہی کہ بے مروتی کے بُرا ہونے کا بڑا سبب یہ ہی کہ بے مروتی سے اُس کو رنج پہنچتا ہی جس کے ساتھ بے مروتی کرو اور یہاں تو یہ صورت بھی نہیں۔ تو دوسرے نکاح کو بے مروتی کہنا ہی غلط ہی۔ اگر میری عمر دوسرا نکاح کرنے کی نہ ہوتی یا میرے آگے اولاد ہوتی تو شاید دوسرے نکاح کا خیال کرنا نامناسب تھا لیکن بے مروتی کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری دوسری باتوں کے لحاظ سے سو کتنے میں مجھ سے بڑی بڑی عمر کی بیٹھی ہیں جن کی منگنی کا بھی ذکر تذکرہ نہیں۔ اور میرا بیاہ بھی اس جلدی سے اماجان نے کردیا تھا ورنہ اماجان کی رائے پر ہوتا تو شاید ابھی تک میرے بیاہے جانے کی نوبت بھی نہ آتی۔ ای ہی اس سے تو میرا بیاہ نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ اماجان نے ناحق میری منزل کھوٹی کی۔ گھر گھر کواریاں بیٹھی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کے آگے میری قدر کیوں ہونے لگی۔ اور گو دوسرا ہی نکاح کیوں نہ ہو مگر اس کی چھیڑ چھاڑ میری طرف سے تو ہو نہیں سکتی لوگ شاید کرتے بھی میں نے ہی ایسا ڈھنگ ڈالا کہ کسی کو جرأت نہ ہوئی اور میرا اوطیرہ دیکھ کر سب کے سب اپنی جگہ رُک گئے۔ لیکن ابھی کیا گیا ہی۔ کے دن ہوئے کہ میں نے لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت دی ہفتے عشرے سے عورتیں آنی شروع ہوئی ہیں۔ میں ان کے ساتھ اکھڑی اکھڑی باتیں نہ کروں ایسا تو کیا ہی کوئی نہ کوئی تو ان میں سے اس کا اشارہ کرے پر کرے۔ اگر میں سُن کر چپ بھی ہو رہوں تو لوگ سمجھ لیں گے کہ مجکو انکار نہیں

پھر یہ بات کا سلسلہ آگے کو چلے لیکن ابھی تو میری ہی رائے کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ پہلے میں اپنے
دل میں تو فیصلہ کر لوں کہ دوسرا نکاح کرنا بھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کرنا تو شاید لوگوں سے
ملنے ملانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ میں نے جو لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو اسی غرض سے
کہ میری دل بستگی کی کوئی شکل نکلے۔ سو میرے دل کا حال مجھ سے بہتر کیا کوئی جانے گا۔ عورتوں کے
دل بہلانے کی جو جو صورتیں ہیں اور ہو سکتی ہیں میں نے کوئی باقی نہیں چھوڑی جس کو ابتدا
سے انتہا تک اچھی طرح سوچا سمجھا نہ ہو۔ اُن میں سے تو کوئی بات دل کو نہیں لگتی اور حقیقت
میں اس کی توقع کرنی ہی نادانی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی بیوگی کی تلافی کر سکتی ہے۔ پھر اس کو
خیال آیا کہ کسی شخص نے بیوہ عورتوں کے دوسرے نکاح پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا اور وہ کہیں
نہ کہیں میری کتابوں میں ضرور ہوگا۔ اُس کو ڈھونڈ کر نکالا اور دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ دیکھنے
سننے۔ سونگھنے۔ چکھنے۔ چھونے کی قوتیں جو خدا نے انسان کو دی ہیں اور جن کو حواس خمسہ کہتے
ہیں گویا اتنی قسم کی ضرورتیں ہیں۔ ایک ضرورت کو دوسری ضرورت رفع نہیں کر سکتی نہ دیکھنے
کا کام سننے سے نکلتا ہے اور نہ سننے کا سونگھنے سے۔ علیٰ ہذا القیاس آدمی کے دل میں بھی طرح
طرح کی خواہشیں ہیں مثلاً دولت کی خواہش۔ اولاد کی خواہش۔ نام و نمود کی خواہش تن درستی کی
خواہش۔ جو دولت کا خواہاں ہے اولاد اور نام و نمود اور تن درستی کسی چیز سے دولت کی طلب
کم نہیں ہو سکتی اسی طرح جس کو اولاد کا ارمان ہے وہ کبھی خوش ہو کہ اُس کو اولاد ملے۔ اگر اولاد
کے بدلے روپیہ دیا جائے یا اُس کے نام کے اشتہار چھپوا کر دنیا میں بانٹ دیئے جائیں تو وہ
کیوں راضی ہونے لگا۔ تو جب کوئی ضرورت کسی دوسری ضرورت سے رفع اور کوئی خواہش
کسی دوسری خواہش سے پوری نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی تو خانہ داری کی خواہش کو بھی
خانہ داری ہی پوری کرے تو کرے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی ضرورتوں کے درجے برابر نہیں۔
مثلاً ایک ضرورت تو تنفس یعنی سانس لینے کی ہے کہ بدوں اس کے آدمی دو یا تین منٹ بھی زندہ
نہیں رہ سکتا۔ اس سے اُتر کر کھانے پینے کی کہ خیر جبراً قہراً جیٹھ کے رمضان میں بھی روزے
رکھنے ہی پڑتے ہیں۔ اور ایک ضرورت ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر رہنے کی بھی ہے کہ
آدمی آدمی اکیلا تن تنہا جنگل بیابان میں رہنا چاہیئے تو نہیں رہ سکتا۔ ان ضرورتوں میں

بعض ناگزیر ہیں بعض سخت تر۔ اسی طرح خانہ داری کی ضرورت بھی ضرورت ہی گو تنفس کی طرح ناگزیر نہ ہو۔ یہ ضرورت عمر کے ایک خاص درجے پر پہنچکر پیدا ہوتی ہی مگر اس کے ضروری ہونے میں کوئی کلام نہیں کرسکتا۔ یوں تو کھانے پینے کی ضرورت بھی دودھ چھوٹنے کے بعد لاحق ہوتی ہی مگر پھر بھی کھانا پینا جیسا ضروری ہی سب کو معلوم ہی۔ خانہ داری کی ضرورت کو ہر زمانے میں ہر ملک ہر قوم ہر مذہب ہر ملت کے لوگ تسلیم کرتے آئے ہیں، وحشی سے وحشی قوموں میں بھی خانہ داری کا رواج ہے۔ اور چوں کہ آدمیوں کی نسل کا پھیلانا اور باقی رہنا موقوف ہی خانہ داری پر تو یہ ضرورت بڑی بکار آمد ضرورت ہی۔ ہندوؤں میں جوگی اور عیسایئوں میں راہب اس ضرورت یا اس ضرورت کی شورش کو مٹانا اور دبانا چاہتے ہیں تو اُن کو بھی کیسی مشکلات پیش آتی ہیں یہاں تک کہ انسانیت سے گزرجانا پڑتا ہی۔ اور چوں کہ یہ انتظام الٰہی کا مقابلہ کرتے ہیں اُن کی ضروری سزا ہی کہ زندگی اُن کے حق میں عذاب اور وبال ہو اس پر بھی بہت کم ہیں وہ لوگ جو بیچے طور سے اپنے ارادے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی مصلحت سے اسلام نے رہبانیت کی سخت ممانعت کی کیوں کہ رہبانیت نبھ نہیں سکتی اور اگر بہزار مصیبت نبھی بھی تو انسان کو از کار رفتہ کرکے۔ یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ کسی مسلمان بادشاہ نے رہبانیت کی حمایت نہیں کی لکھنؤ کے بادشاہوں کو تو ایسی ہی بونگی باتیں سوجھا کرتی تھیں نصیر الدین حیدر نے اچھوتیاں ایجاد کی تھیں تو سارا لکھنؤ اُن اچھوتیوں کے نام سے پناہ مانگتا تھا۔ لیکن اگرچہ بڑے فخر کی بات ہی کہ مسلمان بادشاہوں نے رہبانیت کی حمایت نہیں کی مگر اس سے کہیں بڑھ کر شرم اور افسوس کی بات یہ ہی کہ کل مسلمان رہبانیت کے طرف دار اور اُس کے حامی و مددگار ہیں۔ بیوہ کا دوسرا نکاح نہ کرنا کھلی ہوئی رہبانیت نہیں تو کیا ہی جب ہم خیال کرتے ہیں تو ہم کو سخت حیرت ہوتی ہی کہ دوسرے نکاح کی ضروریات انسانی ہونے میں کلام نہیں۔ قرآن میں اَنْکِحُوا الْاَیَامیٰ مِنْکُمْ (اپنی رانڈوں کے نکاح کردو) کا حکم صاف اور صریح موجود ہی جس میں کسی طرح کی تاویل کی گنجایش نہیں پیغمبر صاحب کی حدیث تو حدیث اُن کا اپنا فعل اپنا عمل درآمد کہ بی بی حضرت عائیشہؓ کے سوائے آپ کی جتنی بیبیاں تھیں کسی کے آپ دوسری جگہ تھے اور کسی کے دوسرے سے بھی زیادہ۔ تین صاحبزادیاں حضرت فاطمہ تو

جناب علی مرتضیٰ کے ساتھ بیاہی گئیں اور اُن ہی کے نکاح میں انتقال فرمایا۔ باقی رہیں دو صاحبزادیاں دونوں کے دو دو بار نکاح ہوئے اور تمام خاندان نبوی اور تمام اصحاب کے گھروں کا یہی حال تھا۔ ان لوگوں میں بیوہ کا دوسرا نکاح ایسا ہی ضرور اور لازمی اور معمولی تھا جیسا ہم لوگوں میں عورت کا پہلا نکاح۔ اور اب بھی عرب شام روم افریقہ فارس کہیں کے مسلمان بیوہ کے دوسرے نکاح میں کسی طرح کی عار نہیں سمجھتے۔ یہ خاص کر کچھ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کی شامت ہے کہ انھوں نے بیوہ کے دوسرے نکاح کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ یہ ان پر ہندوؤں میں رہنے کی پھٹکار ہے۔ احمقوں نے ہندوؤں کی رسم تو اختیار کر لی مگر یہ نہ سمجھے کہ اس رسم کے پیچھے دنیا اور دین اور ایمان سب کچھ کھو بیٹھے۔ بیوہ کا نکاح نہ کرنا ہے تو وہ بھی بڑا بھاری گناہ۔ ایک چھوڑ دو دو۔ کیونکہ بیوہ پر ظلم کرنے کا ایک گناہ حق العبد۔ اور خدا کی نافرمانی دوسرا گناہ حق اللہ۔ لیکن اس کو عیب سمجھ کر اور عار قرار دے کر نہ کرنا اور نہ کر دینا اور کرنے والے کو نظر حقارت سے دیکھنا اور نکاح ثانی کی نسل کو از روئے شرافت نسب ہیٹا سمجھنا ہمارے نزدیک تو شرک اور کفر اور ارتداد سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس سے خاندان نبوت اور بزرگان دین کی ناموس میں طعن لازم آتا ہے۔ کیا اچھا اسلام ہے۔ مونہ سے صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کرم اللہ وجہہ اور رحمتہ اللہ علیہ کہیں اور دل ہی دل میں معاذاللہ توبہ توبہ نقل کفر کفر نباشد۔ ان کو جورو بیٹی کی گچی گالیاں دیں۔ گالی پتھر تو نہیں کہ اس کے لگنے سے ہڈی ٹوٹ جائے یا گوشت پھٹ جاتا یا خون نکل آتا ہو کسی کی آبرو میں حرج کرنے کا نام گالی ہے اور وہی صورت یہاں بھی ہے۔ آزادی تو اس مضمون کو پڑھ کر لرز گئی اور لرزنے کی بات ہی تھی اس نے توبہ اور استغفار تو بہت کچھ کی مگر پھر معذرت کے طور پر کہنے لگی کہ بے شک مجھ سے اتنا قصور تو ہوا کہ میں نے دوسرے نکاح کا ارادہ نہیں کیا اور نہ اس طرف میرا ذہن منتقل ہوا لیکن نہ اس خیال سے کہ دوسرا نکاح بے غیرتی اور بے عزتی کی بات ہے۔ بلکہ میں نے تو بیٹھے رہنے کو شیوہ مروت اور شرط وفاداری سمجھا تھا سو یہ بھی میری غلط فہمی تھی۔ میں مروت اور وفاداری کو پیغمبر زادیوں سے بہتر کیا سمجھوں گی۔ میں تو کسی بات میں بھی اُن کی جوتیوں کی برابری نہیں کر سکتی۔

پندرھویں فصل کٹنی آزادی کو شہ دیتی ہے

آزادی کے خیالات یہاں تک پونہچے تھے کہ پھر آزمودہ اس سے ملنے کو آئی آزادی نے خود ہی اُس سے پوچھا کہو بی کیا خبر ہے۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ تم نے اپنی بیگم صاحب کے داماد کو راضی کر لیا ہوگا؟ آزمودہ اے بی داماد تو نہ ہائے ناحق گالی چڑھتی ہے وہ مردوا اس وقت تک تو راضی ہوا نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ راضی ہوگا بھی نہیں۔ آزادی۔ آخر سبب کیا؟ وہ کوئی بہُڑیا ہے کہ گھر آئی ہوئی دولت کو لات مارتا ہے۔ یا اپنے گھر کا ایسا بڑا امیر ہے کہ اس کو دولت کی پروا نہیں سو میری نظر میں ایسا امیر اب کوئی دلی میں تو ہے نہیں۔ یا تمھاری لڑکی میں کسی طرح کی کوئی قبح ہے اور نہیں مانتا تو بڑے چوتھے ہیں۔ نہ کسی مشاطہ کو اشارہ کر دو شام تک رشتوں کا ڈھیر لگا دے گی۔ پردیس کا معاملہ ہے جان نہیں پہچان نہیں اس سے لوگ ذرا ہچکچائیں گے لیکن کچھ بھی ہو دولت کے آگے کسی کو کچھ نہیں سوجھ پڑتا ہائے افسوس میں مرد نہ ہوئی نہیں تو آنکھ بند کر کے تمھارے ساتھ ہو لیتی۔ مگر بیگم صاحب کیا مجھے خاطر تلے لاتیں۔ آزمودہ۔ یہ بھی تم نے ایک ہی کہی کہ تم کو اور خاطر میں نہ لاتیں۔ تم کو اپنے حسن کی قدر معلوم نہیں۔ تمھاری صورت کے آدمی لاکھوں میں نہیں ہزاروں میں مشکل سے ایک دو ہوتے ہیں۔ میری ساری عمر ایسے ہی لوگوں میں بسر ہوئی ہے اور لکھنؤ میں میری نظر سے ایک وقت گزرا ہے کہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھو پس ایک گل لالہ پھولا ہوا ہے۔ یہ میں کچھ تمھارے مُونہ دیکھے کی بات نہیں کہتی حقیقت میں ماشاء اللہ تمھاری سی آن بان کم ہوتی ہے تم میں ایک بڑی عمدہ بات یہ ہے کہ بڑھاپے تک تمھاری یہی سج دھج بنی رہے گی۔ اگرچہ تمھارے اولاد نہیں ہوئی مگر تم نے ایسا کڑا صدمہ اُٹھایا ہے کہ کیسے سے کیسا ہی حسین ہوتا اس جھکولے میں اگر اس کے سارے بتیس دانت نکال دیتے لیکن چشم بد دور تمھارے کساؤ میں کہیں سے ذرا فرق نہیں آیا تم نے چمپئی رنگ ایسا پایا ہے کہ اس کو کبھی زوال ہی نہیں۔ آزادی اے ہے آگ لگے اس حسن کو۔ بلا سے کالی بھٹ ہوتی۔ لمبی بے ڈول ہوتی سوکھی لقات ہوتی یا موٹی بھیس۔ ہونٹی۔ بالشتی۔ کچھ بھی ہوتی مگر ہوتی سُہاگن۔ اب اس کم بخت صورت کو لے کر چاٹوں یا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکاؤں یا کیا کروں۔ آزمودہ۔ جب خدا کسی کو کسی طرح کی دولت

دے تو چاہیئے کہ اس کو خرچ کرے دوسروں کو راحت پونہچائے حسن بھی بڑی دولت ہی جس کے آج سیکڑوں طالب ہزاروں خواہاں تم ہو۔ تو لوگ اس طرح گریں جیسے شمع پر پروانے اور تم اس حسن کی بدولت لالوں کی لال بنی بیٹھی رہو۔ مگر ہاں اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ایک دھول میں ملانا چاہو تو اس کا علاج نہیں۔ سنو بُوا دُنیا میں سدا سدا کو رہنا اور دوبارہ جنم لیکر آنا نہیں۔ خدا ہی کوئی مصیبت ڈال دے جیسے کوئی روگ پیچھے لگ جائے تو مجبوری ہی ورنہ اپنا مذہب تو یہ ہی چار دن جینا چین کرنا۔ مزے اڑانا اور عیش کی تہر میں پینا۔ مرنا یوں بھی مرنا وون بھی۔ آزادی۔ توبہ کرو توبہ۔ یہ تمہارے کیسے خیالات ہیں مرکر خدا کو بھی موںہ دکھانا ہی یا نہیں۔ آزمودہ۔ اری بوا کس نے دیکھا ہی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اچھے اچھے مولویوں کو دیکھ لیا بس کہوں کسی کا پردہ کھلوانی ہو۔ ان دنوں ہمارے بھوپال میں مولویوں کی یہ کثرت ہو کہ ٹڈیوں کی طرح آسمان سے برستے اور چینوٹوں کی طرح زمین سے نکلے چلے آتے ہیں بس تقویٰ اور طہارت ہاتی کے دکھانے کے دانت ہیں اور اگر کوئی بڈھا ٹھڈا تو سوچ ہے کھا کے آخر عمر میں گر بہ مسکین بنا تو اُس کی سند نہیں۔ اس عمر میں تو سب ہی ناٹکہ خدا کو دھوکا دینے کے لیئے تہجد گزار ہو جاتی ہیں۔ آزادی۔ میں کہتی ہوں مولویوں کے فعلوں کو سند گردانو ہی مت۔ پیری کے ہوں تو اور جوانی کے ہوں تو اچھا بُرا کسی کے کرنے نہ کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ خدا رسول کے حکم سے۔ آزمودہ۔ دنیا کے مزے بھی تو خدا ہی نے بنائے ہیں۔ اور پھر جو سب کا حال وہ اپنا حال۔ اور خدا کو ایسا ہی ترسانا منظور تھا تو پیدا کرنا ہی کیا ضرور تھا۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ خدا اتنے سارے بندوں کو دوزخ میں ڈال کر آپ بیٹھا تماشا دیکھے۔ خدا کاہے کو ہوا نگوڑا ہلا کو ہوا۔ ہم تو ایسے خدا کی خدائی سے باز آئے۔ آزادی۔ خدا کے لیئے تم میرے آگے تو ایسے کفر کے کلمے مُونہ سے نکالو مت میں تو خیال کرتی تھی کہ مولویت کا اتنا زور شور ہی تو بھوپال میں بڑی دینداری ہوگی آزمودہ۔ میں نے تم سے کہا نہیں کہ بڑی دینداری تو نہوت کی ہی جس کے پلے ٹکا نہیں پیٹ کو روٹی نہیں۔ تن کو کپڑا نہیں۔ یا جو قبر میں پانوں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ وہ دیندار نہوں تو کیا ہوں۔ بھوپال کی کیا خصوصیت ہی۔ غریب کنگلے مفلس۔ نادار بڈھے بے کار ہر جگہ دیندار ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ہیں۔ اور جس کے پاس اپنی کائنات ہی

اُس کو تو دن عید اور رات شب برات ہی ؎

شب دلارام سے گزرتی ہی — صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہی
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہی

آزادی۔ تو کیا تمھاری یہ رائے ہی کہ میں بھی اسی طرح کی زندگی بسر کرنے لگوں؟ آزمودہ بے شک جب سے میں نے تمھارا نام سُنا تھا از خود تمھاری محبت میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اب جو تم کو آکر دیکھا تو تمھاری صورت مجکو اس قدر پیاری لگی۔ کہ اگر تم مرد ہوتیں تو جو چاہے کر ڈالتیں مگر میں تمھارا پیچھا نہ چھوڑتی۔ تم نے عورت اپنی عاشق نہ سُنی ہو گی تو میں بیٹھی ہوں دیکھ لو۔ آزادی۔ یہ تم کیسے اشارے کنائے کی سی باتیں کرتی ہو کہیں تم نے مجکو لکھنؤ یا بھوپال کی ایسی ویسی آبرو باختہ تو نہیں فرض کیا آزمودہ وہ جو کہتے ہیں عشق کے نام سے گدھی نے کھیت کھانا چھوڑ دیا تھا تم تو لگیں ابھی سے بگڑنے۔ بیوی بُو مشک کی مہک اور حُسن کی چمک سات پردوں میں بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ پردے میں بیٹھے ہوئے تم کو خبر نہیں ہوتی اور میں اسی ٹوہ میں پڑی پھرتی ہوں۔ ہزارہ میں جگہ مجکو حال معلوم ہی کہ تم پر زہر کھائے بیٹھے ہیں اور میری اس وقت کی بات یاد رکھنا کہ تم بہتیرا چاہو مگر لوگ تم کو بیٹھنے نہیں دینگے۔ آزادی۔ کسی کی کیا مجال ہی کوئی آنکھ بھر کر میری طرف دیکھے تو دیدے نکلوا لوں۔ بھلا ایک آدہ کا نام تو سنوں۔ آزمودہ۔ ایک تو خواجہ مشتاق ہی ہیں جن کو تم خوب اچھی طرح سے جانتی ہو۔ میرے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اول دن سے تم پر مرتے ہیں اور اسی غرض سے اُنہوں نے تمھارے باپ کے ساتھ ایسا گاڑھا دوستانہ کر رکھا تھا بلکہ تمھارے باپ تو زبان بھی دے چکے تھے مگر مولوی مستجاب کی تقدیر وہ تم کو اوپر سے اوپر اڑا لے گئے یہ بے چارہ مُونہہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے دل پر کچھ اس طرح کا صدمہ ہوا کہ مدتوں مُلک در مُلک اور جنگل در جنگل سڑی بنا پڑا پھرتا رہا۔ پھر ایسا بیمار ہوا کہ کوئی نہیں کہتا تھا کہ جاں بر ہو گا۔ تمھارے میاں کا مرنا سن کر از سرِ نو جی اُٹھا۔ یہ وہی شخص ہی جس کے لیئے میں بھوپال سے دلّی آئی۔ دریافت کیا تو یہ ساری حقیقت کُھلی۔ خود اس سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا تمھاری توقع میں جیتا ہی۔ آج اُس کو تمھاری طرف سے نا امیدی ہو تو جان کا دیدینا

اُس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں۔ اُس کو تو میں تمھارا عاشق صادق سمجھتی ہوں کیوں کہ اُس نے تمھاری دُھن میں بھوپال کی بات کو اچھی طرح کان لگا کر سنا تک نہیں۔ اور یوں تمھارے معمولی چاہنے والے اور بھی بہت ہیں اور صبح شام میں اُن کے پیام بھی تمھارے پاس آنے والے ہیں۔ تو اگر چاہو کہ ان سے بچی رہوں سو ہو نا نہیں۔ اور اس میں تعجب کی بھی کیا بات ہے۔ میوہ دار درخت ہوتا ہے تو اُس پر پتھر آتے ہی ہیں۔ جن دنوں تم کواری تھیں آخر نسبت نلطے کے پیغام آتے ہی ہوں گے۔ اور سبھی کے یہاں آیا کرتے ہیں لفظوں کا ہیر پھیر ہے ورنہ بات وہی ہے۔ آزادی۔ اچھا تو میں اس کو اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں۔ آزمودہ۔ مجھ سے کیا صلاح کروگی۔ میری تو وہی ایک صلاح ہے آج کی آج اور کل کی کل کہ تم اور مشتاق دونوں میرے ساتھ بھوپال چلو جس میں دونوں گھر بسیں سو تم ماننے والی نہیں۔ تم لوگوں میں یہ بہت ہی بُرا دستور ہے کہ میاں بی بی ایک دو مہرے کو سرپٹ کی طرح جھپٹ جاتے ہیں۔ مگر میں یقین کرتی ہوں کہ ہم لوگوں میں رہ کر تمھاری نہ پھنسی رہے گی اور نہ ایسے خیالات۔ میرا تو ارادہ تھا کہ آج سے رخصت ہو لوں کیوں کہ میں بھی اب جانے ہی والی ہوں لیکن تم کہتی ہو تو خیر دو چار دن اور سہی۔ آزمودہ کے ملنے سے پہلے آزادی کی اپنی رائے بھی یہی تھی کہ میں بیوگی کی حالت میں رہ نہیں سکتی اور عقل و مذہب کا فتویٰ بھی یہی ہے بس ایک اعتبار سے وہ گویا نکاحِ ثانی کا ارادہ کر چکی تھی اس کو اگر تامل تھا تو صرف اتنی ہی بات کا کہ گو حلال ہے مگر دوسرا نکاح کرنے سے لوگوں کی نظر میں کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔ یوں دنیا میں جو دولت مند ہے غریب کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ اولاد والا اولاد کو پڑھا لکھا ان پڑھ کو۔ خوب صورت بدشکل کو۔ مگر یہ کیا مصیبت ہے کہ ایک دامنی کے بچانے کو دوسرا نکاح کرو اور اسی صفت میں لوگوں کے نزدیک ہیٹے ٹھہرو۔ لوگ احمق ہی سہی بے دین ہی سہی مگر ان کو چھوڑ کر آدمی کہاں نکل جائے۔ وہی مثل ہے کہ دس نکٹوں میں ناک والا نکو۔ اور پھر ایک دن دونوں کی ہو تو انسان صبر بھی کرے یہ کلنگ کا ٹیکہ کیسا کہ ماں کالی اور اولاد پر کالی۔

سولھویں فصل۔ آزادی پر چاہنے والوں کا نرغہ

آزمودہ کے ساتھ جو باتیں تیسری ملاقات میں ہوئیں اُن سے آزادی کا وہ ارادہ اور بھی پکّا ہوگیا۔ ایسی تو کیا بات ہو کہ حسین ہو اور اتنی عمر تک اپنے حسن کو نہ جانے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آزادی نے اپنے حسن کی قدر و قیمت آزمودہ کے کہنے سے جانی جس دن سے رانڈ ہوئی نہیں بلکہ جس دن سے مولوی مستجاب بھوپال کو روانہ ہوئے کبھی آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا آج اس نے آئینہ سامنے رکھ کر اپنے بال وال درست کئے کپڑے بدلے اور سمجھی کہ میں بھی کچھ ہوں مگر وہ جو کہتے ہیں ہیں کے گلے پر چھری آج کا آئینہ آگے رکھ کر کنگھی کرنا اور کپڑے بدلنا غضب ہوگیا اور لوگوں نے جیسے جس کے جی میں آئی حاشیے چڑھائے کوئی صاحب دیوار بیچ ہمسائے میں رہتے تھے یا آرہے تھے لگے پکار پکار کر شعر اور غزلیں پڑھنے۔ کسی نے باہر دروازے پر دستک دی ماما پوچھنے گئی ایک لڑکا رقعہ دے چمپت ہوا۔ ماما نے کاغذ لا بیوی کے ہاتھ دیا بیوی نے پڑھا تو یہ غزل تھی۔ للمؤلف۔

آہ کیا جانیے کچھ تجھ میں اثر ہے کہ نہیں
میرا احوال سُنائی اُسے جا کر بارے
کون وقتوں کی مگر شام ہوئی ہے اللہ
اس قدر ظلم و ستم تم جو روا رکھتے ہو
ہم تو پڑھ لیتے ہیں مونہ تیری طرف کر کے نماز
جو ہری ہووے تو ہم پوچھیں دکھا کر دُر اشک
ہوتے ہیں جامع اقسام کمالات انساں
ہم تو اصلاح نہیں لیتے کسی سے لیکن
ہمہ وقت اُس کے ہی در پر جو پڑا ہے تو زار

اُس کو بھی میری محبت کی خبر ہے کہ نہیں
اُس کے کوچے میں صبا تیرا گذر ہے کہ نہیں
شب فرقت کبھی تجکو بھی سحر ہے کہ نہیں
اے بتو کچھ بھی خدا کا تمہیں ڈر ہے کہ نہیں
نہیں معلوم کہ کعبہ بھی ادھر ہے کہ نہیں
آب دار ایسا ترے پاس گُہر ہے کہ نہیں
تجھ میں بھی مرد خدا کوئی ہنر ہے کہ نہیں
دیکھ لیتے ہیں کہ ہاں طرز ظفر ہے کہ نہیں
ترے رہنے کا کوئی اپنا بھی گھر ہے کہ نہیں

باہر صحن میں چارپائی بچھا کر بیٹھی ہے گود میں کاغذ کی گولی آکر گری کھولا تو انشاء اللہ خان کا شعر تھا ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھو گی کام میرا
جب دھم سے آکہوں گا لو بی سلام میرا

ماما دہی کا دونا بازار سے لائی ہے تپوں پر کچھ لکھا ہے اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا مگر ہے کچھ

اس قسم کی بات - آٹا چھاننے میں بھوسی میں سے کاغذ کے پُرزے نکلتے ہیں - ڈاک میں گم نام خط چلے آتے ہیں - بات بات سے آزمودہ کے کہنے کی تصدیق ہوتی ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو نہیں بہت سے آدمی اس فکر میں ہیں - آزادی اپنی یہ حالت دیکھ کر چاہتی تھی کہ خدا یاد آئے مگر اُس کو یاد آیا فرعون کہ حضرت موسیٰ کی بددعا سے جوؤں اور مینڈکوں کے عذاب نازل ہوتے تھے کھانے میں مینڈکیاں اور بالوں میں جوئیں یہی حال آزادی کا ہو گیا کہ جہاں کسی کا ذہن منتقل نہ ہو وہاں بھی پرچہ

آزادی کے پاس تھوڑے ہی دنوں میں اتنے خطوط اور رقعے اور پرچے اور پُرزے اور غزلیں اور شعر جمع ہو گئے کہ اگر سب کو یک جا جمع کر دیا جائے تو اچھی خاصی دس بارہ جز کی کتاب اور کتاب بھی ایسی مقبول کہ ہاتھوں ہاتھ بکے اور وارنہ آنے پائے کیوں کہ لوگوں کے مذاق معلوم ہیں دو ہی قسم کی کتابیں چلتی ہیں اول درجہ بوستاں کا بابِ پنجم عشق و جوانی - اُس سے اُتر کر مذہبی رگڑے جھگڑے آزادی نے تمام کاغذات مکتوب کے طور پر پلیپٹ کر رکھ چھوڑے تو ٹپرا سارا مٹھا تھا - مرتے وقت جب اس نے اپنی مشہور وصیت کی جس کا ذکر آیندہ آئے گا تو وہ مٹھا ہمارے حوالے کیا اور وہ اس وقت تک محفوظ ہے - اُن کاغذات میں سے ایک خط ہم کو بہت پسند آیا جس کی نقل اس جگہ درج کی جاتی ہے اُس میں رسمی القاب و آداب اشتیاق وغیرہ کچھ نہ تھا لکھنے والا ایک دم سے اپنا مطلب لکھ چلا کہ -

(**خط**) اگر میں تم کو معمولی طور کی عورت جانتا تو ہرگز اس تحریر پر جرأت نہ کرتا کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ عام عورتوں کے خیالات اکثر باتوں میں عموماً اور تعلق زناشوئی کے بارے میں خصوصاً تمام تر لغو - سرتاپا بیہودہ اور بالکل ہنسی کے قابل ہیں میں عورتوں کی شرم و حیا کو نہایت ادب اور بڑی عزت اور حُرمت کی نگاہ سے دیکھتا اور اس میں دست اندازی کرنے کو پرلے درجے کی کمینگی سمجھتا ہوں - حیا عورتوں کے حسن کی زینت ہے - خوب صورتی کی رونق ناموس کی حافظ - پاک دامنی کی سپر - وفاداری کی ضامن - شرافت کا تمغا - بھلمنساہت کا شعار - کھوٹے کھرے کی کسوٹی - بھلے بُرے کی شناخت - خانہ داری کا لطف - تاہل کا مزہ اوروں کو جزو ایمان عورتوں کو شرطِ انسانیت عورت جس میں حیا نہیں آئینہ جس میں

صفا نہیں۔ موتی ہے جس میں ضیا نہیں۔ پھول ہے جس میں مہک نہیں۔ گوٹا ہے جس میں چمک نہیں لیکن عورتوں نے ناحق کی سختی میں آکر حیا کو افراط کے ایسے درجے تک پہونچا دیا ہے کہ اب وہ عیب سے بدتر ہے۔ جیسے تل کہ وہ ایک طرح کی خوبصورتی ہے مگر ایک علے معین تک جب تل اُس حد سے متجاوز ہوا داغ بدنما سمجھا جائے گا نہ خال دل رُبا۔ ع
جو خال حد سے زیادہ ہوا وہ مسا ہوا * افراطِ حیا نے عورتوں کو نہ صرف تمتعات جائز سے محروم اور بے نصیب رکھا۔ نہ فقط اُن کو کسبِ کمالات سے جن کے حاصل کرنے کی استعداد اور قابلیت خداداد اُن میں موجود ہے روکا بلکہ اُن کو مردوں کے ہاتھوں میں اس قدر عاجز و مجبور کر دیا کہ گویا عورتیں مردوں کے استعمال کی چیزیں ہیں اور اُن کی خدمت گزار نہ خانہ داری کی شریک یا معاملات کی صلاح کار۔ شادی بیاہ کے بارے میں عورتوں کی درماندگی اس درجے کو پہونچی کہ اُن میں اور افریقہ کے لونڈی غلاموں میں کچھ فرق نہیں۔ مالک نے جس کے ہاتھ چاہا لونڈی غلاموں کو بیچ ڈالا اسی طرح ولی بزرگ سرپرست نے جس کے ساتھ اُس کے جی میں آیا عورت کو بیاہ دیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور بھی ظلم اور بے انصافی کی بات خیال میں آسکتی ہے کہ عورت جس کو ایک مرد کے ساتھ ساری عمر گزارنی ہے نہ کچھ کہہ سکتی اور نہ کوئی رائے ظاہر کر سکتی پس ہمارے یہاں کے شادی بیاہ اندھے کی لاٹھی ہیں لگی تو انعام نہیں صلہ نہیں اور نہ لگی تو شکایت نہیں گلہ نہیں۔ اور سب سے زیادہ افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ عورتوں کو اپنی خستگی حالت کا شعور نہیں احساس نہیں۔ یعنی ان کی بہتری اور صلاح کی امید نہیں۔ آس نہیں شعور ہو تو فریاد کریں غل مچائیں۔ احساس ہو تو اپنے حق کے لیئے لڑیں جھگڑیں پاؤں پھیلائیں۔ میں تم کو اُس وقت سے جانتا ہوں کہ جب تم کو ان باتوں کے سمجھنے کی تمیز نہ تھی۔ مگر کھیل کود کی باتوں سے بھی تمھاری عقل و ذہانت ظاہر ہوتی تھی۔ تم کو کیا خیال ہوگا لیکن مجھ کو بیسیوں مثالیں یاد ہیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ خدا نے تم کو فہم سلیم اور رائے مستقیم عطا فرمائی ہے۔ میں نے تم کو ناواجب بات پر ضد کرتے یا ناحق کی پچ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اس سے بڑھ کر خوبی یہ تھی کہ آخر تھیں تو بچہ اگر تم سے کوئی قصور سرزد ہوا تم بے تامل اُس کو تسلیم کر لیتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا

تمھاری ہمت قوی اور طبیعت مضبوط اور آزاد اور بے پروا ہے تم نے ایک بار اپنے والد کا ایک بڑا سرکاری کاغذ بگاڑا - تم تو گئیں گھر میں اور تمھارے پیچھے اُس کی ڈھنڈیا پڑی۔ تمھارے والد نوکروں پر نہایت درجے خفا ہوئے اور قریب تھا کہ اُن میں سے بعض نکالے اور بعض پر جرمانے ڈالے جائیں۔ اتنے میں تم باہر آئیں اور تم نے ہنستے کے ساتھ وہ کاغذ قالین کے تلے سے نکال خواجہ صاحب کے ہاتھ دیا - تم نے سوائے اس کے کہ اُس کو پھاڑا نہیں کوئی طریقہ نہ تھا جس میں اُس کو بگاڑا نہ ہو اس کے بعد جو گفتگو تم میں اور خواجہ صاحب میں ہوئی اُس وقت تک لفظ بلفظ مجکو یاد ہے اور مرتے دم تک لفظ بلفظ یاد رہے گی - خواجہ صاحب آزادی - یہ تم نے کیا کیا - تم - یہ تو کچھ پوچھنے کی بات نہیں جو کچھ کیا آپ کے سامنے موجود ہے۔ خواجہ صاحب تم نہیں جانتیں کہ میری میز پر سرکاری کاغذ رکھے رہتے ہیں - تم - سرکاری کی تو مجکو شناخت نہیں - ہاں یہ جانتی ہوں کہ کاغذ رکھے رہتے ہیں - خواجہ صاحب پھر تم بے پوچھے کیوں میری میز پاس گئیں - تم - اس لئے کہ کبھی آپ نے مجکو منع نہیں کیا - خواجہ صاحب میز پر تمھارا کام ہی کیا تھا - تم - کام جو تھا لا کر آپ کے ہاتھ دیا خواجہ صاحب - اب تم بتاؤ کہ میں اس کو کیا کروں - تم - اگر آپ دوبارہ خفا نہ ہوں تو پھر مجھ ہی کو دیجیئے کہ چند لکیریں اس پہ اور کھینچ لوں یہ کاغذ چکنا بہت ہے - اور اس پر قلم خوب ڈورتا ہے یہ جملہ سُن کر سب ہنسنے لگے اور خواجہ صاحب بھی ہنس پڑے - خواجہ صاحب - افسوس آزادی تم نہیں جانتیں کہ تم نے اس وقت میرا کتنا بھاری نقصان کیا ہے - تم - بے شک میں نہیں جانتی اور نہیں جانتی تو یہ خوشی کی بات ہے نہ افسوس کی - جان بوجھ کر نقصان کرتی تو افسوس کی بات تھی - خواجہ صاحب - اب صاحب پوچھیں گے تو میں کیا کہوں گا - تم - آپ میرا نام لے دیجیئے گا خواجہ صاحب - تم کو صاحب سے ڈر نہیں لگتا - تم - حاکم کو تو لوگ ماباپ کہتے ہیں - ماباپ سے کوئی ڈرتا ہے - خواجہ صاحب بھئی ہم تو ڈرتے ہیں - تم - تو آپ اُس کا کچھ قصور کرتے ہوں گے - خواجہ صاحب بس یہی قصور جیسے آج یہ کاغذ بگڑ گیا - تم - اس کا بگڑا ہی کیا ہے چھپا ہوا کاغذ ہے میں نے ہندوستانی قلم دوات سے خالی جگہ میں کچھ لکیریں کاڑھ دی ہیں لائیے میں اس پر پانی بہادوں سیاہی دُھل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا - اور کاغذ

پہلے سے بھی زیادہ اُجلا ہو گیا۔ تب خواجہ صاحب نے پوچھا کہ بھلا آزادی تم نے کاغذ کو قالین کے
تلے چھپایا کیوں تھا؟ تم چھپایا نہیں۔ مٹی سے خشک کرنے کے لیئے قالین کا پلہ اُٹھا پلے
کے تلے رکھ اوپر سے تھپک دیا تھا اتنے میں خدا جانے کس نے آواز دی میں کاغذ وہیں
چھوڑ کر گھر میں چلی گئی۔ اس طرح کی تمھاری بہت سی حکایتیں مجکو معلوم ہیں اور تمھاری ان
ہی باتوں نے مجکو گرویدہ کیا ہی۔ آج سے نہیں بلکہ تمھارے بچپن سے لوگ حسن و صورت
پر فریفتہ ہوتے ہیں میں بھی ہوں مگر میری فریفتگی شروع ہوئی ہی معنے سے صورت
تغیر پذیر ہوتی ہی اور معنی پتھر کی لکیر۔ ایسا لوگوں کی محبت بے ثبات ہی اور میری
میری جان کے ساتھ میں نے اسی غرض سے خواجہ صاحب کے ساتھ اس قدر ربط بڑھایا تھا
کہ جو لوگ بخوبی واقف نہ تھے مجکو اُن کا فرزند سمجھتے تھے اور میں اُن کی فرزندی کا آرزومند تھا
بھی۔ بلکہ میں آج تم سے کہتا ہوں کہ خواجہ صاحب ایک طور پر مجکو زبان دے چکے تھے۔ لیکن
تم کو اپنے والدین کی رائے کا اختلاف بخوبی معلوم ہی۔ تمھاری والدہ نے صرف خواجہ صاحب
کی ضد سے کیا۔ جو اُن کو مناسب معلوم ہوا۔ جو اثر محرومی اور ناکامی نے مجھ پر کیا اس کے گواہ ہیں
جنگل اور بیابان جن میں مہینوں میں بے خود و سرگرداں پڑا پھرا ہوں۔ اس کے شاہد ہیں
شہر کے ڈاکٹر اور طبیب جن احمقوں نے مجکو معمولی طور کا بیمار سمجھ کر اپنا وقت اور میرے تیمار
داروں کا روپیہ بہت کچھ ضایع کیا۔ خلاصہ یہ ہی کہ اتنے دن مجھ پر سکرات الموت سے بھی
زیادہ سختی کے گزرے اور میں حیران تھا کہ الٰہی کس درجے کی گراں جانی ہی کہ اس قدر ایذا
ہی اور جان نہیں نکلتی۔ بارے خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک عرصے
کے بعد معلوم ہوا کہ میرے نہ مرنے کی یہ وجہ تھی۔ میں اس مرتبے کی کامیابی کی جس کی مجکو
کامل توقع اور پوری امید ہی بڑی قدر و وقعت کرتا ہوں۔ وہ دوسروں کی اور دوسروں کی
بھی نہیں بلکہ صرف تمھاری والدہ کی تجویز تھی اور یہ تمھارا اپنا انتخاب ہوگا۔ وہ اوروں کی رائے
تھی یہ تمھارا اپنا میلان۔ وہ ڈفالیوں کا گانا تھا اور یہ کلاونت کا ترانہ۔ وہ کودک نادان کے
تکّے چلانا تھا اور یہ قادر انداز کا نشانہ۔ وہ ناواقف کا ٹاک ٹوئیے مارنا تھا اور یہ منزل
شناس کا سفر وسیلۃ الظفر۔ ایک اعتبار سے تو تم کو پہلے سے زیادہ آسانی ہی کہ اس مرتبہ

ویسی ہندی نہیں اور تم جتنا دخل چاہو دے سکتی ہو لیکن یہ ایک طرح کی مکروہ خودغرضی ہوگی کہ میں اُن مشکلات کو چھپاؤں یا گھٹاؤں جو تم کو پیش آنے والی ہیں۔ میں اس بات سے بالکل مطمئن ہوں کہ تم نکاحِ ثانی کی ضرورت کو تسلیم کر چکی ہو اور تم نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری حالت دوسرے نکاح کی متقاضی ہے لیکن رائے سے ارادے میں اور ارادے سے عمل میں بڑا فاصلہ ہے۔ آدمی پر چند در چند طرح کے دباؤ ہیں۔ وہ محکوم ہے مذہب کا حاکمِ وقت کا۔ بزرگانِ خاندان کا۔ صحبت کا۔ تعلیم و تربیت کا۔ اور شاید سب سے بڑھ کر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ملکی رسم و رواج کا بڑے شکر کا مقام ہے کہ ان موانع میں سے تم کو ایک ہی مانع درپیش ہے یعنی رسم و رواج۔ وہ بھی اُس سختی کے ساتھ نہیں جیسا قصباتیوں میں خدا مولویوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے نکاحِ بیوہ کے رواج دینے میں کوشش کی اور شہر میں اگلے وقتوں کا سا یا دیہات قصبات کا سا گریز باقی نہیں لیکن ہر چند نکاحِ ثانی دشنام نہیں رہا مگر افسوس ہنوز رواجِ عام نہیں۔ اس خیال سے کہ تمہاری ننھیال کے لوگ اکثر مولوی ہیں مجھ کو امید تھی کہ شاید بیوہ کے دوسرے نکاح کے شواہد بہم پہنچانے میں دشواری نہ ہو مگر افسوس ہے کہ جہاں تک میں نے تحقیق کیا تمہاری ددھیال اور ننھیال دونوں اس فخر سے محروم ہیں اور اسی سبب سے میں ڈرتا ہوں کہ اگر کوئی تم کو بہکائے گا نہیں تو اکسائے گا بھی نہیں۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ معاملہ ہے نازک اور ایسے ہی معاملات میں آدمی دوسروں کی صلاح کا سہارا ڈھونڈا کرتا ہے تمہاری صلاح کار اگر ہو سکتی ہیں تو تمہاری ہم جنس عورتیں جن میں صلاح کار ہونے کی صلاحیت نہیں پس تم کو جو کچھ کرنا ہے اپنی ہی اکیلی رائے سے کرنا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ روداد پیچیدہ نہیں۔ مذہب اور عقل اور تقاضائے حالت۔ اتنی باتیں ایک طرف ہیں اور اُن کے مقابلے میں اگر ہے تو وہی ایک لغو اور بے اصل سا خیال کہ رواجِ عام نہیں۔ اگرچہ بیوگی کی تلخیاں تم نے تمام و کمال نہیں چکھیں لیکن جس قدر چکھیں اُن سے اندازہ کر سکتی ہو کہ بیوگی کیسی سخت مصیبت ہے اور اس مصیبت میں کتنی خدا کی بندیاں مبتلا ہیں اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی دوسری کوئی تدبیر نہیں پس تم نکاح کر کے نہ صرف اپنی مصیبت دفع کرو گی بلکہ سینکڑوں ہزاروں بیواؤں کی مصیبتیں جو فقط اتنے اشارے کی منتظر ہیں کہ کوئی تم جیسی

خدا ترس آگے بڑھے اور یہ اُس کے پیچھے ہولیں۔ تم نے ضرور کتابوں میں پڑھا اور وعظوں میں سنا ہوگا کہ جو شخص مری ہوئی سنت کو جلائے اُس کو اپنے عمل کے سوائے روز قیامت تک اُن سب کے عملوں کا ثواب ہوگا۔ جو اُس کی دیکھا دیکھی اس سنت پر چلیں پس یہ موقع ہی کہ تم عقل و ہمت سے کام لو اور اس ثوابِ عظیم کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ کون جانے کہ یہ اجر تمھاری تقدیر میں بدا اور اسی غرض سے خدا نے تم کو بیوہ کیا ہو۔ آخر میں تم کو میں اپنی طرف بھی متوجہ کرتا ہوں۔ اگر تم نے دوسرا نکاح نہ کیا یا کیا اور کسی دوسرے کے ساتھ کیا تو میں مرکر نہ صرف تم کو بلکہ دنیا جہان کو دکھاؤں گا کہ میری طلب ادّعائی اور ریائی تھی یا حقیقی اور واقعی۔ میں اس میں اپنے نام کا لفافہ ملفوف کرتا ہوں اور میں نے ڈاک کے ہرکارے سے اس کا پکا بند و بست کرلیا ہو کہ اس پتے کے خطوط میرے سوائے کسی غیر کے ہاتھ نہ پڑیں اس سے اطمینان رکھنا کہ تم اگر مجھکو لکھنا چاہو گی تو ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کو اس کا علم ہو اور میں اپنے اس عہد کے لیئے خدا کو کفیل گردانتا ہوں۔

آزادی نے یہ سب سامان دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ جو دن آتا ہی۔ ہوگی کی نئی مصیبت اپنے ساتھ لاتا ہی۔ جن کے مرد پاس ہیں اُن کا تو بھلا کیا مذکور ہی جن کے مرد پردیس میں ہوتے ہیں کیا سر نہیں دھوتیں۔ کپڑے نہیں بدلتیں۔ پھول چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ مہندی نہیں لگاتیں۔ بناؤ سنگار نہیں کرتیں۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میں نے ذرا کی ذرا آئینے میں مونہ کیا دیکھا کہ لگی چاروں طرف سے بھرمار ہونے۔ ان زبردستی کی بدگمانیوں کی روک تھام مجھ سے کیا ہوسکے گی۔ مگر ہاں مونہ کو کیچڑ ملوں ہندنی رانڈوں کی طرح سر منڈاؤں سو یہ تو مجھ نہ ہوا اور نہ آیندہ ہوگا۔ لوگ ایک بدگمانی نہیں لاکھ بدگمانی کیا کریں بلا سے۔ مردوں نے یہ کیا آفت برپا کر رکھی ہی۔ ناحق بیٹھے بٹھائے کسی کو رسوا کرنا کچھ اچھی بات ہی۔ شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ بیاہ بھی ہوتے ہیں۔ نکاح بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ کہیں سننے میں نہیں آیا۔ اور کسی کی پناہ پکڑے بغیر یہ فضیحتا بند ہوتا ہوا نظر نہیں آتا اگر میں واقع میں خوب صورت ہوں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں تو خوب صورتی کچھ رنڈاپے سے نہیں آئی مگر لوگ جانتے تھے کہ ایک نکاح میں ہی اس سے کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ اب دیکھا کہ کوئی اس کا سرپرست نہیں لگے

عاشقی کا دم بھرنے۔ تو اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں۔ قصور اگر ہی تو میرا ہی آج میں کسی کی ہو رہوں عاشقی اور معشوقی سب کا خاتمہ ہی لیکن اس جلدی سے کیوں کر ہو رہوں موں سے کہنا آسان ہی اور ہو رہنا مشکل۔ آپ رو گئی ہوئی پھر نہیں آتی وہ پہلی دفعہ کا تو معاملہ تھا اور۔ کہیں پرائے بس میں تھی اور اب دوسری طرح کا موقع ہی۔ برا کہنے والے دس اور صلاح بتانے والا ایک اپنا دم اور بس۔ آدمی ہی تو ہی سمجھا کچھ اور نکلا کچھ تو وہ جو کہتے ہیں نقصان مایہ شماتت ہمسایہ۔ لوگ مارے طعنوں کے میرا جینا بھی دشوار کر دیں گے۔ کروں گی بھی تو اچھی طرح ٹھوک بجا کر کہ کل کو کسی طرح کی کوئی بات نہ دینی آئے۔ یہاں میری عقل رہی سہی اور بھی خبط ہو جاتی ہی کہ کیا اور پھر یہی اتفاق پیش آیا تو وہی کہاوت ہوگی نہ چکھا نہ کھایا ناحق اپنا دم دہر آیا۔ غرض کیا معلوم کہ ہو بھی یا نہ بھی ہو۔ اور ہوا بھی تو کیا مونہ کا نوالا ہی کہ جھٹ سے نگل لیا۔ اور لوگ ہیں کہ مجکو دم نہیں لینے دیتے الٰہی کس تو آئی میں جان ہی۔ اور خیر چھٹی چپاتی تک تو مضائقہ نہ تھا مگر دیوار پھاندنے کی دھمکی نے جو رات کی نیند حرام کر رکھی ہی۔ ایک نامراد کالی سی بلّی ہی وہ کبھی کبھار دیوار کود کر آتی ہی تو میرا کلیجہ گھڑیوں اچھلا کرتا ہی۔ اگر خدا نخواستہ رات کے وقت کوئی اوپری مردوا کود آیا تو میں تو یقیناً سہم کر مر رہوں گی لیکن انگریزی عملداری میں ایسا کیا اندھیر ہی۔ دھمکی نہیں شاعرانہ ڈھکوسلا ہوگا۔ پھر بھی دو چار دن کے لیئے میں کہیں کو ٹل جاؤں تو بہتر ہی۔ ماما کہار۔ وں کے اڈّے پر ڈولی کو کہہ آؤ۔ میں ذرا اپنے میکے ہو آؤں تم لوگ ہوشیاری سے رہنا خیر و عافیت کی خبر رکھنا۔ ایک آدمی بچھونے لواکر آگے چلو۔ ڈولی کے ساتھ ساتھ دوڑنا کیا ضرور ہی۔

سترہویں فصل آزادی میکے جاتی تھی کٹنی نے سکّی ڈولی اپنے گھر اتروالی

آزادی بیٹھتے تو ڈولی میں بیٹھ لی مگر گلی سے باہر ہوتے ہوتے اس کو اشتباہ سا ہونے لگا کہ ڈولی کچھ نئی سی معلوم ہوتی ہی میں تو کبھی اس میں سوار نہیں ہوئی اور کہار تو یقیناً دوسرے ہیں نہ وہ رفتار نہ ویسی ہونکار۔ تھوڑی دیر بعد اس کو ڈولی کا رخ بھی دوسری طرف کو پھرا ہوا سا معلوم ہوا کیوں کہ کثرت سے میکے آنے جانے کا اتفاق ہوتا تھا ہر ایک بات

کی اس کو اٹکل تھی۔ سرِ راہ کہاروں سے بات نہیں کر سکتی۔ اپنا آدمی کوئی ساتھ نہیں۔ اور اب تو چلتے چلتے دیر بھی زیادہ ہوتی چلی۔ سمجھی کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ رستے میں ڈولی میں سے کود پڑوں تو بے پردگی ہوتی ہے۔ کہاروں سے پوچھوں تو ٹھٹ کے ٹھٹ آدمی بازار میں چلے جا رہے ہیں سب میری آواز سنیں گے اور ہو ان میں کوئی جان پہچان بڑی بدنامی کی بات ہے مگر دن دہاڑے کوئی کیا کر سکتا ہے آخر کہیں تو کہار ٹھیریں گے ٹھکانے پر پہنچ کر جیسا ہوگا دیکھا جائیگا۔ یہ معلوم ہے کہ شہر سے باہر نہیں ہوئے اور ہے کوئی آباد جگہ لیکن خدانخواستہ اگر یہ کہار توت کسی بدمعاش کے ہیں تو مشکل معاملہ ہے۔ شہر کے بدمعاش تو اس بلا کے ہیکڑ ہیں کہ میرے اکیلے دم کی تو کیا اصل ہے کمسریٹ کا ہاتھی کھول کر لے گئے انگریز ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلاک ہو گئے آخر تھک کر بیٹھ گئے کوتوالی کا من سوا من کا گھنٹہ دوپہرے دوپہر میں سے اڑا لے گئے آج تک تو سراغ لگا نہیں۔ پارسال کا ذکر ہے کہ لاٹ صاحب جامع مسجد دیکھنے گئے بگھی میں دو صندوقچے چھوڑ گئے لوٹ کر آئے دونوں غائب لیکن جو اہل بدمعاش ہیں ان میں یہ بڑی عمدگی ہے کہ کسی کی ناموس میں خلل نہیں ڈالتے۔ امانت میں خیانت نہیں کرتے کل کے واسطے کچھ بچا کر نہیں رکھتے۔ ان باتوں کا بدمعاشوں میں بڑا پکا عہد ہوتا ہے۔ اتنے میں تو کہاروں نے ڈولی کندھے سے اُتار کر نیچے رکھدی۔ آزادی نے پردے کی دراڑ سے دیکھا تو ایک چھوٹے سے مکان کا کوئی پانچ چھ چارپائی کا صحن ہے جس میں ڈولی رکھی ہے۔ ایک طرف کو کاٹ کا اکہرا دالان ہے جس میں شاید آج ہی فرش بچھا ہے۔ دالان کی بغل میں کوٹھڑی ہے جس کے کواڑ بھڑے ہوئے ہیں باہر تو کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا اندر کوٹھڑی میں کوئی چھپا بیٹھا ہو تو خبر نہیں مکان کی صورت حال کہے دیتی ہے کہ اس میں کوئی رہتا سہتا نہیں خدا جانے کس ضرورت سے جھاڑو دلوا کر دری چاندنی بچھوا دی ہے۔ اب تو آزادی کو یقین ہو گیا کہ کسی نے کہاروں سے مل کر میری ڈولی اس مکان میں اُتروالی ہے۔ چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگ چلوں سر پر ڈالنے کو برقعہ یا چادر نہیں۔ علاوہ بریں اس جگہ کا نام و نشان معلوم نہیں۔ خدا جانے محلے میں کون لوگ بستے ہیں بارے اس کو اس وقت اور تو کچھ سوجھ نہ پڑا ڈولی میں سے نکل چھپا چھپ اندر سے ڈیوڑھی کی اور باہر سے کوٹھری کی زنجیریں چڑھا دیں کہ ایسا نہ ہو کوئی باہر سے اندر گھس آئے یا کوٹھڑی

میں کوئی چھپ بیٹھا ہو اور کنڈی کھلی پاکر باہر نکل پڑے۔ پھر کن سوئیاں لینے کی غرض سے ڈیوڑھی میں کواڑوں سے لگ کر جا کھڑی ہوئی۔ دو چار آدمی آتے جاتے دکھائی بھی دیئے مگر ہمت نہ پڑی کہ بات کرے۔ بارے تنہا ایک حلال خوری گزرتی ہوئی نظر آئی اس نے آواز دی قریب آئی تو کواڑ کھول کر اُس کو اندر لے لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ آزادی نے پوچھا اری کمبخت سبھاگی تو کہاں؟ سبھاگی۔ میری بیوی جی کو اللہ رسول کی امان۔ الٰہی دوست شاد دشمن پامال۔ بیوی جی مجکو تو یہاں پہنچی گلی اپنی سسرال آئے دو مہینے ہوئے۔ میری ماں تو اچھی ہو۔ روز جاؤں جاؤں کرتی ہوں کام سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ تمھاری جوتیوں کے صدقہ سے محلے بہت ہیں۔ جمان تو جمان صفائی والے چین نہیں لینے دیتے اور سب سے بڑھ کر یہ پٹ کہ ذرا ذرا بات کی خبر سرکاری تھانے میں کرنی پڑتی ہے۔ بیوی جی خدا تم کو بنائے رکھے یہ جگہ تمھارے لائق نہیں۔ آزادی۔ کیوں کچھ حال تو بیان کر۔ سبھاگی۔ چھلاوا چھلاوا ایک کٹنی ہے بہت بدنام ہے یہ مکان اُسی نے لے رکھا ہے بند پڑا رہتا ہے آج ہی کھلا بھی ہے تو یہ کٹنی اس کو خدا کی مار تم تک کیسے جا پہونچی؟ آزادی نے آزمودہ کا آنا۔ خواجہ مشتاق کا پیام لانا لوگوں کا غل مچانا میکے کے ارادے سے چلنا۔ اور دھوکے سے یہاں آنکلنا۔ کوٹھری اور ڈیوڑھی کی کنڈیاں بند کرنا ساری حقیقت بیان کی جس کو سُن کر سبھاگی بولی۔ بے شک یہ سب اُسی کٹنی کا کام ہے اور بڑی چلتی ہوئی ہے۔ میں اُس کو خوب جانتی ہوں اور جہاں جہاں اُس نے چھاپے مارے ہیں مجکو سب معلوم ہیں۔ اور بیوی جی بات کہوں صاف۔ میں نے اُس سے بہت کچھ کھٹا کمایا بھی ہے اور اگر وہ ہم لوگوں کو ملائے نہ رکھے تو اُس کا کام ایک دن بھی نہ چلے لیکن ظالم نے تمھارے ساتھ دغا کی تو بہت ہی بُرا کیا۔ میں ذرا بھی اشارہ پاتی تو وہیں اُس کو روک دیتی۔ اور تم کو ایسا ہی منظور ہوگا تو اس کے ہزار رستے ہیں۔ ہے چھلاوا بھی بڑی بلی اُس نے سب تھانے والوں کے مہینے باندھ رکھے ہیں مگر یہ جو اب تھانہ دار ہے بڑا روکھا آدمی ہے کسی سے کچھ لیتا لوتا نہیں مدتوں سے چھلاوا کی تاک میں ہے ابھی تک تو اُس کے قابو میں آئی نہیں مگر وہ جو کہتے ہیں سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا خدا جانے آج اُس نے یہ کیا غضب کیا تھانہ دار کو ذرا بھی معلوم ہو جائے تو چھلاوا کو تو وہ بخشنے والا نہیں

کاٹھ میں ٹھوک دے۔ جرمانہ ڈال دے۔ کالا مُونہ کرکے کوچے کوچے گلی گلی منادی پھروا دے
جو کرے سو تھوڑا۔ اِدھر تو آزادی اور سبھاگی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر کوٹھری کے
اندر سے کوئی شخص کواڑوں کی چُول اُتارنے کی فکر میں تھا۔ باتوں کے بیچ بیچ میں کواڑوں
کی کھڑکھڑاہٹ کی وجہ سے آزادی اور سبھاگی دونوں نے کئی بار کوٹھری کی طرف کو دیکھا تو تھا
مگر دونوں کا دھیان باتوں میں تھا یا شاید اس خیال سے کہ کوئی بلّی اندر بند ہو گئی ہو گی دیکھ
دیکھ کر چُپ ہو گئیں اور اب جو بات ختم ہونے پر آئی تو دیکھا کہ بلّی کے بند ہونے کی سی کھڑکھڑاہٹ
نہیں ہے کوئی شخص اندر سے دستک دے رہا ہے۔ آخر سبھاگی بولی بیوی جی سارا مدعا اسی
کوٹھڑی میں ہے تو تم نے بڑی ہی ہوشیاری کی کہ آتے ہی آگے سے کوٹھڑی کی کنڈی
لگا دی نہیں تو لے ڈھب آ کھنسی تھیں۔ آزادی سبھاگی میں تجھ سے کیا کہوں مکان کی
شکل دیکھتے ہی میرے تو سارے بدن میں تھرتھری سی پڑ گئی تھی۔ ایک تو جی میں آیا کہ چلّا کر
بھاگ کھڑی ہوں۔ پھر سوچی کہ اوپری محلہ میرے پاس چادر نہ برقع اور سب سے بڑھ کر یہ
خوف کہ غل مچے گا لوگوں کو خبر ہو گی۔ آخر اور تو کچھ نہ کر سکے "بن پڑا خدا نے سُجھوائی عقل دی کہ
اندر باہر کی کُنڈیاں بند کر دیں اور بے شک یہ تو سچ کہتی ہے کہ سارا فساد اسی کوٹھڑی میں ہے
پھر اب تیری کیا صلاح ہے سبھاگی۔ اگر تم کہو تو میں ابھی تھانے دار کو جا کر بلا لائی ہوں
بس ہمیشہ کو محلے کی گند کٹ جائے گی۔ اُس کو تو چھلاوے کے نام کی چڑ ہے کئی بار مجھ سے کہہ
چکا ہے کہ تو ضرور چھلاوے سے ملی ہوئی ہے اور اُس کی رازداری کرتی ہے خیر کبھی نہ کبھی تو میرے
ڈھب پر چڑھے گی یہ مُدعا پا کر تو تھانہ دار اُچھل پڑے گا اور عجب نہیں محکمہ سرکار سے کچھ
انعام دلوا دے۔ آزادی لیکن سبھاگی میں اپنا نام ظاہر ہونا نہیں چاہتی تو سمجھ تو سہی اس کا چرچا
بھی بڑی بدنامی کی بات ہے یا نہیں؟ سبھاگی۔ بدنامی کی بات تو ہے لیکن میں کہار لائے دیتی ہوں
تم تو سوار ہو جاؤ پھر میں سمجھ لوں گی۔ میرا اُلّو کہیں نہیں گیا۔ اول تو میں ان ہی سے کچھ نہ کچھ لے مروں
گی اور شاید آپ روپیہ کھیل جائیں اور نہ دیں تو یہ کیا کم ہے کہ تھانہ دار میری مٹھی میں آ جائے گا۔
آزادی سبھاگی دیکھ تو جان خبردار جو کسی پر میرا نام ظاہر ہوا۔ سبھاگی۔ بیوی جی تمہارا کدھر
خیال ہے جو تم سے دغا کرے اُس سے خدا دغا کرے میں تمہارے ساتھ کسی طرح کا سلوک کرنے

جوگی نہیں تو تم نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ حق ناحق تم کو بدنام کروں۔ اگر تمھارا بُرا چاہا ہوں تو جاننا میری
اصل میں فرق ہے۔ آزادی۔ خیر افسوس ہے کہ میں نے چھلاوا کو نہ دیکھا۔ سبھاگی۔ کالا مونہ خدا
تم کو کیا کسی اشراف زادی کو اس کی صورت نہ دکھائے اور میں کہتی ہوں کہ یہی چھلاوا آزمودہ
بن کر تمھارے پاس پہنچی۔ بھلا آزمودہ کی صورت کیسی تھی؟ آزادی۔ لباس تو اُس کا باہر والیوں
کا سا تھا تنگ پاجامہ چوڑیاں پڑی ہوئی آستینوں دار نیچا کرتہ پرانی وضع کی گھٹیلی جوتی مجھے
ایسا خیال پڑتا ہے کہ اوپر کے اگلے دو دانت بندھے ہوئے ہیں۔ سانولا رنگ چیچک رو ڈبلی
ٹھگنی۔ اور کچھ بیماری سی بھی معلوم ہوتی ہے۔ رنگت میں ایک طرح کی زردی ہے۔ سبھاگی۔
بس بس مجھے اپنے پیارے بچوں کی قسم چھلاوا۔ وہ ایک مکارہ عورت ہے تمھارے پاس بہروپ
بھر کر پہنچی ہوگی۔ باقی ٹھنا پتہ تم نے بیان کیا یقین ہے چھلاوا۔ اُس کے بھی اگلے دو دانت
بندھے ہوئے ہیں سانولی چیچک کے داغ۔ ڈبلی ٹھگنی سب ہو بہو چھلاوا۔ اور رنگت کی
زردی جو تم نے کہی تو وہ یہ بڑا اینٹھا افیم کا کھائی ہے آپ سے آپ زرد ہوا چاہے اور دیکھو
میں سب باتوں کا ٹھیک پتہ لگا کر تم کو ضرور خبر دوں گی۔ اب معلوم ہو جائے کہ آزمودہ
یہی چھلاوا تھی یا نہیں اور یہ آج کا ماجرا کیا تھا۔ آزادی یہاں سے ڈولی میں سوار ہوئی تو
سیدھی میکے پہنچی۔ دیر تو کسی قدر ہو گئی تھی مگر کنجی گلی کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی
آزادی سے جاننا یا سبھاگی نے۔ آزادی کا اپنا ارادہ تو دو چار دن سے زیادہ رہنے
کا نہ تھا۔ مگر وہاں لوگوں نے روک روک لیا بڑی مشکل سے پورے ایک مہینے کے بعد چھوڑا
آزادی جب اپنے گھر آئی تو وہ شورش بالکل فرو ہو گئی تھی نہ تو ہمسائے سے کوئی آواز سنائی پڑتی
تھی اور نہ باہر کے رستے پر چرچے دوڑتے تھے۔ آزادی کی بھی عجیب کیفیت تھی کہ جن دنوں
اس کی طلبگاری کا ہر طرف سے پکارا تھا تو اس پکارے سے گھبراتی تھی اور اب جو لوگ اپنی اپنی
جگہ چپ ہو کر بیٹھے تو چاہتی تھی کہ کسی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہو اتفاق سے اس کے محلے کی حلال
خوری سبھاگی کی نند تھی اُس کی معرفت سبھاگی کو بلا کر گلہ کیا کہ تو نے تو اچھی خبر دی سبھاگی
بیوی جی میں دو دفعہ تمھارے گھر آ کر پھر گئی تم اپنے میکے میں تھیں اور خبر بھی کیا تھی تم ڈیوڑھی سے
نکلی ہو کہ چھلاوا میرے پیچھے کھڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ اُپلوں کی کوٹھڑی میں چھپی ہوئی میری

تمھاری ساری باتیں سنتی تھی تم سوار ہوئیں میں تمھاری ڈولی کی طرف دیکھنے لگی چھلاوا نے باہر آ پہلے تو کوٹھری کی کُنڈی جو تم لگا آئی تھیں کھول دی اور پھر میرے سر پر آ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی کہ ہاں اب کہہ کیا کہتی تھی۔ میں۔ کہتی کیا کہ اب تو یہاں تک چل نکلی ہے کہ عزت دار اشراف زادیوں کو زبردستی بلوا بلوا کر بے آبرو کرانا چاہتی ہے۔ تف ہے تیری اوقات پر یہ تو نے کیا حرکت کی اور اگر تھانہ دار کو خبر ہو تو تیری کیسی گت بنائے تو نہیں جانتی کہ وہ مدتوں سے تیری فکر میں ہے اب جا کر کہتی ہوں تو دیکھ تجھ کو کیسا چو مینجہ کرتا ہے۔ چھلاوا۔ اگر تو اپنے دھگڑے تھانہ دار سے ابھی جا کر نہ لگائے تو تیری بھی سات پیڑی پر لعنت ہے اور دیکھوں تو وہ ایسا تیسا میرا کیا کرتا ہے اگر وردی نہ اُتروالوں تو چھلاوا نام نہ رکھواؤں۔ آئی بڑی اشراف زادیوں کی خیر خواہ میری بلا کو کیا غرض پڑی ہے اشراف زادیاں مجھ کو گھر سے بُلا بُلا کر سیکڑوں دفعہ منتیں کرتی ہیں تو میں ایک دفعہ اُن کو آنے دیتی ہوں یہ آج کوئی ایسا کسی گھر بیٹھی کو زبردستی اپنے یہاں بلائے۔ چھلاوا یہ باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک جوان گبھرو سا مرد وا کوٹھڑی میں سے باہر آیا کچھ بولا چالا نہیں۔ مجھے ایک اُنگلی کے اشارے سے کہا کہ باہر جا میں تو چھلاوا سے لڑتی مگر بے تمھارا نام لیئے بات نہیں بن آتی تھی۔ اور اُدھر وہ مردوا کوٹھڑی میں سے نکل آیا تھا۔ بیوی جی میں تو دُم دبا کر بھاگی۔ بڑی دیر کے بعد وہ مردوا گلی کے پھاٹک میں سے ہو کر نکلا میں اُس کے پیچھے لگی لگی چلی گئی معلوم ہوا کہ یہاں جان نثار خاں کے چھتے میں رہتا ہے اور مشتاق نام ہے اور تمھارے یہاں اس کا بہت آنا جانا رہتا تھا۔ آزادی کیوں بھاگی اس چھلاوا نے مجھ کو اپنے گھر کیوں بلوایا ہوگا۔ سُبھاگی۔ بیوی جی کسی کے دل کی کیا خبر ہے لیکن جس کے اپنے رہنے کا مکان اتنا بڑا جہاز کا جہاز پڑا ہے کہ سیکڑوں آدمی اس میں کھپ جائیں اور خبر نہ ہو۔ اور جس مکان میں تم گئیں تھیں ہمیشہ باہر سے اُس کا تالا لگا رہتا ہے اس میں تو میں نے کبھی کسی کو بلایا چلایا نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سے اور مشتاق سے کھڑے دو دو باتیں کرا دینے کے سوائے اور کچھ مقصد نہ تھا۔ پھر اگر تم کہو تو میں چھلاوا سے لگاوٹ کر کے پوچھوں میری اُس کی لڑائی پر نہ جاؤ ہم لڑ بھی لیتے ہیں اور مل بھی جاتے ہیں۔ آزادی سُبھاگی کیا بتاؤں کچھ عقل نہیں کام کرتی تو پھر کبھی آئے گی تو کہوں گی۔ سُبھاگی تمھارے دل پر جو کچھ گزر رہی ہے میں سمجھتی ہوں تم کہو یا نہ کہو اور تم آج کی آج اور آج سے برس دن

پیچھے بلکہ ساری عمر اُسی دُھکڑ پکڑ میں رہو گی خیر تجھے تو تم آدھی رات کو بھی یاد کر دو گی تو لونڈی کو عذر ہو گا اور مجھے نہیں۔ کوئی آنا ہو پیروں سے اور نہیں آؤں سر سے آنکھوں سے لیکن اگر میرا کہا مانو تو جس سے تمھاری طبیعت ٹھکتی ہو کسی نہ کسی کو اپنا صلاح کار بناؤ تم اُس سے اپنا دل کا بھید کہو وہ اُس کا کوئی راستہ نکالے آزادی کہی بات ہیں صلاح لینی ہو گی تو تجھ سے بہتر صلاح کار اور کون ہو گا تو میرے میکے کی مہترانی میرے ذرا ذرا حال سے واقف ہیں کیا اتنی بات نہیں سمجھتی کہ سب سے پردہ ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو تم لوگوں سے اور نہیں معلوم خدا کو کیا منظور رہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک معاملہ پیش آ گیا جس کی وجہ تو میری خواہی نخواہی رازدار ہوئی لیکن دیکھو سُبھاگی مجھے بار بار کہنا چاہیئے تو نہیں مگر کیا کروں دل نہیں صبر کرتا۔ اتنی احتیاط کرنا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سُبھاگی بیوی جی میں تم کو زبان دے چکی ہوں رتی برابر فرق نکلے تو تمھاری جوتی اور میرا سر۔ آزادی نے سُبھاگی کو تو رخصت کر دیا اور پھر سوتے سے کنجنی گلی کے معاملہ کو بیٹھی سوچا کی۔ اوّل اوّل تو آزادی کو بڑا ہی طیش آیا کہ یہ کون بدذات پاجی تھا جس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ اُس نے کیا سمجھ کر میری ڈولی بدون میری اجازت کے اجنبی جگہ میں اُتروائی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو اس آبرو باختہ بدمعاش کو ایسا ٹھیک بنواتی کہ ساری عمر کو یاد کرتا اور افسوس چھلاوا میرے ہاتھ نہ لگی میں اُس کو مارتی تو کیا وہ مرنے کے لیے آپ ہی بہانہ ڈھونڈتی پڑی پھرتی ہو مگر مُردار کی چٹیا تو ضرور کاٹ لیتی اور تھوک کر اُس سے چٹوانی سو الگ کہ پھر اُس کو کسی اشراف زادی پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی اس قدر جھوٹ اتنا فریب اور یہ حوصلہ۔ جتنی دیر آزادی کنجنی گلی والے مکان کا خیال کرتی اس پر ایک رنگت آتی اور ایک جاتی۔ وہ اپنے دل میں کہتی تھی کہ اگر میں نے کوٹھڑی کی کنڈی باہر سے نہ جڑ بادی ہوتی اور کوئی مردوا اندر سے نکل آتا تو میں کیا کرتی میرے پاس تو کوئی حربہ بھی نہ تھا اُس گھبراہٹ میں مجکو اُپلوں کی کوٹھڑی کا ذرا دھیان نہ آیا اور چھلاوا مزے میں میرے پاس کے پاس چھپی کھڑی رہی ضرور وہ میرے ڈر کے مارے نہیں نکلی جانتی تھی نہ کہ مچھر کی طرح مسل کر دھر دوں گی لیکن یہ بھی خدا ہی نے اُس کے دل میں ڈالی ورنہ اپنا گھر اپنا محلہ وہ اودھم نہ کرتی صرف غل مچا دیتی اور اُس کے حمایتی پاس کے مکانوں سے ہو کر کود آتے یا باہر کے دروازے کی چول

اُتار لینے تو بڑی قباحت کی بات تھی۔ غرض خدا ہی نے اپنی قدرت سے بچا لیا ورنہ اُس مُردوا چھلاوا
نے میری آبرو لینے میں تو کسی طرح کی کمی کی نہیں۔ لیکن سُبھاگی تو اس کی طرف ایسا شبہہ نہیں
کرتی اور سچ بھی تو ہے اگر اُس کو ایسا ہی منظور ہوتا تو اپنے مکان میں آ اترواتی جہاں میری کوئی
تدبیر بھی پیش رفت نہ جاتی۔ مگر اُس نے مجھ سے کہا کیوں نہیں شاید میرے مونہ سے اُس طرح
کی کوئی بات نکلی جس کو وہ اس پہلو پر ڈھال لے گئی ہو۔ سو بے شک جب اُس نے خواجہ
مشتاق کا نام لیا اتنا میں نے ضرور کہا تھا کہ میں اس کو اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں
اسی جگہ تو پانی مرتا ہے مجکو اُس سے بگڑ کر صاف دو ٹوک بات کہہ دینی تھی کہ خبردار جو آیندہ
کسی کا مذکور کیا ہوگا۔ ایک کٹنی سے یہ کہنا کہ اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں دبی زبان
سے اقرار کر لینا ہے اور پھر بات صاف یہ ہے کہ میری رائے دوسرے نکاح کی قرار پا چکی
ہے اور دیکھ بھال کر کرنے کی تو کچھ آج سے نہیں شروع سے میری مرضی ہے۔ اور چھلاوا
پیغام بھی لائی تو کسی اجنبی کا نہیں لائی خواجہ مشتاق نے کچھ نہیں تو بھی سیکڑوں بار مجھے
دیکھا ہوگا تو اگر چھلاوا نے ہماری دونوں کی دو دو باتیں کرا دینے کی یہ صورت نکالی تو چنداں
بے جا نہیں کیا بلکہ ایک اعتبار سے تو اُس نے شاباش اور انعام کا کام کیا اس کے سوائے
وہ اور کرتی ہی کیا لیکن کیا میں خواجہ مشتاق کے سامنے ہو جاتی رو در رو اُن سے باتیں
کرتی۔ نہیں نہیں۔ کوٹھڑی کے کواڑ بھڑے رہتے۔ خواجہ مشتاق اندر اور میں باہر مجکو جو کچھ
کہنا ہوتا۔ چھلاوا سے کہلا دیتی میری جلدی نے سارا کام خراب کیا پھر تو ایسا موقع کبھی ہاتھ
آنا نہیں۔ بھلا اگر چھلاوا کو سُبھاگی کے ہاتھوں پھر بلواؤں چلی تو آئے گی ان لوگوں کا پیشہ
یہی ٹھیرا نہ ان کو جھوٹ بولنے کی شرم نہ دھتکارے جانے کی غیرت مگر مجکو ایسی ضرورت ہی
کیا پڑی ہے کہ کٹنیوں اور حلال خوریوں کی خوشامد کرتی پھروں۔ کرنا ٹھیرا تو پھر ڈرنا کیا جھجک
نوکروں موقوف اور اپنے میل جول والوں میں سے زیادہ نہیں تو دو چار پر اپنا منشا ظاہر
کردوں تو عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ میرا مدعا حاصل ہو سکتا ہے لیکن مجکو اسی ادھیڑبن
میں اتنے برس گذر گئے اور کوئی بات یکسو نہ ہوئی۔ سُبھاگی سچ کہتی تھی کہ تم ساری عمر اسی
دھکڑ پکڑ میں رہوگی سو میں بھی اِدھر یا اُدھر اب اس کا فیصلہ ہی کئے دیتی ہوں۔ میں نے

کچھ دھیان نہیں کیا کہ اس طرح کی دوسری عورتیں کیا سوچا کرتی ہوں گی - یا تو اُن کو میرے سے خیالات ہی نہیں آتے تو وہ سب سے بھلی اور معلوم ہو تو میں بھی ایسی ہی کوئی تدبیر کروں کہ ان فکروں سے میرا پیچھا چھوٹے - یا دوسری عورتوں کو میری طرح کے خیالات آتے ہیں تو کیونکر زندگی بسر کرتی ہیں - ان خیالات نے تو مجکو ایسا بےچین کر رکھا ہے کہ جس کا حد و پایاں نہیں بہرکیف یہ تحقیقات فائدے سے خالی نہیں میرے مطلب کی کوئی نہ کوئی بات ضرور نکلے گی - بیواؤں کی کیا کمی تھی ذرا کی ذرا خیال کیا تو بیسیوں رانڈیں سمجھ میں آئیں - اس کے بعد سے آزادی نے یہ شیوہ اختیار کیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیوہ عورتوں سے ملتی اور اُن سے اختلاط پیدا کر کے اُن کے بطون دریافت کرتی - کئی برس تک اُس کو اسی کی دھن رہی آخر مرتے دم اُس نے بیان کیا کہ یوں تو سینکڑوں رانڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر دو اوپر چالیس عورتوں کی نسبت میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کا کوئی حال مجھ سے مخفی نہیں رہا -

اٹھارویں فصل - آزادی کا مرض الموت اور اُس کے آخری خیالات

یہ تحقیقات اس طرح کی دل چسپ تھی کہ اگر تن درستی اجازت دیتی تو آزادی جیتے جی اسی میں مشغول رہتی مگر وہ کوارپنے میں جو کوٹھے پر سے گری تھی اور اُس کا کولھا اُتر گیا تھا اب تیرہ چودہ برس بعد اُسی کوٹھے میں کبھی کبھی ایک چپک سی مارنے لگی - کوٹھے کی پرانی چوٹ کی طرف تو کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا تڑ پڑے اور بھپارے اور پچھنے اور جونکیں اور خالی بھری سینگیاں اور پارے اور مالش جس نے جو بتایا سب کچھ کر دیکھا درد ہے کہ جنبش نہیں کرتا حکیموں نے جلابوں پے جلاب دیئے درد کو اُلٹی ترقی ہوتی گئی عورت ذات پردے کی جگہ حکیموں اور جراحوں کے علاج بھی زبانی بیان پر ہوتے رہے اسی میں کئی برس گھل گئے اور پاؤں کا یہ حال ہوا کہ گویا سارا جسم سمٹ کر ٹانگ میں آ رہا تھا - درد اور درد کے ساتھ سوجن - اب آخر آخر میں تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ چھونا اور ہاتھ لگانا کیسا اس کی بھی برداشت نہ تھی کہ کوئی ٹانگ کی طرف گھور کر کے سانس لے یہاں تک نوبت پہنچ چکی تو وہ پادری کی

میم صاحب یاد آئیں جنھوں نے اُترا ہوا کولھا چڑھایا تھا۔ وہ میم صاحب تو ولایت جا چکی تھیں مگر اُن ہی لوگوں میں کوئی اور عورت جرّاحی کا کام کرتی تھی اُس نے دیکھتے کے ساتھ کہا کہ اندر پھوڑا ہی چیرا جائے گا۔ کئی دن اسی پس و پیش میں گزرے کہ چیرا لگوائیں یا نہ لگوائیں اور واقع میں پھوڑا ہی جیسا کہ میم ڈاکٹر کہتی ہی یا کوئی سوداوی مادہ ہی اور اُس میں سمیّت جیسا کہ حکیم لوگ تشخیص کرتے ہیں۔ بارے مجبور ہو کر اور عاجز آ کر نشتر دلوایا۔ تلی ہوئی چھٹانک کم ڈیڑھ سیر ریم نکلی اجس کو دیکھ کر سب کے سب دھک سے رہ گئے برسوں کا زخم باہر کا کھال سخت اندر ہی اندر کئی ناسور پڑ گئے تھے نشتر سے ورم بھی گو یا کہ جاتا رہا کھولن میں بھی کمی ہوئی۔ اور وہ جو مہینوں سے کبھی آدھ گھنٹے کے لیے بھی برابر آنکھ نہیں لگتی تھی اب متصل تین تین چار چار گھنٹے نیند بھی آنے لگی طبیعت غذا کی طرف رغبت کرتی تھی لیکن زخموں کے دھونے اور صاف کرنے اور بتی چڑھانے کی جو تکلیف تھی سو تھی۔ روگ تو ایسا ہی پیچھے لگا تھا کہ اگر ویسی جرّاح اور ہندوستانی طبیب علاج کرتے رہتے تو آزادی کبھی کی ہلاک ہو گئی ہوتی۔ بارے میم ڈاکٹر کی تدبیر سے کہیں نو دس مہینے میں جا کر سارے زخم مندمل ہوئے تو انائی بھی عود کر آئی اور آزادی اچھی خاصی طرح چلنے پھرنے لگی اس پر بھی ایک چور رہ گیا کہ دوبارہ نشتر کے بدون اس کا درست ہونا متعذر تھا۔ میم ڈاکٹر منتظر تھی کہ آزادی ذرا پنپ لے اور اس میں طاقت آ جائے تو دوبارہ نشتر دوں مگر آزادی اور اُس کے بچار دار پہلے ہی نشتر سے ایسے سہم سے گئے تھے کہ اُس کو ہاتھ ہی نہ لگانے دیا۔ ہر چند میم ڈاکٹر نے بہتیرا سمجھایا گو زخم ہلکا اور برائے نام ہی اور ممکن ہی کہ خود بخود بھر جائے اور یہ جو کبھی کبھی پٹی پر دھبہ سا دیتا ہو شاید اتنا بھی نہ رہے مگر میں مطمئن نہیں ہوں اور میری رائے میں نشتر کا دینا ضرور ہی۔ اور میں نے زخم کی کیفیت بیان کر کے دوسرے ڈاکٹروں سے بھی رائے لی ہی۔ وہ بھی نشتر کی صلاح دیتے ہیں۔ زخم کا موقع ایسا خراب ہی کہ اگر اندر کو مُونہ کیا تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکے گی۔ اس سے میں کہتی ہوں کہ ذرا سی کسر کا باقی رہنا بھی ٹھیک نہیں اور ابھی گہرا نشتر دینے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں امید کرتی ہوں کہ دو ہفتے میں طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی لیکن اِن لوگوں نے عارضی تن درستی پر مغرور ہو کر ڈاکٹر بلکہ ڈاکٹروں کی رائے کی کچھ پروا نہ کی اور وہ چور اندر ہی

اندر چپکے چپکے بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ اس علالت میں بھی جب آزادی کی طبیعت ذرا بھی حاضر ہوتی تو ڈاہنی ہوگی پر افسوس کرتی کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اس کی خدمت اور خبر گیری میں کسی طرح کی کمی ہوتی تھی سو خدمتیں اور ہزار خبر گیریاں ایک طرف اور میم ڈاکٹر کا علاج ایک طرف مگر دو چار مرتبے اس کو جو مولوی مستجاب کے سامنے تپ وغیرہ معمولی علالتیں ہوئی تھیں اس کو یاد آتی تھیں اُن کی ہمدردی اور دلجوئی اور وہ اب کہاں دہری تھی۔ رہ رہ کر اس کو خیال آتا تھا کہ تعلق زناشوئی بھی عجیب طرح کا تعلق ہے کہ خوشی تو خوشی رنج و مصیبت کو بھی باہم دگر دبنا ہے علالت کی وجہ سے ایک اور تبدل بھی آزادی کے خیالات میں واقع ہوا۔ اس کی علالت سخت تو تھی ہی ہر چند اِس کے مُونہ پر تسلی اور تشفی کے سوا کوئی کچھ نہیں کہتا تھا مگر یہ لوگوں کے بشرے سے پہچانتی تھی کہ ان کو میری طرف سے یاس ہے۔ میم ڈاکٹر کا یہ معمول تھا کہ آزادی کی چارپائی کے پاس آکر بیٹھتی اور زخم کو ہاتھ لگانے سے پہلے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اس نے آزادی کی تندرستی کے لیئے دعا مانگی۔ پھر زخم کی شست وشو اور بندش کے بعد چند منٹ کے لیئے آنکھیں میچیں اور رخصت ہوئی۔ سمجھ تو سب گئے تھے مگر آخر کسی نے مُونہ پھوڑ کر پوچھا پر پوچھا تو میم نے کہا کہ ان کے حق میں دعا کیا کرتی ہوں کہ اے خداوند تو اپنے فضل و کرم سے اس ہندی کو شفا دے اس کی تکلیف کو دور کر۔ اور میری مدد فرما کہ میں تشخیص مرض اور علاج میں غلطی نہ کروں۔ غرض کچھ تو اوپر والوں کا ہراس اور سب سے بڑھ کر اندر سے اپنے دل کی گواہی آزادی بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اول تو میں اس بیماری سے جانبر ہوتی نظر نہیں آتی اور شاید بچ بھی گئی تو اپاہج ہو کر جی تو کیا خاک جی اس سے تو کہیں خدا مجکو اُٹھا لے تو میں اُس کی جناب میں شکر کا سجدہ کروں ۔ مرنے کے خیال کے ساتھ جو آزادی نے اپنے دل ہی دل میں سوال جواب کیئے بڑے ہی دلچسپ تھے ۔ سوال کیا واقع میں اب کوئی دن میں مر دل گی ؟ جواب ۔ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں رہی بیماری ہے تو زخم ہے میں نے تو بے ٹانگ کے آدمی جیتے دیکھے ہیں۔ وہ ایک بڑھیا فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی ہے خدا جانے کیا ہوا تھا کہ ران کی جڑ سے اُس کی ٹانگ کاٹی گئی بیساکھی پر سارے شہر کا چکر لگا آتی ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی کثرت سے دیکھنے میں

آہیں کہ ذرا سے دُکھ میں آدمی ہلاک ہو ہو گئے۔ غرض مر جانے کا بھی تعجب نہیں اور بچ جانے کا
بھی تعجب نہیں۔ اور اس سوال سے فائدہ ہی کیا ہے آخر تو ایک دن مرنا ہے زندگانی کی مثال
گھڑی کی سی ہے کہ کسی کی ۲۴ گھنٹے کی کوک ہے کسی کی ایک ہفتے کی کسی کی ایک مہینے کی
جس وقت جس کی کوک ہو چکی بند۔ س۔ جتنی تکلیف مجکو پاؤں کے زخم سے پہنچ چکی ہے کیا
مرنے کے لیئے مجکو اُس سے زیادہ تکلیف کا متوقع رہنا چاہیئے؟ ج۔ یہ بات بھی سوائے خدا
کے کوئی نہیں جان سکتا بعض کو دیکھا کہ چار چار پانچ پانچ دن سکرات میں مبتلا رہ کر بڑی
مشکل سے جان دیتے ہیں۔ اور بعض ہیں کہ باتیں کرتے کرتے رخصت ہو جاتے ہیں پہلے
میرا خیال تھا کہ نیک بندوں کی جان آسانی سے نکلتی ہوگی۔ پھر حدیث میں دیکھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلم پر بھی تین دن جانکنی کی سخت ایذا رہی کہ آپ جلد جلد کروٹیں بدلتے پانی میں ہاتھ بھگو بھگو کر بار بار مونھ
پر پھیرتے تھے اور حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ جب سے میں نے پیغمبر خدا صلعم کی جانکنی دیکھی ہے میں کسی کی جانکنی
کو جانکنی ہی نہیں سمجھتی اور بعض بزرگوں کو تکلیف سے مرتے دیکھا اور لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ کیسے خوش نصیب بندے
تھے کہ دنیا میں جو گناہ کیئے تھے اُن کا کفارہ یہیں دنیا میں بھگت گئے۔ علاوہ اس کے معصوم
بچوں کی جان اکثر بڑی سختی سے نکلتی ہے۔ اکثر لوگوں کے دماغ مرتے وقت معطل ہو جاتے ہیں تو
اُن کو سکرات کی ایذا محسوس نہیں ہوتی جیسی تم کو کوطا چڑھانے کی اور نشتر کی بہرکیف آسانی اور سختی
موقوف ہے روح کے تعلق پر اور اس کا حال سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ اور پھر میں کہتی ہوں کہ
یہ سوال بھی فضول ہے۔ سرے سے مرنا ہی انسان کے اختیار کا نہیں تو آسانی سے مرنا اُس کے بس کا
کیوں ہونے لگا۔ س۔ اس سے تو نہ پیدا ہوئے ہوتے تو بہتر تھا۔ خدا نے بے مانگے
تو جان دی اور پھر اُس کو لیا تو اس قدر تکلیف پہنچا کر۔ ج۔ توبہ توبہ یہی تو کفر کے
سے خیالات ہیں اگر کہیں آخر وقت اس طرح کے خیالات میں آدمی کی جان نکل گئی
تو ابد الآباد کے لیئے راندہ گیا۔ یہ تو خدا کی قدرت میں دخل دینا ٹھیرا کہ یہ کیوں
کیا اور یوں کیوں کیا۔ دنیا جہان کا اتنا بڑا کارخانہ کون جان سکتا ہے کس مصلحت سے
جاری ہے ایک روئے زمین پر ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات ہے ان میں سے ایک مخلوق انسان
بھی ہے جس کی پیدائش اور زندگی اور موت سب کے قاعدے بندھے پڑے ہیں۔ ہم کبھی

بکری یا بلّی۔ با اور بے زبان مخلوقات کو دیکھ کر اپنے دل میں کہا کرتی ہوں الٰہی ان جسموں میں کس طرح کی روحیں بند ہیں اور یہ روحیں کس خیال میں رہتی ہیں ایک مخلوق درخت ہیں جن کی قسموں کا شمار نہیں۔ ان کے بھی بعض حالات انسان سے ملتے ہوئے ہیں۔ پیدا ہوئے بڑھے۔ پھلے پھولے اور آخر کو گل سڑ کر خاک ہو گئے جس طرح بعض پھل پکنے نہیں پاتے اور تلف ہو جاتے ہیں اسی طرح آدمیوں کے بچے کوئی کوئی صغر سن میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ غرض ایک عجیب چکر سا لگا ہی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یوں آدمی بیہودہ خیالات کرنے پر آئے تو بہتیرے لایعنی اشتبہات پیدا کر سکتا ہی۔ مثلاً بچے دینے کے لیئے عورت کی کیا تخصیص تھی۔ یا کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ عورت نے چھینک لی اور ناک سے اولاد جھڑ پڑی۔ یا عورت کھانسی اور مونہ سے بیٹے بیٹیاں اُگل دیں۔ یا جس طرح اکیلے درخت میں پھل لگتا ہی کیوں نہیں اکیلی عورت سے اولاد ہوتی اور کیا حضرت مریم کے نہیں ہوئی؟ لیکن یہ سارے فساد ہیں اُس ذراسی عقل کے جو انسان کو دی گئی ہی۔ جب عقل میں فتور ہوتا ہی تو ایسی ہی اپنی تنہ ار ہیں سوجھتی ہیں۔ انسان اسی ذری سی عقل کے گھمنڈ میں آ کر اپنے تیئں خیال کرتا ہی کہ میں بھی کچھ ہوں۔ کچھ تو ہی مگر بھُنگے سے زیادہ ذلیل۔ مچھر سے بڑھ کر حقیر چینیوٹی سے زیادہ ضعیف اور ذری سی ذری دکھ اور چھوٹی چھوٹی سی تکلیف سے اُس کی ذلت اور حقارت اور بے حقیقتی ظاہر ہوتی رہتی ہی مگر وہ بیچا ایسا ہی جیسا کہتے ہیں۔ ع سی چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل پڑی ٭ دکھ دفع ہوا تکلیف ہٹی اور وہ لگا پھر اپنی شیخی بگھارنے۔ ا مضمون کو خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی جگہ بیان فرمایا ہی چنانچہ ایک مقام پر ہی وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ اور جب آدمی کو کوئی ایذا پہنچتی ہی تو کروٹ کے بل پڑا اور بیٹھا ہی تو بیٹھا اور کھڑا ہی تو کھڑا ہم کو اپنی مدد کے لیئے بلاتا ہی پس جب ہم اُس کی ایذا کو دور کر دیتے ہیں تو چاپتا پھرتا نظر آتا ہی کہ گویا اس ایذا کے لیئے اُس نے ہم کو بلایا ہی نہیں۔ دکھ درد نہ بھی ہو تاہم انسان پرلے درجے کا عاجز اور کمزور مخلوق ہی۔ چند منٹ کے لیئے بھی اس کو سانس لینے کے لیئے ہوا نہ ملے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بھوک پیاس کی برداشت کا یہ حال ہی کہ رمضان کے مہینے میں جو لوگ سچ مچ کا روزہ رکھتے ہیں۔ باوجودے کہ سحر تک شکم کو کھانے اور پانی سے

ٹھونس ٹھونس کر بھرے چلے جاتے ہیں مگر شام تک، اچھے ہٹے کٹے آدمی کی چولیں ڈھیلی۔ عقل معاش نے پردہ ڈھک رکھا ہے ورنہ آدمی کی ہستی کچھ بنیاد ہے۔ ذری سی سردی پڑی کانپنے لگا گرمی ہوئی بولا اُٹھا۔ صانع قدرت نے دوسرے جانوروں کو کیسے کیسے سامان عطا فرمائے ہیں کسی کے سینگ ہیں۔ کسی کے پنجے۔ کسی کے دانت۔ کسی کی چونچ۔ کسی کو تیزی رفتار۔ کسی کو پرواز سختی موسم سے بچنے کے لیئے پر۔ پایا اُون اور آدمی ان سب سے محروم۔ کُل سے بے نصیب۔ وہ جسمانی ریاضت اور ورزش سے دودھ پی پی کر اور گھی کھا کھا کر اپنی قوت اور توانائی کو بڑھاتا مگر نہ بھینسے جتنا بوجھ اُٹھا سکتا۔ نہ اونٹ کی برابر منزلیں طے کر سکتا۔ نہ گھوڑے کی طرح بھاگ سکتا۔ نہ بیل کی مانند لاؤ کھینچ سکتا۔ وہ کشتی کے کتنے ہی داؤ کیوں نہ جانتا ہو مگر ایک مکھی اس کے بس کی نہیں۔ ایک پسّو اُس کے قابو کا نہیں۔ اس قدر عاجز اور مجبور اور اس پر تکبر و غرور لیکن اس کی ساری شیخی کرکری کر دیتی ہے موت کہ وہ نہ دبائو سنتی۔ نہ دوا کو مانتی۔ نہ گڑگڑانے پر رحم کرتی۔ نہ کسی کی بے کسی پر ترس کھاتی ہے نہ قوت سے ڈرتی۔ نہ حکومت سے دبتی نہ تدبیر سے رُکتی نہ ٹالے سے ٹلتی۔ بس اب ہے مرے پیچھے کیا ہوگا ہ ج ہوگا کیا جو اوروں کا حال وہ ہمارا حال۔ آج مرے کل دوسرا دن یعنی جس کی آئی وہ مر گیا اور پھر دنیا کا کارخانہ بدستور چلنے لگا۔ ؏

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

اِدھر جان نکلی اور اُدھر لوگوں نے پہلی منزل تک پونچانے کے لیئے جلدی مچانی شروع کی۔ گاڑ داب کر گھر آئے کسی قدر روئے پیٹے مرنے والے کو نہیں بلکہ اپنے فائدوں کو اپنی اغراض کو چند روز بعد سب بھول بسر گئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ س۔ نہیں میں یہ پوچھتی ہوں کہ مجکو مرے پیچھے کیا پیش آئے گی۔ ج۔ بات یہ ہے کہ جس چیز کو کسی مصلحت سے خدا چھپائے بندے کی کیا مجال ہے کہ اُس میں اپنی عقل دوڑائے ظاہر حال تو سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم گل سڑ کر خاک ہو جاتا ہے لیکن خوب سوچو اور غور کرو تو یہ بات کچھ دل کو لگتی سی نہیں کہ بس مرتے پر خاتمہ ہو گیا سبب پوچھو تو کچھ بیان کرنے میں نہیں آتا مگر جس کو دیکھو اپنے دل میں اس کا ضرور یقین رکھتا ہے کہ چاہے میرا بدن مٹی ہو جائے یا جلا کر راکھ کر ڈالیں یا جانور نوچ نوچ کر کھا جائیں پھر بھی یہ تو خبر نہیں کہ میں کیا ہوں اور کیا ہوں گا اور کہاں ہوں گا مگر ہوں گا ضرور ہوں گا

یہ ایسا خیال ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کا تمام انتظام درہم برہم ہو جائے۔ بے شک یہ خیال ہر وقت پیش
نظر نہیں رہتا اور سب کو یکساں بھی نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کے تمام افعال حرکات سکنات کا دار و مدار
اسی خیال پر ہے آج آدمی اس عقیدے کے ہو جائیں کہ مرے اور پھر کچھ نہیں تو دنیا ایک لمحہ کے
لیئے نہیں چل سکتی ایسے لوگوں میں نہ امن ہو نہ عافیت ہو نہ نیکی بدی کا امتیاز ہو نہ بڑے بھلے کا
تفرقہ۔ پھر وہ دنیا ہی کیا خاک ہو۔ یہ سچ ہے کہ بعض لوگ انکار کر بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے
اور بس اور مرے پیچھے کچھ ہونا ہوانا نہیں سو غیب کی بات کو جس کا راز اس زندگی میں کسی طرح
کھل نہیں سکتا جھٹلا دینا کیا مشکل ہے لیکن یہ ان کی ہٹ دھرمی اور کٹھ حجتی ہے۔ ان کو جیسے قیامت کے
ہونے کی خبر نہیں ایسے ہی اُس کے نہ ہونے کی خبر نہیں۔ جو کچھ مُونہہ میں آیا بک دیا۔ اور اگر واقع
میں اُن کو پورے طور پر یقین ہے کہ مرے پیچھے کچھ ہونا ہوانا نہیں تو کیوں نہیں سارے جہان کی غلط
فہمی کی اصلاح کرتے۔ ہم کو اگر سمجھا دیں تو ایسا سمجھا تا کہ دل سے یہ خدشہ دور ہو جائے تو ہم اُن کا بڑا ہی
احسان مانیں لیکن دوسرے کو کیا سمجھا سکیں گے جب ان کا اپنا یہ حال ہے کہ گفتار سے انکار اور
کردار سے اقرار۔ کہ اگر حقیقت میں ان کو قیامت کا خوف نہ ہوتا تو وہ بالکل دوسری طرح ہی کے
آدمی ہوتے اور اپنے سوائے روئے زمین پر کسی دوسرے کو بسنے نہ دیتے۔ جو خیال خدا نے عام لوگوں کے
دلوں میں ڈالا ہے اور جس کے مطابق اُن کا عمل درآمد ہے بعینہ اسی کی تعلیم اور تاکید مذہب بھی کرتا ہے کہ
مرے بعد انسان کو ایک طرح کی ہستی ہوگی جس کو وہ اس زندگی میں بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ اور اس ہستی کی
بہتری اور خرابی موقوف ہوگی اُن خیالات اور معتقدات پر جو وہ اس زندگی میں رکھتا تھا اور نیز اُن
اعمال اور افعال پر جو اُس نے اس زندگی میں کیئے۔ اور ان دونوں زندگیوں میں اس طرح کا تعلق ہونا
کچھ بھی خلاف قیاس نہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں اثر ماں باپ کا اولاد میں۔ بیج کا پھل میں۔ خود انسان کی
ابتدائی حالتوں کا اُس کی مابعد کی حالتوں میں۔ پس۔ میرا کیا حال ہوگا۔ اس رو سے میری اگلی زندگی
تو بدتر سے بدتر ہونی چاہیئے۔ جہاں تک خیال کرتی ہوں میں نے تو اپنی تن پروری کے سوائے کوئی
نیکی کا کام کیا کرایا نہیں۔ اگر میرا پیدا ہونا صرف تن پروری کے لیئے تھا۔ کہ کھاؤں پیوں پہنوں
سو رہوں تو مجھ میں اور جانوروں میں کچھ بھی فرق نہیں۔ پھر مجکو اتنی ساری عقل کیوں دی ہوگی
اور خیر شاید عقل اس غرض سے دی ہو کہ میں جانوروں سے بہتر حالت میں رہ سکوں تو بھلائی

برائی کا سمجھانا کیا ضرور تھا کہ یہ مجھ میرے دل میں چٹکیاں لے اور مجھکو ایذا دے۔ ہے ہے یہ سامان
تو میری ہمیشہ ہمیشہ کی ہلاکت اور تباہی اور بربادی کے ہیں۔ اب میں کیا کروں مجھکو کیا خبر تھی کہ
میں اس قدر جلد مروں گی۔ سچ ہے یہی نہ کہتا کہ مجھکو کیا خبر تھی۔ کیوں کیا تو نے اپنے سے چھوٹی عمر والوں
کو مرتے نہیں سُنا اور نہیں دیکھا۔ کیا تجکو معلوم نہ تھا کہ تن درست کو بیمار ہوتے اور بیمار کو مرتے دیر
نہیں لگتی۔ کیا تو نہیں جانتی تھی کہ زندگانی کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیا ایسی مثالیں سیکڑوں ہزاروں
تیرے روبرو پیش نہیں آئیں۔ بس۔ خیر تو میں نے نیکی نہیں کی تو ایسی کوئی برائی بھی نہیں کی۔ دنیا
میں سبھی طرح کے لوگ ہیں جو اوروں کا حال وہ میرا حال۔ سچ یہی بات ہے تو پھر گھبراہٹ کاہے کی
اگر آدمی کو پورا پورا اطمینان ہو کہ اُس زندگی میں ایذا نہیں رنج نہیں ایسا آدمی موت سے
ڈرے تو احمق۔ بزدل۔ ڈرپوک۔ یہی نہ کہ دو چار دن مرنے کی ایذا ہوئی تو کیا سبھی کو ہوتی ہے۔ اور
اُس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ اور کیسی ہی تکلیف ہو جب ہو چکی گئی گزری ہوئی پھر دنیاوی
رنج و راحت بھی کچھ رنج و راحت ہیں۔ یہ عارضی اور چند روزہ۔ اصلی رنج و راحت تو وہاں کے رنج
و راحت ہیں جن کو کبھی انقطاع نہیں جن کی کہیں انتہا نہیں۔ بڑی مشکل تو یہی ہے کہ جیتے جی کوئی
فرد بشر اُس زندگی کی طرف سے مطمئن ہو نہیں سکتا یہاں تک کہ پیغمبر صاحب جن کے اگلے پچھلے سب گناہ
خدا نے بخش دئے تھے جیسا کہ سورہ اِنَّا فَتَحْنَا میں ہے لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ وہ
بھی تو فرماتے تھے۔ مَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ مجھکو معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا
اور کیا تم کو پیش آئے گی۔ اور یہی سبب تھا کہ آں حضرت عبادت الٰہی میں بڑی مشقت اُٹھاتے
اور رات دن خدا سے معافی مانگتے رہتے تھے۔ قوم یہود میں خدا نے دین اور دنیا دونوں طرح کی
سلطنتیں دی تھیں یعنی اُن میں بعض پیغمبر تھے بعض بادشاہ۔ اُس کی نسل اپنے بزرگوں کی فضیلتیں دیکھ کر
ایسی مغرور ہوئی کہ لگے کہنے نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰہِ وَاَحِبَّاءُہٗ۔ ہم تو خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ اور اسی
وجہ سے اُن کا یہ مقولہ تھا کہ ہم میں سے کسی کو آتشِ دوزخ چھوئے گی بھی تو صرف چند روز کے
لیئے اُن کو قائل معقول کرنے کے لیئے خدا فرماتا ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ اگر ایسا ہے تو
موت کی آرزو کرو جس سے معلوم ہو کہ جو تم مُونہ سے کہتے ہو تمھارے دل میں بھی ہے۔ کیوں کہ
جب آدمی کو آخرت کی طرف سے اطمینان ہے تو وہ موت سے کیوں جان چرانے لگا۔ غرض یہ

کھٹکا کہ دیکھئے کیا ہو صاف دلالت کرتا ہی کہ اس کے دل میں چور ہی جو بے قصور ہوگا وہ مطمئن بھی ضرور ہوگا۔ اور یہ جو تم نے کہا کہ میں نے نیکی نہیں کی تو ایسی کوئی بُرائی بھی نہیں کی تم کو اپنی ذمہ داری پر نظر نہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ بشریت کے جامے میں کوئی شخص معصوم ہو۔ انسان کی خلقت ہی اس طرح کی ضعیف واقع ہوئی ہی کہ بدون بھٹکے بے بہکے اس کو دو قدم سیدھا راستہ چلنا بھی مشکل ہی اس پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ہی کہ وہ اس کو آسانی سے اُٹھا نہیں سکتا چند در چند خواہشیں اُس کے پیچھے لگی ہیں جن میں اعتدال پر قایم رہنا نہایت ہی دشوار ہی اس پر حقوق ہیں خدا کے جس نے اُس کو پیدا کیا جو اس کو روزی دیتا اور اُس کی زندگی کے لیے ہزاروں طرح کے سامان کرتا۔ اس پر حقوق ہیں خود اپنے نفس کے اس پر حقوق ہیں اُن لوگوں کے جن میں وہ رہتا یعنی ماں باپ کے بھائی بہن کے عزیز و قریب کے دوست آشنا کے عورت ہی تو شوہر کے مرد ہی تو بی بی کے اولاد کے اُستاد کے اپنے سے بڑوں کے اپنے سے چھوٹوں کے حاکم وقت کے ہمسائے کے ہم وطن کے زمین کے آسمان کے سارے جہان کے۔ محال عقل ہی کہ انسان اتنے سارے حقوق بے کم و کاست ادا کر سکے پس چار و ناچار کسی نہ کسی بات میں اس سے افراط و تفریط ضرور ہوتی ہی اور اسی افراط و تفریط کا نام ہی گناہ۔ اسی طرح تمھارا یہ کہنا کہ دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہیں جو اوروں کا حال وہ میرا حال سرتاسر نادانی اور بے عقلی کی بات ہی۔ پھر تم ٹانگ کے دُکھ سے اس قدر بے قرار کیوں تھیں۔ آخر دنیا میں اور بھی خدا کے بندے تھے اور ہیں جو تم سے بھی کہیں زیادہ تکلیفوں میں مبتلا ہیں۔ جب تم کو دوسروں کی ایذا سے دنیا میں تسلی نہیں ہوئی تو آخرت میں کیوں ہونے لگی۔ مگر یوں کہو کہ ابھی آخرت سر پر پڑی نہیں جس دن سر پر پڑے گی ساری حقیقت کھل جائے گی تیں۔ تو کیا مجھ کو درستی عاقبت کی کچھ اُمید نہیں رکھنی چاہیئے؟ آج۔ نہیں نہیں۔ خدا کی طرف سے مایوس ہونا بھی کفر ہی

اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار * نہ ہو اُس سے مایوس اُمیدوار

تیں۔ کیا سچ مچ خدا مجھ جیسے گنہگار پر بھی فضل کر سکتا ہی جس نے ساری عمر بھلائی کا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اب جو میں خیال کرتی ہوں تو میری نیکیوں میں اگر میں اُن کو نیکی سمجھ سکتی ہوں لے دے کر یہی ایک نماز سو اول تو اتنی پڑھی نہیں جتنی قضا کی۔ اور جو پڑھی بھی تو کیا خاک پڑھی ظاہر میں تو خدا کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی ہوں اور دل ہی کہ خدا جانے کہاں کہاں بھٹکا چلا جاتا ہی اس

سے بڑھکر بھی کوئی شامت ہوگی کہ کسی نماز میں مجکو رکعتوں کی گنتی ہی یاد نہیں رہتی۔ تو میں سمجھتی ہوں۔ ایسی نماز پڑھی نہ پڑھی برابر۔ رہے برس کے برس رمضان کے روزے سو میں بات کہوں صاف میں نے تو کوئی روزہ خوش دلی سے رکھا نہیں۔ روزے رکھے مگر اُس کے ساتھ خواہی نخواہی یہ بھی خیال آتا تھا کہ نہ رکھوں گی تو روزہ خور کہلاؤں گی لوگ چھیڑیں گے۔ اور جو قضا ہوئے اُن کے ادا کرنے کا کبھی کچھ تردد کیا نہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو رکھے وہ خدا کے تھے یا ریا کے اسلام کا تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جس میں مجکو ساری عمر کلام رہا کہ باون۵۲ روپیے کا نصاب بہت ہی تھوڑا ہے اب وہ زمانے نہیں رہے کہ جس کے پاس باون۵۲ روپیے فاضل ہوں اُس کو غنی کہا جائے اور جب غنی نہیں تو زکوٰۃ کیسی۔ باون روپیے والا صاحب زکوٰۃ تو نہیں مستحق زکوٰۃ کہو تو ہو سکتا ہے ہاں گھٹا پا تا میرے پاس ضرور ہے۔ کبھی ٹھیک حساب کرنے کا تو اتفاق نہیں ہوا اگر ایک ہزار سے اوپر ہی اوپر کا ہوگا۔ ہزار ہی روپیے کا رکھو تو ہر برس میں دن زکوٰۃ کے پچیس نکلتے نکلتے ایک دن گھٹا ہی گیا گزرا ہو جائے پچیس روپیے ہوں تو اُس کی ٹوٹ پھوٹ ہی درست نہ کراؤں۔ اور اس مسئلے میں تو میں امام شافعی کے مذہب پر ہوں جن کے ہاں سرے سے گہنے پر زکوٰۃ ہی نہیں۔ غرض زکوٰۃ تو نہیں مگر یوں کوئی فقیر دروازے پر آ کھڑا ہوا اور گھر کتے جھڑکنے سے بھی نہ ٹلا تو ایسے بچہ کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ میں نے باسی روٹی کا ٹکڑا یا پھٹا پرانا چیتھڑا کیوں نہ دیا ہوگا۔ ضرور دیا ہوگا لیکن کیا ایسا دینا داخل خیرات ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ مانگنے والے کی تحقیر اور دل آزاری کی وجہ سے نیکی برباد گنہ لازم۔ نماز اور روزے اور زکوٰۃ کا یہ حال ہو تو حج کا کیا مذکور ہے۔ نہ گئے اور نہ جانے کا ارادہ۔ اور خیر ان ظاہری عبادتوں پر کیا موقوف ہے یوں بھی مجکو خدا کے ساتھ ایسا کونسا تعلق ہے خدا دنیا کے دستور کے مطابق فارغ البالی اور خوش حالی کے زمانے میں یاد آنے کی تو کوئی چیز نہیں۔ ہاں مصیبت کے وقت خدا یاد آتا ہے سو مجکو بھی یاد آیا مگر کب ہے جب کوئی تدبیر نہ چلی اتنی اور ایسی یاد پر مجکو بندۂ غرض کہیں تو بجا ہے نہ بندۂ خدا۔ یہ حقیقت تو حقوق اللہ کی ہے اب رہی حق العباد تو میں نے اپنے حقوق کے سوائے کسی سے کچھ مطلب ہی نہیں رکھا اور کبھی لوگوں کو مجھ سے کچھ ایذا ہی پہنچی ہوگی۔ کسی کی غیبت کسی کا حسد کسی کی شماتت میرا اصول زندگی تو یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ یہ سلوک اور احسان کیا کم ہے کہ کسی پر ہاتھ نہ اُٹھاؤں کسی کو گالی نہ دوں پرائی چیز

نہ چراؤں ہیں نے اس کا مطلق خیال ہی نہیں کیا کہ مجھ پر لوگوں کا بڑا حق یہ ہو کہ جہاں تک ہو سکے
اُن کو فائدہ پونہچاؤں ہیں نے بہتیرے وعظ سُنے کتنی کتابیں دیکھ ڈالیں مگر خدا جانے میری سمجھ
پر کیسے پتھر پڑ گئے تھے کہ ایک لمحے کے لیئے بھی ہیں نے خیال نہ کیا کہ مجکو خدا اور بندگانِ خدا کے ساتھ
کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیئے ہیں نے میاں کے مرنے کا اتنا رنج کیا اتنا رنج کیا کہ بس دوسرا بھی
کوئی کرے گا تو اتنا ہی کرے گا لیکن کبھی یہ نہ سوچا کہ یہی دن مجکو بھی پیش آنے والا ہو۔ بے شک ہیں نے
اپنی پاک دامنی کو دھبہ نہیں لگنے دیا لیکن اُس میں اول تو یہ دیکھنا ہو کہ خدا کے خوف سے یا بدنامی
کے ڈر سے لیکن فرض کیا کہ خدا ہی کے خوف سے ہیں نے اپنے تئیں بچایا تو ہیں نے ایسا کون
کار نمایاں کیا جس کے لیئے انعام کی توقع رکھوں۔ خدا کے یہاں کی تو خبر نہیں مگر دنیا میں تو اس
طرح پہ انعام تقسیم نہیں ہوتے۔ ورنہ سیکڑوں ہزاروں آدمی آکھڑے ہوں کہ ہم تمھارے گھر میں نہیں گیا
کو دے لاؤ ہمارا انعام۔ اجی نہیں کو دے تو سزا سے بچے انعام کاہے کا مجکو بڑا تعجب ہو کہ جو باتیں اب
مجھے ایسی کُھلی ہوئی اور صاف معلوم ہوتی ہیں اُن کی طرف۔ اس سے پہلے میرا ذہن منتقل
کیوں نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ اب میرا وقت قریب آلگا ہو۔ ورنہ کیا میں پہلے کبھی
بیمار نہیں پڑی یا پہ میری عقل میں روشنی میرے ذہن میں صفائی اس طرح کی کبھی نہیں آئی لیکن
اب سوچنے سے کیا ہوتا ہو۔ سوچنا تو اُسی وقت فائدے کا تھا جب مجکو اُس کے مطابق عمل کرنے
کی مہلت تھی اب موت سر پر آکھڑی ہوئی ہا نہیں بھی آکھڑی ہوئی تو بیماری نے مجکو توڑ کر چور کر دیا
اور اس قابل بھی نہ رکھا کہ بھلا کھڑے ہو کر اطمینان سے دو رکعتیں تو پڑھ لیتی۔ ایسی حالت میں مجھ سے
ہو بھی کیا سکتا ہو۔ درد ذرا دیر کو تھمے تو آدمی کسی طرف کو جی بھی لگائے یہاں یہ ہو کہ دم نہیں لینے دیتا
نماز میں حضور قلب ہو تو کیونکر ہو۔ اور مانا کہ میں اچھی بھی ہو گئی تو پچھلی فروگذاشتوں کا کیا علاج
وقت جو نکلنا تھا نکل گیا اب میں اُس کو لوٹا نہیں سکتی۔ جو کچھ نامۂ اعمال میں لکھا جا چکا ہو اس
کو مٹا نہیں سکتی میں بھتیرا چاہوں کہ خدا سے نا امید نہ ہوں لیکن امید عبث تو قع فضول
بوؤں کانٹے اور چننے چاہوں پھول۔ رج۔ بے شک کردار تو ایسے ہی ہیں کہ نجات کا ضعیف سے ضعیف
احتمال بھی نہیں ہو سکتا مگر خدا بڑا غفور و رحیم ہو اُس نے اپنے سچے اور پاک کلام میں بڑا مستحکم وعدہ فرمایا ہو کہ
یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

اے لوگو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک خدا
سارے گناہوں کو معاف کرے گا بے شک وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ اس سے بڑھ کر اور بھی
کوئی چیز تسلی دینے والی ہو سکتی ہے۔ سارے گناہوں میں سب گناہ آ گئے خدا کے ہوں یا بندوں
کے۔ بس کیا توبہ و استغفار کی بھی ضرورت نہیں ہے ج۔ جب بندے نے گناہ کو گناہ سمجھا بس یہ
سمجھنا ہی اس کی توبہ ہے۔ انسان ایک کام کو گناہ سمجھے گا تو وہ کام اس سے ہوگا ہی نہیں۔ اور بندہ
بشر ہے ہو گا بھی تو کبھی نہ کبھی اس کو افسوس بھی ضرور ہو گا اور وہ اس سے آخر کار باز بھی ضرور آئیگا
بس۔ اچھا تو اب اس حالت میں جو دن جینا ہے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ج۔ جہاں تک ہو سکے تلافی مافات
اور آیندہ کے لیے اصلاح خیالات و عادات بس۔ مگر مجھ سے تو اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور نہ آیندہ
امید ہے کہ میں کچھ کرنے جوگی ہوں گی۔ ج تم پر ناامیدی کے خیالات ہیں غالب قرآن کے وہ پیارے
بچن اس وقت تمھارے ذہن میں نہیں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰہَا
اللہ جل شانہ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر بقدر اس کی طاقت کے اور حسب قدر جس کو دیا اسی کی
بساط کے موافق اس سے مانگا جاتا ہے۔ نہ امیر کا صدقہ اور نہ غریب کا نرمی سے کہہ دینا کہ اللہ تم کو برکت
دے، ہم بہت شرمندہ ہیں کہ ہم کو تمھاری خدمت کرنے کا مقدور نہیں۔ بس۔ کیا بھول ہوئی ہے جن دنوں
لوگوں کی طرف سے میرے پاس شادی کے پیام پر پیام چلے آتے تھے ایک شخص نے مجھ کو ماہم ثواب
لکھا تھا کہ اگر تم دوسرا نکاح کر لو گی تو تمھاری دیکھا دیکھی جتنی بیوہ عورتیں نکاح کریں گی روز قیامت
تک اس مری ہوئی سنت کے زندہ کرنے کا ثواب تم کو ملے گا اگر میں ان دنوں نکاح پڑھا لیتی اس
نیت سے کہ دوسروں کے لیے سند ہو تو بے شک اس کے یہ معنے تھے کہ اتنی عورتوں کو گو یا میں نے
عذاب بیوگی سے نجات دی۔ دنیا کی رسوائی اور آخرت کی فضیحت سے بچایا لیکن وہ موقع تو گیا
اور ایسا گیا کہ پھر اس کے آنے کی توقع نہیں۔ اب تو میں ہزار چاہوں تو کوئی بھی میرا روادار نہ ہو
یہی ایک بھلائی میرے بس کی تھی سو اب میں اس سے بھی گئی۔ اور واقع میں اب جو میں سوچتی ہوں
تو یہ نماز روزہ نیکیاں تو ہیں لیکن پھر بھی ان عبادتوں میں آدمی کی اپنی ہی غرض ہے اور بس یعنی
انسان دوزخ کے خوف یا جنت کے لالچ سے یہ سب زحمتیں اٹھاتا ہے تو دنیا میں بھی انسان
کی ساری کوششیں اپنے ہی فائدے کے لیے ہیں۔ لوگ معاش کی خاطر پڑھتے۔ لکھتے امتحان

دیتے۔ پرائے تابع دار بنتے۔ پردیس مارے مارے پھرتے سپاہی سر کٹواتے اور خدا جانے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں۔ ان کوششوں کی اور طرح پر تعریف ہو تو ہوتے کی سمجھ کر لو ان کو کوئی بھی نہیں سراہتا اسی طرح عبادت اگر ثواب کی طمع یا عذاب کے خوف سے ہو تو داخل خود غرضی ہے۔ اعلیٰ اور سچی اور اعلیٰ درجے کی نیکی تو وہ ہے جس میں انسان کی اپنی غرض کا بالکل شمول نہ ہو اور نہ صرف بجا آوری حکم الٰہی یا دوسروں کو فائدہ پہونچانے کے لئے کی جائے۔ مجکو رہ رہ کر پچھتاوا آتا ہے کہ میں نے اپنی تندرستی کے زمانے میں جب میں سب کچھ کر سکتی تھی کیوں نہیں سمجھا کیوں نہیں سوچا۔ اور اب میں دوسروں کو فائدہ پہونچاؤں گی کیا خاک میں آپ پڑی دوسروں سے خدمت لے رہی یعنی اُلٹی ان کو ایذا دے رہی ہوں اگر دوسروں کو فائدہ پہونچانا نیکی ہے اور واقع میں نیکی اگر ہے تو یہی ہے تو میں خود جانتی ہوں کہ میں نے نیکی نہیں کی اور نہیں کی تو میرے نامۂ اعمال میں کیوں ہونے لگی لیکن میرے ان خیالات سے ہوتا ہی کیا ہے زندگی کے جو دن اکارت جاتے تھے جا چکے اُن کا لوٹا لانا میرے کیا کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہاں ندامت اور افسوس کرنے سے اتنا ہے کہ اگر خدا رحم کرے (اور کرے ہی گا اور نہ کرے تو دنیا جہان کا کہاں ٹھکانا لگے) تو یہ توبہ پچھلے گناہوں کا کفارہ اور نیکیوں کا عوض ہو سکتی ہے لیکن جب تک دم میں دم ہے تمام ذمہ داریاں یعنی فرائض آدمی کے ساتھ ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھی بیٹھ کر پڑھی۔ یا سفر کے عذر سے پوری نہ پڑھی آدھی پڑھی۔ وضو نقصان کرتا ہے تیمم کر لیا۔ بہر کیف نماز زیادہ یا کم اور مشکل یا آسان ہو سکتی ہے مگر نہیں ہو سکتا کہ سرے سے نماز ہی ساقط ہو جائے۔ اسی طرح اگر میں اس حالت میں لوگوں کو اور کچھ فائدہ نہ بھی پہونچا سکوں تاہم کسی سے دو میٹھی باتیں کر لیں کسی کے بال بچوں کی خیر و عافیت پوچھ لی اتنے ہی میں آدمی کا جی خوش ہو جاتا ہے اور سچ پوچھو تو یہ بھی ایک طور پر فائدہ ہی پہونچانا ہے۔ نانا کہ اب میں نکاح کرنے کے قابل نہیں تو کیا لوگوں کو نصیحت کرنے اور سمجھانے کے بھی قابل نہیں۔ باوجودیکہ مذہب میں بھی اجازت بلکہ تاکید ہے اور عقل کی رو سے بھی کوئی قباحت نہیں پھر جو مسلمانوں میں بیوہ کا نکاح نہیں ہوتا ہو نہ ہو یہ رسم بد انہوں نے ہندوؤں سے لی ہے عورتیں حد سے زیادہ شرم کرکے اپنی آزادی کھو اور اپنے حق سے ہاتھ دھو بیٹھیں مردوں کو اس کا خیال نہیں اور خیال ہونے کی وجہ بھی نہیں خود عورت ہوں تو عورتوں کی عزت کی قدر جانیں ان کی مصیبت کو پہچانیں بے شک بڑی عمدہ اور موثر نصیحت تو وہی تھی کہ میں مُنہ سے ایک

حرف بھی نہ کہتی اور کرکے دکھا دیتی۔ مگر اَب　　وہ ہو نہیں سکتا تو خیر اتنا ہی کروں کہ اپنے بُرے سب کچھ
باؤں اپنی بپتی سناؤں یقین تو ہے کہ لوگ سمجھیں اور عبرت پکڑیں اور پھر دیر کرنی بھی مناسب نہیں
ایسا نہ ہو اتنا کرنے سے بھی رہ جاؤں۔ ہرچند ناسور بھر آیا اور کئی کئی ہفتے سے رِسنا بھی موقوف ہے
مگر کھولن اور کلن میں ذرا کمی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ زخم موجود ہے اور عجیب نہیں کہ اُس نے اندر کو مُنہ
کرلیا ہو کیوں کہ جس دن سے زخم کا رسنا بند ہوا اُسی دن سے مجھکو دست چلے آتے ہیں۔ لوگ پیچش
بتاتے ہیں مگر پیچش ہوتی تو مروڑ اس کو لازم تھا۔ اور یہاں مروڑ کا نام نہیں۔ اور آخر یہ کیا بات
ہے کہ دست کے ساتھ کوٹھے کا درد کیوں کم ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جیسا میم ڈاکٹر
نے کہا تھا ناسور نے اندر کا راستہ کرلیا ہے اور اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو اس بیماری سے میرا
بچنا محال ہے۔ دنیا میں مجکو ایسی کون سی آسایش تھی کہ میں مرنے سے گھبراؤں۔ بلا سے ایک
دفعہ مرکر ہر وقت کی ان تکلیفوں سے تو چھوٹ جاؤں گی۔ رہا وہاں کا فکر تو نہ مہلت ہے نہ طاقت
چلتے چلتے بیواؤں کے بارے میں دو دو باتیں لوگوں سے کہہ لوں شاید خدا قبول کرلے اُس کی نکتہ نوازی
سے کچھ بعید نہیں۔ یہ دل میں سوچ ایک دن ٹھیرا پڑوسیوں اور دور نزدیک کے رشتہ داروں اور جان پہچان
والوں میں مردانہ بلاوا بھیج دیا کہ میری علالت کا حال تو آپ کو معلوم ہے اب با سباب ظاہر مجکو
اپنی زندگی طرف سے بالکل نا اُمیدی ہوگئی ہے اور میں نہیں جانتی کہ کس دن اور کس وقت
میرا دم نکل جائے گا مجکو بڑی تمنا ہے کہ ایک بار اس زندگی میں اپنے پیاروں کو اور دیکھ لوں
اور میں آپ سب صاحبوں کے دنیاوی اور دینی فائدے کے لیئے ایک وصیت بھی کرنے والی
ہوں اور اسی غرض سے میں نے سب کو ایک ساتھ بلایا ہے مہربانی فرما کر ضرور ضرور تکلیف
کرنا ایسا نہ ہو کہ یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہے اور میں رخصت ہو جاؤں۔ کیا خدا کی شان ہے
کہ جس وقت سے بلاوا پھرنا شروع ہوا آزادی دفعتاً ایسی تن درست ہوگئی کہ گویا کچھ بیماری ہی
تھی جو مضمون وہ لوگوں کے مجمع میں کہنے والی تھی اس کو اُس نے خوب فرصت سے سوچا اور
کچھ یادداشت بھی لکھ لی ہو تو عجب نہیں کیوں کہ اتنی باتوں کا مسلسل طور پر فی الوقت یاد آجانا
ذرا ہے مشکل۔ مگر ہم نے یہ مضمون کہیں سے نقل نہیں کیا جو کچھ آزادی کے مُونہ سے نکلتا تھا
کئی آدمی لکھتے جاتے تھے اُن میں سے ایک ہم بھی تھے۔ پھر جو دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے

سے مقابلہ کیا تو خدا کے فضل سے ہمارا ہی لکھا پورا اور ٹھیک اُترا۔ آزادی پردے میں تو تھی مگر
ہم نے اتنے پاس سے اُس کو وصیت کرتے ہوئے سُنا کہ اُس کے سانس تک کی آواز برابر ہمارے
کان میں چلی آتی تھی۔ پڑھنے والوں کو ہم اس بات کا پورا اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم نے اپنی
طرف سے اس وصیت میں ایک حرف تک گھٹایا بڑھایا نہیں اور اُس وقت کا لکھا ہوا مسودہ
ہمارے پاس محفوظ ہی اُس پر صدہا بڑے بڑے معتبر آدمیوں کے دستخط ہیں اور وہ تصدیق کرتے
ہیں کہ یہی مضمون بے کم و کاست اُنہوں نے آزادی سے سُنا بلکہ ایک صاحب نے تو یہ لکھ دیا کہ
کاتب مضمون نے فوٹو گراف کا کام دیا ہی۔ آزادی کیا شرافت کیا لیاقت کیا تمیز خانداری کیا
ملنساری سب طور سے اس رُتبے کی عورت تھی کہ کسی کو بلا ضرورت جھوٹوں بلا بھیجتی تو وہ ستّوں دوڑا
آتا اور اس کا یہ بُلاوا تو ایسے پیرائے میں تھا کہ لوگوں نے اپنے سو کام حرج کیے اور جنہوں کو بلایا
تھا کے سب وقت سے پہلے آ موجود ہوئے۔ وصیت جب تک سُنی نہ تھی ہر شخص اپنی جگہ عقل دوڑاتا
تھا کہ ایسی کیا بات ہی جس کے لیے اتنا اہتمام کیا جا رہا ہی۔ کوئی کہتا تھا کہ آدمی ہیں خوش حال میکا تو
ان کا سدا کا امیر ہی جن دنوں ان کا بیاہ ہوا سارے شہر میں جہیز کا چرچا تھا سُسرال مقدرت
کے اعتبار سے ہلکی تھی تو ان کے میاں نے بھوپال میں بہت کچھ کمایا وہ مرے تو وہی تنخواہ ان کے
نام سے جاری ہو گئی اولاد کچھ ہوئی نہیں کسی کو متبنیٰ کرتی ہوں گی اور لوگوں کو اس غرض سے جمع
کیا ہی کہ کل کلاں کو کوئی جھگڑا نہ کرے۔ دوسرا نہیں جی متبنیٰ کی شرع میں کچھ اصل نہیں پڑھی
لکھی مولویوں سے مسائل سنے واقف ایسا نہیں کر سکتی۔ پہلا متبنیٰ کی شرع میں اصل نہ ہو نہ سہی مگر
آدمی کو تو یہ اختیار ہی کہ اپنا مال جس کے نام چاہے ہبہ کر دے۔ اور ان کے آگے تو اولاد نہیں ان
کو تو ضرور ایسا اختیار ہونا چاہیے۔ دوسرا۔ تم ان سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کو خوب جانتا
ہوں پرلے درجے کی دیندار ہیں وہ ایسا نہیں کریں گی۔ پہلا۔ کیا اپنے مال میں تصرف کرنا خلاف
دینداری ہی۔ دوسرا۔ ابے سُنا جس کو میں دینداری سمجھتا ہوں اور جیسی دینداری خاص کر
آزادی بیگم کی ہی اس کی رو سے اپنے مال میں تصرف کرنا بھی منع ہی۔ اگر سچ پوچھتے ہو تو
دنیا میں کوئی چیز کسی کی ملکیت نہیں جو کچھ کسی کے پاس ہی سب عاریتاً ہی اور مالک حقیقی خدا
ہی اور بس۔ اور یہ جو لوگ ہبہ یا وصیت یا تقسیم سے آیندہ کے لیے اپنے ترکے کا انتظام کر جاتے ہیں

ہیں اس کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مال کو یہاں تک دوست رکھتے ہیں
کہ مرے بعد بھی اس میں اپنا ہی انتظام چلانا چاہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے ترکے کا کامل انتظام کر دیا
ہے ہر ایک وارث کے حقوق ٹھیرا دیے ہیں۔ ہم کو اس انتظام میں دخل دینے کی ضرورت نہیں
چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ
عَلِيمًا حَكِيمًا۔ تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ بیٹوں میں تم کو کس سے زیادہ نفع پہونچتا ہے کہ ترکے میں
اس کا زیادہ حق ہو یا کون تم سے زیادہ نفع پانے کا مستحق ہے یہ تو اللہ کا ٹھیرا ہوا ہے بے شک وہ جاننے
والا حکمت والا ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ موت کے ساتھ میراث اور وارث کسی کا کچھ خیال نہ آئے
دنیا کب سے چلی آتی ہے ہم سے پہلے بھی یہ مال کسی کے قبضے میں تھا اور وہ اس کا انتظام کرتا تھا
ہم قابض ہوئے ہم نے انتظام کیا ہمارے بعد جو قابض ہوگا انتظام کرلے گا ؏ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت
نوبت اوست+ یہ باتیں میں نے آزادی بیگم کے مُونہ سے تو نہیں سنیں مگر مجکو تحقیق معلوم ہے کہ
ان کے خیالات دین داری بہت بڑھے ہوئے ہیں اور وہ ایسی چھوٹی متبذل باتوں کی طرف
ملتفت ہو نہیں سکتیں کہ اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو گود لیں۔ میرا گمان تو یہ ہے کہ ان کو
اولاد نہ ہونے کا کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا تیسرا احتمال نہیں تھا یہ وقف کرتی ہوں بھلا۔ مگر یہ کیا
کہلا بھیجا ہے کہ آپ سب صاحبان کے دنیاوی اور دینی فائدے کے لیئے ایک وصیت بھی کرنے والی
ہوں تیسرا دیکھتا۔ جو وقف کے سوائے کوئی اور بات نکلے۔ چوتھا۔ یا شاید اپنی تجہیز و تکفین قبر وغیرہ
کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں گی۔ دوسرا میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیا وصیت کریں گی لیکن متبنیٰ
وقف تجہیز و تکفین اس قبیل کی تو یقیناً کوئی بات نہیں۔ یہ سب لوگوں کا بلانا کسی اور ہی مطلب سے
ہے اور یہ بھید نہیں کھلتا کہ عورتوں کو کیوں نہیں بلایا۔ بہرکیف جھگڑا کا ہے کل نہیں تو پرسوں اس
وقت سے پہلے پہلے سب سُن لیں گے کہ کیا وصیت کی جس دن وصیت سننے کے لیئے لوگ
جمع ہوئے محلے کی مسجد میں نماز صبح کے وقت لوگوں کی یہ کثرت تھی کہ رمضان کے الوداعی جُمعے میں
بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اچھا معتدل موسم تھا نہ بہت گرمی نہ بہت سردی دن کے آٹھ بجتے
بجتے مکان مردانہ ہو گیا اور سب لوگ آ بھرے ایک درے کے آگے چلمن پڑی تھی اُس کے اندر
آزادی تھی اور اُس کے گرد اگرد چند عورتیں اور باقی تمام مکان میں مرد ہی مرد پٹے پڑے

تھے جب لوگ ٹھکانے سے بیٹھ لیئے تو اندر درپے ہیں سے آزادی نے خوب گڑا کے کی آواز سے پکار کر کہا

انیسویں فصل۔ آزادی بیگم کی آخری وصیت اور خاتمہ

بزرگو۔ بھائیو۔ عزیزو۔ السلام علیکم۔ ہندوستان میں اور ہندوستان میں نہیں تو اس شہر میں شاید یہ پہلا اتفاق ہے کہ ایک پردہ نشین عورت مردوں سے خطاب کر رہی ہے جن میں بعض اجنبی بھی ہیں۔ عورت کسی قوم کسی مذہب کسی ملک کسی عمر اور کسی حالت کی کیوں نہ ہو تھوڑا بہت حجاب اُس کی طبیعت میں ضرور رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پردہ از روئے پیدایش عورت کے مزاج کے مناسب ہے۔ روئے زمین پر صرف مسلمانوں کی ایک قوم ہے جن کے مذہب میں پردے کا حکم ہے تو دوسرے مذہب والے خاص کر عیسائی اس پر بڑے بڑے ٹونے آتے ہیں لیکن یہ بالکل اُن کی ہٹ دھرمی ہے۔ وہ ہماری حالت سے اچھی طرح واقف نہیں اور قیاسی باتوں سے ایسے رواج پر اعتراض کرتے ہیں جو اس وقت تک یقیناً نہایت مفید ثابت ہوا ہے میں انگریزوں کے خانگی حالات سے بالکل ناواقف ہوں مگر جہاں تک کتابوں اور اخباروں سے معلوم ہوا ہے بے پردگی کے بُرے نتیجے اُن کو بھی جھیلنے پڑتے ہیں لیکن آزادی اور خودسری جو ملکی رواج کی رو سے عورتوں کو حاصل ہے چھپنا تو درکنار اس کا روکنا اور گھٹانا بھی دشوار بلکہ محال ہے مسلمانوں میں بھی چھوٹتے ہی پردے کا رواج نہیں ہوا بلکہ مدتوں سب کی بہو بیٹیاں دستور قدیم کے مطابق باہر نکلتی اور پھرتی چلتی رہیں یہاں تک کہ اسلام کی تعلیم سے لوگوں کے سینے خوف خدا اور پرہیزگاری اور نیکوکاری سے معمور ہو گئے اور خود اُن ہی کو بے پردگی سے نفرت پیدا ہوئی اور اُنہوں نے آزادی کو اپنے حق میں بون اور خطرناک سمجھ کر اپنے تئیں پردے کا پابند کرنا چاہا جب پردے کا حکم نازل ہوا تو بہت دنوں تک اس میں ایسی آسانی رہی کہ عورتیں مسجدوں میں شریک جماعت ہوتیں۔ لڑائیوں میں جاتیں اور مجاہدین کی جو خدمت بن پڑتی بجا لاتیں جوں جوں پیغمبر صاحب صلعم کا عہد بابرکت دور پڑتا گیا دلوں کی صفائی خیالات کی پاکیزگی کم ہوتی گئی پردے میں بضرورت تشدد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اب جو پردے کا رنگ ہے آپ سب صاحب اُس کو دیکھتے ہیں یہ پردہ قدر مشروع سے بہت زیادہ مگر ضرورت اور مصلحت وقت سے اب بھی کم ہے۔ باوجود کہ میں بڑی سختی کے ساتھ پردے کی طرفدار ہوں۔

لیکن ایک ایسا ہی قوی سبب آ پڑا ہے کہ میں نے اپنی آواز مردوں کو سنانے پر جرأت کی۔ اور میری ساری عمر میں یہ پہلا اور خدا نے چاہا تو آخری اتفاق ہے کہ میں نے شرعی پردے کے نہیں بلکہ رواجی پردے کے خلاف کیا ہے۔ رسولِ خدا صلعم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مہاجرین اور انصار کو مخاطب کر کے پسِ پردہ بڑی لمبی تقریر کی اور وہ تقریر ایک خطبے کے پیرایہ میں آج وقت تک کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ اُم المومنین حضرت عائشہ سے لوگ بکثرت مسئلے پوچھنے آتے اور آپ پردے میں سے جواب دیتیں۔ غرض میں جو یہ گفتگو کر رہی ہوں اس کے جواز شرعی کی سند بھی رکھتی ہوں۔ علاوہ اس کے میں خود حیران ہوں کہ مجھ میں اس وقت کہاں کا زور آ گیا ہے۔ کئی برس بعد اتنی آواز نکلی ہے ورنہ میری حالت دیکھو تو ناتوانی اور ضعف حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں اور انکار کی گنجائش بھی نہیں کہ کسی وقت اور کسی حالت میں زندگی کا بھروسا نہیں لیکن انکار نہ کرنا اور نہ کہنا اور چیز ہے اور احوال سے اعمال سے ثابت کر دکھانا کہ جیسا ہم منہ سے کہتے ہیں اپنے دل میں بھی ایسا ہی یقینِ واثق رکھتے ہیں بالکل دوسری چیز ہے اور ان دونوں میں بڑا اور بہت بڑا فرق ہے۔ اب چند روز کی میں کہتی نہیں مگر اس سے پہلے سے بڑوں کو اپنے داہنے بائیں اور ان کو اپنے سے چھوٹوں کو بعض کو مدتوں بیمار رہ کر اور بعض کو سہا جاتا مرتے دیکھا اور ایک دو کو نہیں سیکڑوں کو میں خود دو بار تین بار ایسی ایسی بیماری پڑی کہ مرنے میں کسی طرح کی کچھ کسر باقی نہیں رہی تھی۔ تو اس سے پہلے میں کبھی ایک لمحے کے لیے اپنی زندگی کی طرف سے مطمئن نہیں ہوئی۔ گویا میرا خیال یہ تھا کہ میں موت کے حکم نامے سے مستثنیٰ ہوں یا جیسے خدا نے مجھ کو زبان دی ہے کہ میں سو سو برس کی عمر سے اوپر نہیں مروں گی۔ سوائے خدا کے کسی کو دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں لیکن جہاں تک لوگوں کے برتاؤ سے سمجھا جا سکتا ہے میں خیال کرتی ہوں کہ تمام آدمی الا ماشاء اللہ ویسی ہی غفلت میں مبتلا ہیں جیسی غفلت میں میں نے اپنی ساری عمر برباد کی ہے۔ اس وقت نہیں تو کسی دوسرے وقت فرصت سے تنہا بیٹھ کر سوچنا کہ اگر دنیا کے لوگ زندگی پر اُتنا ہی اعتماد کریں جتنا کہ عقل کی رو سے ہونا چاہیے یعنی رات کو سوئیں اور دل میں یہ خیال ہو کہ دیکھئے جاگنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ صبح کو اٹھیں اور یہ تصور پیشِ نظر ہو کہ خدا جانے شام بھی پکڑتے ہیں یا نہیں۔ تو آپ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ دنیا کا رنگ

نہیں ہو سکتا کیوں کوئی نئی عمارتیں بنوائے گا کس لیے کوئی باغ لگائے گا کس لیے کوئی جائداد پیدا کرے
لیے کوئی کسی طرح کا انتظام کرے گا توقع افزا ہوگا یعنی امید خیال ہوگا بالکل سو
نسیم غفلت کی چل رہی ہے جو امنڈ رہی ہیں بلائیں بلائیں ۔ کچھ ایسے سوتے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے
افسوس ہے کہ مجھ کو اپنی غلطی پر وقوف اور غفلت سے تنبہ ایسے وقت ہوا کہ جبر نقصان میرے
اختیار سے خارج اور تلافی مافات میری قدرت سے باہر ہے۔ امتداد مرض نے میرے جسم کو اور
اور نیز مرگ نے میرے خیالات کو اس قدر بدل دیا ہے کہ گویا یہ میرا دوسرا جنم ہے جن خیالوں کو میں نہایت
بے جا سمجھتا تھا اور جنہیں صحیح جانتا تھا اب وہی خیال ہے کہ کسی وقت دل سے نہیں نکلتا جو باتیں
ساری عمر مشتبہ اور مشکل رہیں اب روز روشن کی طرح صاف اور بدیہی نظر آتی ہیں جن کو نہ دلیل
کی حاجت نہ ثبوت کی ضرورت۔ قرآن کی ایک آیت کو میں اپنی اس حالت سے بہت ہی مطابق
پاتا ہوں وجاءت كل نفس معها سائق وشهيد لقد كنت في غفلة من هذا فكشفنا عنك
غطاءك فبصرك اليوم حديد ۔ اگر میرے پہلے کے سے یا یوں کہوں کہ ساری عمر کے سے خیالات
ہوتے تو مجھ کو آپ صاحبوں کے سامنے بات کرنی بھی دشوار ہوتی کہ ایسی بات جس کے کہنے میں سارا
عالم گرفتار ہے لیکن اس خیال نے کہ مجھ کو دنیا میں رہنا نہیں میرے دل کو قوی میری طبیعت کو مضبوط
اور میری ہمت کو دلیر کر دیا ہے یہی نہ کہ لوگ مجھ کو بیوقوف اور بے باک کہیں گے لیکن ایک دن
ہوگا کہ نہ طعن کرنے والے ہوں گے (اور یہ شاید کسی قدر دیر میں ہے) اور نہ وہ ہوگی جس پر طعن کرتے
ہیں (اور یہ بہت جلد ہونے والا ہے) تھوڑی دیر بعد میں آپ صاحبوں سے اس قسم کی
باتیں کہوں گا جن کی نسبت آپ اس سے بھی زیادہ اچنبھا کریں گے پھر تو وہ آیت میں نے ابھی پڑھی
تھی اس میں روز قیامت کا حال ہے کہ خداوند عالم کے روبرو ہر شخص اس شان سے حاضر کیا جائیگا
کہ ایک تو اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا جیسے دنیا میں فوجداری کے مجرم کے ساتھ سرکاری سپاہی
لگا رہتا ہے جو اس کو کشاں کشاں حاکم کے حضور میں لیے جاتا ہے۔ اور ایک گواہ ہوگا جو حجت تمام
کرنے کے لیے اس کے خلاف پر گواہی دے گا۔ غرض ہر شخص مجرموں کی شکل و صورت میں اللہ
تعالیٰ جل شانہ کے روبرو پیش کیا جائے گا تو خدا تعالیٰ فرمائے گا تو اس حال سے غافل رہا
یعنی زندگی میں کچھ خبر نہ لی کہ مجھ کو جوابدہی کے لیے خدا کے حضور میں جانا ہے اور یہاں کیا کہوں گا

کی پکڑ سے بھاگ نہ سکوں گا اور گواہ ہوں گے جن کو جھٹلا نہ سکوں گا تو تیری آنکھوں پر جو پردہ
غفلت پڑا ہوا تھا آج وہ پردہ ہم نے اُٹھا دیا اب تیری نظر ایسی تیز ہو گئی کہ تمام چیزیں جن کی
نسبت تجکو شبہ تھا اب تجکو صاف بچشم سر دکھائی دے رہی ہیں قریب قریب یہی حالت میری ہے
میرے والدین کے مذہبی خیالات ایک دوسرے سے اس قدر متخالف تھے کہ دونوں میں ہمیشہ کھٹ
پٹ رہتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ مجکو ایسی چھوٹی سی عمر سے مذہبی باتوں میں غور کرنے کی ضرورت واقع
ہوئی جب کہ میرے ساتھ کی لڑکیوں کو گڑیوں کے سوائے اور کسی چیز کا خیال نہ تھا۔ باتوں میں تو
ہمیشہ ابا جان دبا لیتے تھے مگر اماجان اپنے عقیدے کی ایسی پکی تھیں کہ چپ ہو جاتیں مگر اپنی بات
پر پکی رہتیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر اُن کے دل میں کچھ شبہ آگیا تو نانا ابا پاس گئیں اور کچھ
کر صاف کر لیا۔ مجکو مشکل تھی بچپن کی عمر کھیل کود کے دن۔ مذہبی خیالات۔ اور اُن میں بھی اختلاف
فیصلہ کرنے کی لیاقت نہیں تھی۔ اناڑی تولنے والی ترازو کبھی ادھر کا پلڑا جھک جاتا اور کبھی اُدھر
کا۔ ماں پر نظر کی تو نماز پڑھ اور روزہ رکھ اور تلاوت قرآن پڑھ اور وظیفوں میں جانے کا شوق ہوا۔ باپ
کی باتوں کا خیال آگیا تو کہاں کی نماز اور کس کا روزہ ہفتوں خدا کا نام بھی نہ لیتا پڑھیں آتا
لیکن میں اتنی بات ضرور کہوں گی کہ ماں کا اثر مجھ پر غالب تھا۔ نماز گو بڑے تار پر بھی پڑھی ہو قضا بھی
بہت کی ہو مگر کوئی پورا مہینا نماز سے خالی گزرنے نہیں دیا روزے کھائے بھی اور بے دلی سے رکھے
بھی لیکن ایسا نہیں ہوا کہ سارا رمضان مو کھا اڑا دیا ہو۔ لیکن اب جو سمجھ آئی اور آنکھ کھلی تو
ہفتہ پندرہ بیس دن سے تو معلوم ہوا کہ ساری عمر کبھی کوئی عبادت اُس خلوص کے ساتھ کرنے کا
اتفاق ہی نہیں ہوا جو شرط قبولیت ہے۔ تو ایسی عبادت کی نہ کی برابر۔ اور خلوص ہوتا تو کہاں سے
ہوتا یہاں تو سرے سے یقین بھی نہ تھا اور ننھیال والوں کی نقل تھی وہ بھی ابا کی اصلاح نے ادھ موا کر دیا عمر
کا اکثر حصہ تو اس طرح پر گزرا کہ تہ دل سے کبھی خدا کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور جب خدا سے نہیں چھپایا تو
غیروں سے چھپا کر کیا ہو گا کتنے دنوں میں اس میں حیران رہی کہ خدا حقیقت میں کوئی چیز ہے
بھی یا نہیں۔ اور ہے تو وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اُس نے ہم کو بے درخواست پیدا کیا طرح طرح
کی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دیں۔ زندگی کے دن تیر کرنے کے سوائے ہم سے اور ہو بھی کیا سکتا ہے
اس پر عبادت کی مشقت۔ مذہب کی پابندی۔ مرنا۔ اور مرنے کے بعد جو ابد کا اس کے

اپنے اپنے گھر میں ایک قبر کھود رکھی تھی اور اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ ہر روز تھوڑی دیر کے لیئے ضرور
اُس میں جا کر لیٹے تاکہ موت کی یادگاری تازی ہوتی رہے میں نے قبر تو نہیں کھودی لیکن یہ
پورا یقین ہو گیا تھا کہ جس چارپائی پر پڑی ہوں اب اس سے قبر ہی میں جانے کے لیئے اُتاری جاؤں گی
غرض موت کے اس درجے کے یقین نے میرے سارے شکوک دفع کر دیئے اب مجھ پر اچھی طرح
ثابت ہو گیا کہ میں نہایت عاجز اور ذلیل مخلوق ہوں اپنی حقیقت کا پہچاننا تھا کہ خدا نظر آنے لگا
ساری عمر مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ سنتے اور کتابوں میں پڑھتے گزر گئی مگر اس کے معنی اب سمجھ میں
آئے کہ اپنے تئیں پہچاننے سے خدا یوں پہچانا جاتا ہے پھر میں نے خدا کی عظمت اور اُس کے جلال پر نظر
کی تو میری ایسی ہستی جھوٹی کہ اپنی ہستی کو ہستی کہتے ہوئے شرم آنے لگی۔ اس خیال نے مجھ کو بہت ہی
بڑی راحت پہنچائی کیوں کہ میں اپنے اوپر کیا کیا پندار رکھتی تھی جن میں اپنی چھوٹی سی عقل کو دخل دینا
پرلے درجے کی بیہودگی اور گستاخی تھی۔ اُدھر خدا کو پہچانا اور اِدھر اپنے تئیں دیکھا تو اس کے مجھ پر
اس قدر احسانات ہیں جن کی کوئی حد انتہا نہیں۔ تو میں نے سوچا کہ ایسے محسن کے احسانات کا معاوضہ
کرنا تقاضائے شیوۂ انسانیت ہے لیکن اس کی ذات تو ہر طرح بے نیاز یہاں تک کہ اس کو ہماری شکر گزاری
اور احسان مندی کی بھی پروا نہیں تو نہ ہو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو نیک سلوک کرنا بھی
اُس کا شکر ہے اور یہی اس کی مہربانیوں کا معاوضہ ہے۔ کیوں کہ ہم اُس کا برتاؤ بندوں کے ساتھ دیکھتے
ہیں سب کی پرداخت کل کی پرورش۔ تو اگر ہم اُس کے بندوں کے ساتھ لطف و مدارات سے پیش آئیں
تو یہ ضرور اُس کی خوشنودی اور رضامندی کا موجب ہوگا۔ لیکن افسوس ہزار افسوس مجھ کو یہ بات
کب آ کر سوجھی جب کہ مجھ کو دنیا میں رہنے کی مہلت نہیں۔ اور ایک آن یا دو دن یا شاید دو پہر یا شاید
گھڑی دو گھڑی کی مہلت ہو بھی تو بیماری سے چین نہیں قرار نہیں۔ مگر پھر بھی جب تک دم میں دم ہے
کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ آخر ایک بات سمجھ میں آئی جس کے لیئے میں نے آپ صاحبوں کو تکلیف دی اور
وہ بیوہ عورتوں کی حالت پر نظر کرنا ہے۔ آپ اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ جو کچھ میں بیوہ عورتوں
کے بارے میں کہوں وہ بہت زیادہ قابل اعتبار ہوگا بہ نسبت اس کے جو آپ اپنے دل میں خیال کر رہے
ہیں کیوں کہ اول تو میں عورت ہوں اور کوئی مرد گو وہ کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو عورت کے حال سے
اس قدر واقف نہیں ہو سکتا جس قدر ہم جنس ہونے کی وجہ سے میں دوسرے میں بیوگی کی تھی بخوبی دیکھ

اور اُس کی مصیبت اچھی طرح جھیل چکی تھی تب میرے جیسی میں مرنے کے لیئے تیار۔ اور گور میں پاؤں لٹکائے
بیٹھی ہوں تو کچھ کہہ سکتی ہوں کہ اس میں میری کسی ذاتی غرض کا شمول ہو نہیں سکتا۔ اب میرا وہ وقت
آ لگا ہے کہ مجھ کو تمام دنیاوی اغراض سے بالکل قطع نظر ہے۔ وہ جسم جس کو میں ماں کے پیٹ سے ساتھ
لائی تھی اور جس نے ساری عمر میرا ساتھ دیا آج سے میرا تعلق اٹھنے والا ہے تو دوسرے تعلقات
کیا باقی رہ سکتے ہیں۔ اور اسی خیال نے تو مجھ کو جرأت بھی دلائی کہ لوگوں کو جمع کر کے ان کو بیواؤں
کی مصیبت سناؤں ورنہ کتنی خدا کی بندیاں جی ہی جی میں گھٹ گھٹ کر اور گھل گھل کر دنیا
کے پردے سے اٹھ گئیں اور کسی نے نہ جانا کہ بیوگی نے اُن کو کیسا کیسا ستایا اور کتنا کتنا رلایا
میں خوب سمجھ چکی ہوں کہ جو میں کر رہی ہوں آج تک کسی عورت نے نہیں کیا۔ مدتوں اس انوکھی بات
کے چرچے رہیں گے۔ لوگ طرح طرح کی بدگمانیاں کریں گے۔ مجھ کو کوسیں گے۔ برا کہیں گے لیکن میں
ایسی جگہ جا رہی ہوں کہ یہاں کی آوازیں وہاں پہنچ نہیں سکتیں۔ میرا معاملہ تو خدا سے پڑنے
والا ہے۔ اور میں ظاہر میں باطن میں جیسی کچھ ہوں اُسی کو معلوم ہے اور وہ دنیا کی طرح کان کا کچا نہیں کہ جھوٹی
اور سچی اور گواہوں کے بدون اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ پس میں کیا پروا کر سکتی
ہوں کہ لوگ میرے مرے بعد میری نسبت کیا کہتے ہیں۔ آپ صاحبوں میں جیسے اکثروں کو میرے
حالات معلوم ہیں اور میں اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتی۔ پس میں اپنے جیون کو یا
بیوگی کی داستان سناتی ہوں میں یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ میری بیوگی کسی خاص طرح کی ہوئی
تھی بے شک میں جوانی میں بیوہ ہوئی مگر بیوگی کسی حالت اور کسی عمر پر موقوف نہیں بوڑھیاں
جوانیں، لڑکیاں، اولاد والیاں، بے اولاد، امیر، غریب، شریف، رذیل کہیں رانڈوں کی
کمی نہیں بلکہ میری حالت تو بہتیری رانڈوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ میرے ساتھ اولاد کا بکھیڑا
نہ تھا کہ اُن کے پالنے پرورش کرنے لکھانے پڑھانے شادی بیاہ کا تردد کرنا پڑتا۔ نواب صاحب خدا
اُن کو جزائے خیر دے میری تنخواہ باندھ گئے تھے جس میں بفراغت بسر کر سکتی تھی اور خدا کا لاکھ لاکھ
شکر ہے کہ اس دم تک بفراغت بسر کی۔ میں نے اکثر عورتوں کو کہتے سنا اور شروع شروع میں میرا
ایسا ہی خیال تھا کہ فکر معاش سے خدا نے مجھ کو سبکدوش کر دیا ہے اگر وہ میرے نکاح کا ارادہ
کروں تو بڑی بے حیا اور بدنام اور ناروا بات ہے لیکن بہت دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ میری رائے بدل گئی

بدل گئی اور میں نے سمجھا کہ اگر تعلق مناکحت کی غرض وغایت یہی ہے کہ مرد کمائے اور عورت بیٹھے اور کھائے تو اس تعلق میں کچھ بھی مزہ داری نہیں اور نہ یہ تعلق کچھ بڑی قدر کی چیز ہے۔ اور ایسا ہوتا تو امیر زادیوں بیٹیوں کے بیاہنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ بلکہ اصلی غرض اس تعلق سے مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی محبت سے متمتع ہونا ہے۔ اور باقی تمام برکتیں جو خانہ داری سے پیدا ہوتی ہیں اور فائدے جو ایک کو دوسرے سے پہنچتے سب فروع ہیں اسی راحت رسانی اور مسرت بخشی الفت اور محبت کی۔ آدمی کی لذت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ آغاز بیوگی میں بلکہ بیوگی کے کئی برس بعد تک میرا یہ حال تھا کہ [illegible] کی لو کس نے خیال پالی تھی اگر کوئی ذرا سا بھی کنایتاً بھی دوسرے نکاح کا نام لیتا تو میں جھٹ پکڑ کر اس کا منہ نوچ لیتی۔ اور کبھی مجھ کو آپ سے بھی خیال آگیا ہے تو میں نے اس کو وسوسۂ شیطانی سمجھ کر ادھر آیا ادھر ٹالا۔ یاد نہیں ہوں کہ اب ایسی حالت میں بھی جاتی ہو کہ بے فائدہ اور لاحاصل محض ہے اور ہو بھی نہیں سکتا مگر میری دلی آرزو یہی ہے کہ کسی کی لکائی ہو کر مروں۔ اور پھر اتنا بھی نہیں ہوں کہ مدت ہوا ہو۔ ایک حساب سے تو مجھ کو تمام زمانہ بیوگی میں نکاح سے انکار ہی سا رہا۔ اور انکار نہ ہوتا تو میں کر بھی گزرتی۔ اور کرنے پر آتی تو میں کسی کے روکے سے تھی بھی رکنے والی۔ انکار جس کو سچا انکار کہنا چاہئے وہ تو واقع میں تب تک تھا کہ اس وقت تک مولوی صاحب مرحوم کی یادگاری تھی تازہ اور میں اس کو اپنے رتبے کی بے وفائی اور بد اطواری سمجھتی تھی کہ ان کی اتنے دنوں کی رفاقت کو اس قدر جلد بھلا دوں۔ شرع میں تو عدت کا ایک وقت مقرر ہے ہی اور مجھ کو مصلحتیں ہوں سو ہوں لیکن یہ تو میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد غم میں بڑا فرق آجاتا ہے کہ اگر بتکلف بھی کوئی تازہ رکھا جائے تو گویا بچے کی عمر کی سی قدر وخیال تو مدت کے اندر ہی کیوں نہیں آیا گر عدت پوری ہوئے پیچھے آپ سے طبیعت پر زیادہ زور دیا کہ ادھر یا ادھر اس بات کا کچھ نہ کچھ ضرور تصفیہ کرنا چاہئے۔ میں نے سوچنے اور غور کرنے کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا کیا مذہب کیا عقل۔ کیا میری خاص حالت تمام ترداد نکاح کی متقاضی تھی اور ایسا رواج نہ ہوتا رواج بھی ولیا [illegible] کے ساتھ نہیں جیسا ہندوؤں میں ہے بلکہ اتنی قدر کہ بیوہ جو نکاح کرلیتی ہے۔ اس کی ویسی اور وقعت عزت باقی نہیں رہتی اور لوگ اس کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یوں دنیا میں کون ہے جس کو اس سے بہتر حالت والا حقیر نہیں سمجھتا لیکن نکاح کرنے سے بیوہ عورت حقیر بھی جاتی ہے اس خاص بات میں

جو سب سے زیادہ دل کو دکھانے والی ہے۔ اور جس کی حفاظت کے لیئے اس نے نکاح کیا ہے یعنی ناموس یا
میں ہمیشہ رسم و رواج کو بڑی حقارت کے ساتھ دیکھا کرتی اور جی ہی جی میں کہتی کہ بھلے برے کی شناخت
کی دو کسوٹیاں ہیں یا مذہب اور یا عقل۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو ایک ہی کسوٹی ہے یعنی مذہب کیونکہ انسان
کی عقل کا کچھ اعتبار نہیں ایک ہی بات کو ایک آدمی اچھا سمجھتا ہے اور دوسرا برا اور اسی سے تو
دنیا میں اختلاف پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معصوم بچوں کے مار ڈالنے سے بڑھ کر دنیا
میں کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ حرکت نہ ہو گی لیکن جن لوگوں میں بیٹیوں کے مار ڈالنے کا دستور ہے
جیسے ہمارے ملک کے راجپوت اُن کا یہ مقولہ ہے کہ کنواری لڑکی کو بٹھا رکھنا یا سمدھی کہلانا اور سالا بننا
بڑی بے غیرتی کی بات ہے کوئی فعل اس سے زیادہ نفرین کے قابل ہو نہیں سکتا کہ جائے جان رہے آن
یہ تو میں نے مثال کے طور پر ایک بات بیان کی اسی طرح سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں جن میں لوگوں
کی رائیں مختلف ہیں۔ بلکہ آدمی آدمی کا اختلاف تو درکنار۔ ایک ہی آدمی ایک بات کو ایک وقت برا
سمجھتا ہے اور پھر وہی آدمی اسی بات کو دوسرے وقت اچھا کہنے لگتا ہے۔ اور یہ تو تجھ پر گزری ہے اور
خیال کر کے دیکھو تو کوئی فرد بشر اس تزلزل سے خالی نہیں بچپن کی باتیں جوانی میں بری معلوم ہوتی
ہیں جوانی کی بڑھاپے میں۔ بس وہی اچھا ہے جس کو مذہب اچھا کہے اور برا ہے جس کو مذہب برا بتائے
تو میں اپنے دل میں کہتی کہ جب آدمی کی عقل کو ثبات و قرار کا سلیقہ نہیں یہ رسم و رواج کیا چیز ہے
اور بڑے احمق ہیں جو اس کی پیروی کرتے ہیں لیکن جب مجھ کو خود رسم و رواج سے مقابلہ کرنا پڑا
تو معلوم ہوا کہ خدا کی خدائی میں اس سے زیادہ کوئی زبردست چیز نہیں جب جب نکاح کا خیال
آیا تب تب ارادہ ہوا اور جب جب ارادہ ہوا رسم و رواج نے سب منصوبے غلط کر دیئے میں کہتی تھی کہ پھر
لوگ مجھ کو دوجی کہیں گے۔ برابر کی بیبیاں مجھے نظر حقارت سے دیکھیں گی آنکھیں ماریں گی۔
مسکرائیں گی انگلی ڈھکی سب بیویوں کی صحنک کھائیں گی اور میں بیٹھی منہ تکوں گی۔ پھر سب سے
عیب سے میری نسل انگشت نما ہو گی نہیں نہیں۔ میں اس بے عزتی کی متحمل نہیں ہو سکتی اُس
سہاگ کو لگے آگ جس کی وجہ سے آبرو پر حرف آئے۔ لوگوں کے طعنے سنوں۔ گالیاں کھلواے
پھر کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ یہ کیا عقل کی بات ہے کہ لوگوں کے تاپنے کے لیئے اپنے گھر کو جلنے دیا جائے
جو خدا اور رسول سے واقف اور دین و ایمان سے خبردار ہیں وہ دل میں جو چاہیں سو سمجھیں مگر

مُونہ سے تو کوئی کھوٹی بات سامنے یا پیٹھ پیچھے نکال نہیں سکتے اور بلکہ دل میں بُرا بھی سمجھیں تو ایمان کا ضرر ہو۔ لیکن ایسے آدمی گنتے ہیں سو میں مشکل سے ایک تو وہ کس شمار میں ہو اور پھر معاملہ عورتوں سے پڑنے والا ہو جو عموماً دین سے بے نصیب ایمان سے بے بہرہ۔ ان بے چاریوں کو شاذ و نادر میاں سے ملاپ ہو تو۔ اپنے بناؤ سنگار سے اور بگاڑ ہو۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ تو رات دن کے جھگڑے اور فساد سے خانہ داری کے انتظام بچوں کی پرورش اس کی غیبت اُس کی بدی۔ تیرے رشک میرے حسد سے کب فرصت ملتی ہے کہ دین کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ تو اس طرح کی حضرتنا ہیں کہ حضرت مریم بھی ان کے روبرو آجائیں تو ایک بار اُن پر بھی چشمک کریں پر کریں لیکن نکاح کروں تو ایسیوں سے ملوں ہی کیوں ہاں مگر ایک دو ہوں تو چھوڑا بھی جا سکتا ہے یہاں تو خدا کے فضل سے آوے کا آوا خراب کینے کا کنبہ بھونڈا۔ چار و ناچار کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ان سے مُٹھ بھیڑ تو ہوہی گی اور مُٹھ بھیڑ ہوگی تو یہ کم بختیں چھیڑیں گی بھی ضرور اور چھیڑیں گی تو دل کو ایذا ہوگی ہی۔ بالفعل اپنے وقت میں مجھکو کوئی ہوتا سہارا لگانے والا ہمت بندھانے والا تو میرے دوسرے نکاح کو بھی اب پندرہ پندرہ بیس بیس برس ہوئے ہوتے۔ مگر عزیزوں نے رشتہ داروں نے اپنے پیاروں نے اور سب طرح پر تو ہمدردی اور غم خواری کی اس کا کسی نے بھولوں بھی نام نہ لیا۔ یہ بھی اُسی رواج سے مجبور رکھتے جس سے کہ میں معذور تھی۔ اور رواج کے علاوہ ان کو اس کا بھی خیال ہوتا تھا کہ اس کی مرضی دوسرا نکاح کرنے کی نہیں ہے اور آخر ہو تو یہ ہم ہی ہیں کی یقیناً نہیں ہوگی تو اس کے آگے اس کا مذکور کرنا بھی گویا زخم پر مرچیں لگانا ہے۔ میری والدہ نے یہاں تک تو کیا کہ میری بیوگی کے خیال سے میاں کے جیتے جی دنیاداری سے تائب ہوگئیں اور گویا ایک طور سے اُنہوں نے اپنے گھر کو بگاڑ لیا۔ نانی نے صبر کی فضیلتوں کے بیان میں ایسے ایسے وعظ سُنائے کہ شوہر تو شوہر میں آپ مر گئی ہوتی تو اپنا بھی ماتم نہ کرتی۔ غرض میں ان سب کی شکر گزار ہوں کسی نے میرے ساتھ کمی نہیں کی بے شک ان کو چاہیئے تھا کہ دوسرے نکاح کی تحریک کریں ترغیب دلائیں مگر اُنہوں نے نہیں کیا اس لیے کہ مجھکو چاہیئے تھا کہ دوسرے نکاح کا ارادہ ظاہر کروں میں نے نہیں کیا۔ میں نے بہتیری بہتیری تدبیریں کیں کہ کسی ایسے شغل میں لگ جاؤں کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آئے۔ پوری ایک برس صوم داؤد رکھ کر دیکھے کیوں کہ میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ روزہ اور روزہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام

کا سا ایک دن بیچ کا نفس کشی کے لئے بہت ہی مفید ہے مہینوں سر نہ دھویا ہفتوں بالوں میں کنگھی نہ کی۔کپڑے نہ بدلے۔ اچھا کھانے کی قسم کھائی۔ اچھا پہننے کا عہد کیا۔مگر معلوم ہوا کہ کسی چیز کا قصور نہیں۔خود میری ہستی نکاح کی متقاضی ہے۔ایک دن عادت کے مطابق میں اس خیال میں ڈوبی ہوئی تھی پڑے پڑے خیال آیا کہ میں ہی اپنی ذات سے اس قدر بے چین رہتی ہوں یا دوسری بیواؤں کا بھی یہی حال ہے۔تم لوگ تعجب کروگے کہ یہ بھی عجیب ڈھن کی عورت ہے۔مگر میں نے اسی ہوئی سے باون یعنی دو اوپر پچاس بیواؤں سے ملاقات کی جن میں کئی برس سے صرف ہوئے عورتیں وہ بھی بحورت میں تھی بیوہ وہ بھی بیوہ میں تھی۔ اس پر ان کے اصلی اور دلی خیالات دریافت کرنے میں مجکو ایسی ایسی مشکلیں پیش آئیں کہ دوسری ہوتی تو اتنی پڑ دیتی۔کہ تی مجکو جس کا حال دریافت کرنا منظور ہوا پہلے میں نے اس سے ربط بڑھایا گھل مل کر اس کو سہیلی بنایا لیکن میں جس چیز کی ٹوہ میں تھی وہ بات ہی ایسے پردے کی تھی کہ ہم جولی ہم جولی سے کہتی شرماۓ سہیلی سہیلی سے چھپاۓ۔عورتوں کی بہتیری باتیں چھپانے کی ہوتی ہیں اور پیٹ کی گہری تھیں انھوں نے چھپایا بھی بہت مگر میں جو پیچھے پڑی تو کسی نہ کسی ڈھب سے پوچھ ہی کر رہی ہاں نکاح کا ایسا معاملہ تھا کہ اس کا نام زبان پر آیا نہیں اور سننے والا ہتے سے اکھڑا نہیں۔ آخر ہار کر میں نے تو یہ تدبیر کی کہ جو عیب نہ کرتے تھے اور نہیں کئے تھے وہ سب جھوٹ طوفان اپنے اوپر لئے تب کہیں جا کر وہ عورتیں کھلیں اور انھوں نے اپنے دل کے بھید دیئے اس طرح پر لوگوں کے حالات کی تفتیش بُری بات ہے اور شریعت میں منع ہے اور قرآن میں لا تجسسوا کی مناہی موجود ہے لیکن خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں میری نیت میں ہرگز یہ بات نہ تھی کہ لوگوں کے پردے فاش کروں یا ان کو حقیر سمجھوں میں کیا کسی کے عیب ڈھونڈوں گی۔جب کہ آپ میرا رُواں رُواں خدا اور خدا کے بندوں کا گنہ گار ہے۔اوروں نے اگر گناہ کیئے ہیں تو ان کو ابھی توبہ کی مہلت ہے ممکن ہے کہ خدا ان کو توبہ کی توفیق دے توبہ قبول ہو اور ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں شامت تو مجھ کم بخت بدنصیب کی ہے کہ توبہ کا وقت بھی باقی نہیں۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْاٰنَ

وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰئِکَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۔ توبہ تو اُن کی ہی جنھوں نے نادانستہ
کوئی بُرا کام کیا پھر جلدی سے توبہ کر لی تو ایسوں کی توبہ خدا بھی قبول کر لیتا ہی اور خدا تو جاننے والا
حکمت والا ہی ۔ اور اُن کی توبہ نہیں جو بُرے کام کرتے چلے گئے یہاں تک کہ جب موت آموجود ہوئی
لگے کہنے اب میں نے توبہ کی اور نہ اُن کی توبہ ہی جو کافر مرے ایسوں کے لیئے ہم نے عذاب
دردناک تیار کر رکھا ہی تو صاحبو میں تو حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ میں ہوں اور مجھکو اپنی توبہ کے قبول ہونے
کا بھی بھروسہ نہیں ۔ بلکہ لوگوں کے حالات کی تفتیش سے میری غرض اتنی تھی کہ دیکھوں مجھ ہی کو
ہوگی اس قدر اکھرتی ہی یا دوسروں کا بھی یہی حال ہی تو بعض کا حال تو ناگفتہ بہ ہی اُن کی وہی
مثل ہی اِخْتَارَ الْعَارَ عَلَی النَّارِ ۔ دنیا کی شرم سے مجبور دوزخ میں جانا منظور مگر خدا کا بڑا احسان ہی
کہ امیروں کی تو میں کہتی نہیں متوسط الحال اور غربا کی عورتوں میں اس طرح کے فسادات بہت ہی
کم ہیں بلکہ گویا کہ نہیں ہیں ۔ اور یہ سب برکتیں ہیں پردے کی ۔ اور افسوس ہی کہ آج کل کے انگریزی
خواں اسی کے پیچھے پڑے ہیں کہ جس طرح ہو سکے اس کو توڑیئے لیکن اس وقت کی میری بھی ایک
بات یاد رکھنا کہ جس قدر پردے میں کمی ہوگی اُسی قدر فسادات میں ضرور زیادتی ہوگی ۔ مگر یہ کہ
خدائے تعالیٰ آدمیوں کی جگہ زمین پر فرشتوں کو لا بسائے تو کچھ کہا نہیں جاتا ۔ مجھکو اس قسم کی کئی عورتیں
ملیں جن کو حقیقت میں نکاح سے انکار تھا مگر تحقیق کیا تو اُن کا انکار اسی طور کا تھا کہ ایک لومڑی
انگور کی بیلوں کے تلے سے ہو کر نکلی انگور کے خوشے دیکھ کر اس کا جی للچایا کودی اُچھلی بہت مگر
انگور تھے اونچے پہنچ نہ سکی آخر یہ کہہ کر دم بالیتی ہوئی کہ انگور کھٹے ہیں تو جن کا انکار تھا اُن
میں بعض کی تو صورت اچھی نہ تھی بعض عمر سے اُتری ہوئی بعض بچہ کش ۔ کہ پہلے چار چار
پانچ پانچ کے لیئے ڈربہ بنائے تو اُن سے نکاح کرے ۔ انہی عورتوں میں تو سچا انکار ایک کا دیکھا
کہ اُن کو کوئی چیز مانع نہ تھی مگر اس طرح کا آدمی خدا پرست مرد یا عورت کوئی شخص آج تک
میری نظر سے نہیں گزرا اور اگر انہوں نے مجھ سے عہد نہ لیا ہوتا تو میں ضرور اُن کا نام و
نشان سب کو بتا دیتی کیونکہ ایسے بزرگوں کی زیارت کو میں داخل عبادت سمجھتی ہوں
میں اس کو اپنی بڑی خوش قسمتی خیال کرتی ہوں کہ اتفاق سے اُن کے پاس جا نکلی اور میں سچ
کہتی ہوں کہ اگر مجھکو اپنی نجات کی توقع ہی تو صرف اسی کہ میں نے اُن سے درخواست کی اور انہوں نے

میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ کیا وہ ضرور اپنا وعدہ پورا کریں گی بلکہ کیا ہوگا۔ اور وہ اپنا وعدہ پورا کریں گی تو خدا بھی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا بلکہ کیا ہوگا وہ اچھے بندوں کی بات کو رد نہیں کرتا تم بھی از برائے خدا دعا کرو کہ اپنے نیک بندوں کے طفیل میں خدا میرے گناہوں سے درگذر کرے اور میں بھی تم سب کے حق میں یہی دعا کرتی ہوں خدا قبول کرے۔ کیا غضب کا نکتہ ہے کہ ہم جس مونہ سے جھوٹ بولتے غیبت کرتے قسمیں کھاتے کوستے برا کہتے بیہودہ باتیں بکتے اسی گندے اور ناپاک مونہ سے دعا مانگتے تو ایسی دعا قبول ہو کیا خاک لیکن اگر ایک بندہ دوسرے بندے کے لیئے دعا کرے تو وہ دعا قبولیت سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ میرا مونہ گنہگار ہے تو تیرے لیئے نہ دوسروں کے لیئے۔ وہ بی بی جن کا میں نے ذکر کیا میں نے اُن کو جا کر دیکھا تو مجھ خدا یاد آگیا میں نہیں جانتی تھی کہ اس زمانے میں اور ہمارے ہی شہر میں ایسے ایسے بزرگ چھپے پڑے ہیں اور واقع میں اپنے اعمال کا تو حال معلوم ہے یہی لوگ ہیں جن کی برکت سے زمین و آسمان قایم ہیں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے تئیں اس طرح چھپایا ہے کہ کسی کو کانوں کان اُن کے حال کی خبر نہیں۔ اچھے خوش حال گھر کی بیٹی ہیں باہر شہر کسی بڑے امیر کے گھر بیاہی گئی تھیں۔ میاں کے جیتے جی تو دنیا داری کی کوئی بات اُن میں مخفی نہیں۔ میری اُن کی بہو گی ملتی جلتی ہوئی تھی ہے۔ یہ بھی جوانی میں بیاہ کے تیسرے برس بیوہ ہو گئیں۔ میاں گھوڑے پر سوار چلے جاتے تھے خدا جانے کیا ہوا۔ گھوڑا بدکا گرے اور گرنے کے ساتھ جان نکل گئی۔ ان کے بھی کچھ اولاد نہیں ہوئی۔ ان پر میاں کے مرنے کا یہ اثر ہوا کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھیں۔ اگر بیوگی کا یہ نتیجہ ہو تو میں کہتی ہوں الٰہی کل جہان کی عورتیں رانڈ۔ شہر میں آئیں تو غل غپاڑے کے خیال سے اپنے میکے میں نہیں ٹھہریں۔ دور کے رشتے کی کوئی خالہ ہیں اُن کے مکان میں الگ کوٹھے پر رہتی ہیں کسی سے ملنے کی روادار نہیں۔ نہ یہ کہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر اُن سے نفرت کرتی ہیں۔ نہیں بلکہ جو کام اُنہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیئے ہیں اُن سے واقع میں فرصت نہیں ہوتی میں بھی نادانستہ اُن کے اوقات میں خلل انداز ہوئی۔ میں نے اس طرح کے پاکھنڈ بہت دیکھے تھے بے باکانہ چلی گئی۔ بناوٹ کے تیور ہی دوسرے ہوتے ہیں ان کو دیکھا تو بس دل بے اختیار ہو گیا۔ تین چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر ریشم کھولنے کھڑی ہوئیں۔ ریشم کھولتی جاتی

ہیں اور ساتھ کے ساتھ قرآن بھی حفظ پڑھتی جاتی ہیں کچھ ایسا انداز باندھ رکھا ہے کہ ادھر منزل[1]
فیل کا ورد ختم ہوا اور ادھر ان کی پانچ پیسے کی مزدوری بھی ہوئی۔ اور یہی ان کی وجہ معاش ہے
پھر سینا لے کر بیٹھتی ہیں تو سلائی کا نہیں مسافر طالب العلم یا جن کو سلائی دینے کا مقدور نہیں کپڑا
دے جاتے ہیں اور یہ مفت سی دیا کرتی ہیں۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ غریبوں کی اسی
خدمت کو نفلوں پر مقدم رکھتی ہیں۔ دن بھر کا روزہ اور یہ زحمت اور پھر رات کو جب دیکھو جائے نماز پر موجود
میری چارپائی انہوں نے اپنی نماز کی چوکی کے برابر بچھوا لی تھی نفلوں کے بیچ بیچ میں جتنی دیر وظیفہ
پڑھتیں مجھ کو پنکھا جھلتی رہتیں میں بھی مگر مارے چپنے سے خبر نہ ہوئی کہ اچھا ہوں ذری ذری دیر بنا لیں جنت
کی ہوا تو کھا لوں میں نے نمازیں بہت دیکھی ہیں مگر ایسے ذوق و شوق کی باقاعدہ مودب با
وقار نماز میرے دیکھنے میں تو آئی نہیں جب میں نے ان کا یہ حال دیکھا تو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ
پوچھوں مگر آخر میں نے جی مضبوط کر کے پوچھا ہی کہ اب دوسرا نکاح کیوں نہیں کرتیں۔ تو کہا کر تو لوں
مگر بیٹھے بٹھائے حقوق شوہری کا وبال کون اپنی گردن پر لے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا کے
بعد شوہر کا درجہ ہے اور اگر بندے کا بندے کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو بی بی کو حکم ہوتا کہ میاں کو سجدہ
کیا کرے مگر ہم لوگوں کا طریقہ کچھ ایسا بگڑا ہے کہ حقوق شوہری کی حفاظت مشکل ہے۔ پھر حدیث میں
یہ بھی آیا ہے کہ عورتیں کثرت سے دوزخ میں جائیں گی اس لیے کہ شوہروں کا احسان نہیں
مانتیں تو کبھی میرا تو دوسرا نکاح کرتے ہوئے جی ڈرتا ہے اور اب بہت گزر گئی تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ اس
کو بھی خدا گزار دے گا۔ سو ایک ان بی بی کا انکار تو سچا اور بجا انکار تھا باقی جس کو دیکھو منہ سے نہیں
نہیں اور دل میں ہو بھی کہیں۔ اور اگر بیوہ عورتیں ایسا خیال کریں تو ان پر الزام کی کیا بات ہے ان
بے چاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا جہان میں نکاح ہوتے
ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔ اور اگر کسی کو برا لگتا ہے تو چاہیئے کہ خدا
سے جا کر لڑے کہ کیوں اس نے عورتوں کو ایسا بنایا۔ انسان کی نسبت خدا نے فرمایا کہ خلق
الانسان ضعیفا۔ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔ تو ضعیف دو قسم جسمانی اور عقلی۔ انسان کا ضعف
جسمانی تو اس سے ظاہر ہے کہ شیر اور چیتا اور بھیڑیا اور ہاتھی اور سانپ اور بچھو وغیرہ تو ہے بجا خود ایک

[1] شروع فاتحہ سے سورۂ یونس تک پھر سورۂ لقمان تک پھر آخر تک تین دن میں سارا قرآن ختم کر دیا جائے تو اس کو منزل فیل کہتے ہیں

پھینو ٹی اور ایک چھیڑ کرنے پر آئے تو اس کو دق کر مارے۔ رہا ضعفِ عقل تو جہاں اسس کی عقل شکوک اور اوہام اور صحبت اور تربیت بہت سی چیزوں کی مغلوب ہے دوسروں کی رائے کا وہ اس درجہ محکوم ہے کہ اگر اس کو دوسروں کی رائے کا غلام کہا جائے تو بے جا نہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کو اچھا سمجھیں اور اس کے لیئے وہ سخت سے سخت محنت کرنے اور بڑی سی بڑی مصیبت اٹھانے کے لیئے ہر وقت آمادہ ہے۔ ہندوؤں میں جو بیوہ عورتیں ستّی ہو جایا کرتی تھیں۔ انگریزوں نے اس کی مناہی کرتے وقت بڑی تحقیقات کی تو ثابت ہوا کہ ستی کی لوگوں کے ذہن میں اس قدر عظمت ہے کہ اس کو دیبی کے درجے میں سمجھتے ہیں۔ بعض نادان عورتیں برہمنوں کے بھرے میں آکر منہ سے کہہ اٹھتی ہیں کہ میں ستی ہوں گی۔ اسی وقت سے اُن کی تعظیم ہونے لگتی ہے۔ پھر اُن کو اپنی بات کی پچ پڑتی ہے یہاں تک لکڑیوں کے انبار پر بیٹھتے وقت تک کسی طرح کا ہراس و اضطراب ظاہر نہیں ہوتا میری غرض اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ نیکی ایسی بڑی چیز ہے کہ ہزاروں عورتوں نے اس کے پیچھے جان گنوا دی ہے تو اگر ایسی نیکی میں آکر شروع میں نکاح سے انکار ظاہر کریں اور پھر اُس انکار کے نباہ کے لیئے تمام عمر بیوگی کی مصیبت میں رہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے بحث تو اس میں ہے کہ ایسا انکار قابل اعتبار بھی ہو سکتا ہے یا نہیں میں کہتی ہوں نہیں ہو سکتا اور نہیں ہونا چاہیئے تم کو اعتبار آئے یا نہ آئے لیکن یہ قرآن میرے ہاتھ میں ہے چاہو کسی لڑکے یا عورت کو پردے کے اندر دکھلوا لو اور میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے نہیں بلکہ میرے خدا نے میری ناموس کو بال بال بچا یا ہے مگر میں اس پر نازاں نہیں اس سے خوش نہیں۔ اور کیوں کر نازاں اور کیا خوش ہو سکتی ہوں جبکہ میں خدا کے کلام میں یہ غضب کی آیت پاتی ہوں وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور تم اپنے دل کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا اس کا تم سے حساب لے گا پھر جس کو چاہے معاف کرے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے جسم پر میرا بس چلتا تھا اور میں نے اس کی حفاظت کی۔ آنکھ غیر محرم پر نہیں پڑنے پائی۔ زبان کو گناہ کی بات نہیں بولنے دی پاؤں بدراہ نہیں چلا ہاتھ بے جا نہیں ہلا۔ لیکن دل پر میرا اختیار نہ تھا۔ وسوسوں کو کیونکر روکتی خیالات کو کس طرح ٹالتی پس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل نہ میں اس کو بے گناہ سمجھتی اور نہ بے گناہ کہتی۔ بدن تو دنیا کی چیز ہے

یہیں تک میرے ساتھ ہی اور میں یہیں اُس کو چھوڑ جاؤں گی جس سے خدا کے یہاں باز پرس ہونی ہی
وہ دل ہی اور افسوس کہ وہ خدا کے سامنے پیش کیئے جانے کے قابل نہیں۔ لوگوں کی نظر میں اپنے
تئیں بے گناہ ظاہر کرنا مجکو کیا فائدہ دے سکتا ہی جب کہ میں خوب جانتی ہوں کہ خدا کی سرکار
میں کسی کو دخل نہیں نہ کوئی کسی کو جنت میں لیجا سکتا ہی اور نہ کوئی کسی کو دوزخ سے بچا سکتا ہی بلکہ
اپنی بے گناہی کا یقین دلانا جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا ہی اور میں نہیں چاہتی کہ چلتے چلتے ایک
گناہ اور اپنے سر پر لوں۔ مجھ پر ایک وقت گزرا ہی دن نہیں۔ ہفتے نہیں۔ مہینے نہیں۔ بلکہ برس کہ مرد
کی آواز میرے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رات کو چوکیدار پکارتا یا دن کو سودے والے صدا لگاتے تو میں
کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ تو بے اختیار ہو کر ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی اور پھر مہینوں اپنے تئیں ملامت
کرتی رہی۔ بیماری میں لوگوں نے میری ایسی ایسی خدمتیں کی ہیں کہ بس میرا جی ہی جانتا ہی اور میں اُن کے
احسانوں کی کسی طرح تلافی نہیں کر سکتی لیکن ویسی تسلی ہی نصیب نہیں ہوئی جو خدا بخشے مولوی صاحب کے
سرسری طور پر پوچھ لینے سے ہوئی تھی کہ اب تمھارا مزاج کیسا ہی۔ ایسی بھی بہتیری عورتیں نظر سے گزری ہیں
جن کا سرے سے بیاہ ہی نہیں ہوا مجکو کبھی اُن کے حال پر ترس نہیں آیا لیکن بیوہ ہو کر بیوگی کی قدر جانی
کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ جو میرے کہنے کا یقین کرے خدا اُس کو جزائے خیر دے اور جو نہ
کرے اُس کے حق میں اس کے سوائے اور کیا کہوں کہ خدا کرے وہ بھی ہمری سری کی عورت بنے خدا کرے
اُس کا بھی بیاہ ہو۔ اور خدا کرے وہ بھی بیوہ ہو کر دنیا میں رہے جب مجکو یقین ہوا کہ ہزاروں لاکھوں
عورتیں بیوگی کی سخت مصیبت میں مبتلا ہیں تو میں نے سوچا کہ اگر میں ان کی کچھ مدد کر سکوں تو اس سے
بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں۔ بندی کو چھڑانے غلاموں کو آزاد کرانے کا اجر ہی تو بیواؤں کو نجات دینے کا
کیوں نہ ہوگا یہ بھی تو بندۂ خدا ہیں ان کو بھی قیدیوں کی سی تکلیف اور غلاموں کی سی ایذا ہی بلکہ زیادہ۔ ان کو
بھی رنج و راحت کا احساس ہی۔ پہلے میرے دل میں آیا کہ عورتوں کو جمع کر کے اُن ہی کو مردوا بناؤں لیکن
دیکھا تو عورتیں مجبور محض ہیں مردوں نے اپنی ایسی ٹانگ اڑا رکھی ہی کہ ان کو ہلنے ہی نہیں دیتے حقیقت
میں مردوں کے کام ہیں اور عورتیں ناحق ہیں بد نام۔ اسی تردد میں تھی کہ ایک دن قرآن پڑھتے پڑھتے
یہ بات ذہن میں آئی کہ جتنے احکام عورتوں کے ساتھ خاص ہیں خدائے تعالیٰ نے خود عورتوں کو مخاطب
قرار دیکر نازل فرمائے ہیں جیسے وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ

یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن الخ وان یستعففن خیر لھن اور قرآن میں اس طرح کی اور بہت مثالیں موجود ہیں لیکن بیوہ عورتوں کو اس طرح پر دوسرے نکاح کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ مردوں کو مخاطب قرار دیکر فرمایا ہے وانکحوا الایامیٰ منکم ضرور اس کی کچھ نہ کچھ سبب ہے اور وہ یہی ہے کہ مردوں کا اختیار اور اقتدار جو انہوں نے خدا اور رسول کے حکم کے خلاف زبردستی اور ہیکڑی سے عورتوں پر حاصل کر رکھا ہے۔ اگر مرد یہ کہیں کہ بیوہ کو چاہئے اپنا نکاح آپ کر لے یہ اُس کا کام ہے ایجاب و قبول وہ کریگی نہ ہم۔ یعنی خود وہ کریگی نہ ہم۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا نے ان کو ناحق وانکحوا الایامیٰ کا مخاطب قرار دیا نعوذ باللہ یا تو اس کو اصلی حال معلوم نہیں یا اس نے مردوں کے حق میں ظلم کیا کہ جو کام ان کے کرنے کا نہ تھا ان سے کرانا چاہا۔ اگر خدا کوئی چیز ہے اور قرآن اسی کا کلام ہے تو وانکحوا الایامیٰ مردوں کے لئے بڑی سخت ہدایت کا حکم ہے۔ اول تو اختیار رکھکر خدا سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور فرض کرو کہیں شاذ و نادر بیوہ اختیاری ہو بھی تو ایسی صورت میں مردوں کو حکم دینے سے خدا کا یہ منشا ہوگا کہ اپنی بیواؤں کو نکاح پر مجبور کرو۔ لیکن بجائے اس کے کہ میں مردوں کو سمجھاؤں کہ وانکحوا الایامیٰ کی تعمیل کس طرح پر کرنی ہوگی۔ ان کو خود سوچنا اور سمجھنا چاہئے کہ وانکحوا الایامیٰ حکم ہے مہمل تو نہیں اور مہمل نہیں تو اس کا کیا مطلب ہے اور جو کچھ مطلب سمجھا جائے اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کیا سبیل ہے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ بیواؤں کی واقعی حالت کی سچائی اور نیک نیتی سے مردوں پر ظاہر اور مردوں کو ان کے فرض سے آگاہ کروں شاید ایسا کرنے سے بیواؤں کی مصیبت میں خفت اور مردوں کی عند اللہ جوابدہی میں کمی ہو۔ سو میں نے کیا اور بحمد اللہ تعالیٰ شکر کیا۔ اے خدا جو کچھ میں نے کیا اگر تیری مرضی کے مطابق ہے تو میری بات میں اثر اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا کر۔ اے دنیا جہان کی بیواؤں کو بھلا ہو اور میری اس ناچیز کوشش کے صلے میں نہیں بلکہ محض تیرے فضل و کرم سے ان کے طفیل میں مجھ کو دنیا کی ہر تکلیف سے جس کو میں اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا نجات بخش اور خاتمہ بالخیر کر اور حدیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ دن رات میں کوئی نہ کوئی گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے کہ آدمی جو کچھ منہ سے نکالے وہ ہو کر رہتا ہے جس وقت آزادی نے یہ دعا کی وہ ضرور ایسا ہی قبولیت کا وقت رہا ہوگا کیونکہ ادھر جتنے مرد تھے سب اپنے اپنے حال میں حیران تھے کہ بیوہ کے بیٹھنے کا روادار نہ ہوگا (اور ایسا ہی ہوا) اور ادھر دعا کا خاتمہ ہونا تھا کہ آزادی نے دفعتاً ایک ہچکی لی اور ہو چکی۔

تمت

اعلان